جام ساقی

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

تحقیق و تحریر
احمد سلیم ۔ نزہت عباس

جام ساقی

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

جام ساقی

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

تحقیق وتحریر: احمد سلیم، نزہت عباس

جُمہوری پبلیکیشنز

Independent & Progressive Books

• نام کتاب۔ جام ساقی۔ چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

• تحقیق وتحریر۔ احمد سلیم، نزہت عباس • سرورق۔ مصباح سرفراز

• اشاعت۔ 2017ء • ناشر۔ جمہوری پبلیکیشنز لاہور

ISBN:978-969-652-094-8

قیمت 800 روپے

درج بالا قیمت صرف اندرونِ پاکستان

اہتمام: فرخ سہیل گوئندی

Jaam Saqi - Chaley Chalo ke Manzil Abhe Nahee Ayee

Jumhoori Publications

2 Aiwan-e-Tijarat Road,Lahore-Pakistan

T: +92-42-36314140, +92-42-36283098

Info@jumhooripublications.com

www.jumhooripublications.com

انقلاب روس کے نام

فہرست

ہماری یہ کتاب

زیرِ نظر کتاب ایک ایسی کہانی ہے جسے لکھنا انتہائی ضروری تھا کیوں کہ اس کہانی کا آغاز ایک ننھے ذہن کے تجربات سے ہوتا ہے۔ یوں یہ کتاب ایک اشارہ ہے کہ بہت سی ایسی کہانیاں ابھی لکھی جانی باقی ہیں جو ادبی، سیاسی اور ترقی پسند گھرانوں کے بچوں نے اپنی یادداشتوں میں سنبھال رکھی ہیں۔

جام ساقی کے بارے میں مَیں نے بچپن میں سرخ پرچم میں پڑھا تھا۔ ''سرخ پرچم'' کے ذریعے میں کئی سیاسی کارکنوں سے واقف ہوئی۔ حسن ناصر، نذیر عباسی اور جام ساقی کی جدوجہد اور سیاسی تحریک نے میرے ننھے سے ذہن میں تجسس اور تحقیق کو جنم دیا۔ یہ تحقیق و تجسس ہی ہے کہ میں سرخ پرچم کی تحریروں سے نہ صرف جام ساقی اور اُس کے خاندان کو قریب سے ملنے اور سمجھنے کی تگ و دو میں لگ گئی بلکہ اپنے اردگرد کے سماجی و سیاسی حالات کا بھی بغور جائزہ لینے لگی۔

پاکستان میں بائیں بازو کی جدوجہد اور تحریکوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور یقیناً بہت کچھ لکھا جانا ابھی باقی ہے۔

اس کہانی کو کتابی شکل دینا کوئی آسان کام نہیں تھا کیوں کہ جام ساقی میرے خیال میں ایک ایسی شخصیت ہیں جن کے ساتھ پورا ایک عہد جڑا ہوا ہے۔ اُن پر کتاب لکھنا دراصل بائیں بازو کی تحریک کو قلم بند کرنا ہے۔ سندھ کے سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی حالات میں جام ساقی کی پیدائش سے لے کر اُن کی ساری زندگی اور جدوجہد کا بغور مطالعہ، تحقیق اور تحریر احمد سلیم کے اشتراک

کے بغیر ممکن ہی نہ تھا۔ حالاں کہ اس کتاب میں جام ساقی کی اپنی آواز کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کیوں کہ وہ اپنی کہانی خود سُناتے ہیں۔ میں نے اُن کے کئی انٹرویو ریکارڈ کیے اور اُن کی کہانی اُن کی زبانی تقریباً ایک سال کی کاوش کے بعد مکمل ہوئی۔ ۵۱ گھنٹے کی ان یادداشتوں کو کاغذ پر اتارنے کا صبر آزما کام بھی کئی مہینوں پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کو لکھنے کا خیال کیسے آیا؟ دراصل دسمبر ۲۰۱۲ء میں پاکستان کے دورے کے دوران جام ساقی سے ملاقات حیدر آباد میں ان کے گھر پر ہوئی۔ اُن کی ذہنی صحت اور بات چیت سے میں بے حد متاثر ہوئی اور بے ساختہ میں نے کہہ دیا کہ کامریڈ آپ کو اپنی زندگی اور جدوجہد پر کتاب لکھنی چاہیے تا کہ آنے والی نئی نسل آپ کی سیاسی جدوجہد اور تحریک کو آگے بڑھا سکے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہاری یہ خواہش جلد پوری ہونے والی ہے۔ اسلام آباد کا کوئی ادارہ ہے جس نے مجھے جنوری یعنی اگلے ہی ماہ میں دو ہفتوں کے لیے اسلام آباد بلایا ہے۔ ان دو ہفتوں میں وہ میری ریکارڈنگ کریں گے اور پھر اس مواد کو تحریری شکل میں کتاب کی صورت شائع کیا جائے گا۔ یہ سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور مجھے کتاب کا انتظار اُسی لمحے سے شروع ہو گیا۔ وقت گزرتا گیا، پھر کچھ عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ جام ساقی بہت سخت بیمار ہیں اور لیاقت ہسپتال کراچی میں زیرِ علاج ہیں۔ میں نے اُن کو فون کیا تو اُن کے بیٹے سارنگ نے بتایا کہ (بابا جان) جام ساقی کی صحت بہت خراب ہے۔ اسی دوران میں نے اُن کی کتاب کے بارے میں بھی پوچھ لیا۔ یہ جان کر بے حد افسوس ہوا کہ وہ اہم کام تو ہوا ہی نہیں۔ حالاں کہ وہ دو ہفتوں کے لیے اسلام آباد گئے بھی تھے مگر اُس ادارے کے قول و فعل میں تضاد نکلا اور کتاب پر کچھ کام نہ ہو سکا۔

یہی وہ لمحہ تھا کہ میں نے یہ ٹھان لی کہ یہ کہانی جو میرے بچپن سے میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہے اس کو مجھے لکھنا ہی ہوگا۔ میں نے جام ساقی اور ان کے بیوی بچوں کو ساتھ ملایا، جنہوں نے اس لمبے اور صبر آزما کام میں میرا پورا پورا ساتھ دیا جس کے لیے میں ان سب کی شکر گزار ہوں۔ میں خاص طور پر سارنگ کی احسان مند ہوں کہ اُس کی مدد کے بغیر جام ساقی کے وہ انٹرویو ریکارڈ نہیں ہو سکتے تھے۔

احمد سلیم جو میرے اُستاد بھی ہیں اور ساتھی بھی، اُن کی رہنمائی، اَن تھک محنت اور تحقیق

نے اس کتاب میں سندھ کی سیاسی تاریخ کو بڑی سنجیدگی، گہرائی اور ذمہ داری کے ساتھ جام ساقی کی زندگی اور جدوجہد کے ساتھ جوڑا ہے۔ انہوں نے بہت دلجوئی سے میرا ساتھ دیا اور یہ نایاب تاریخی کہانی کتابی شکل میں مکمل ہوئی۔ میں ان کی دل سے شکر گزار ہوں کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ یہ انتہائی اہم کام احمد سلیم کے ساتھ کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔ ہماری اس مشترکہ کاوش میں جام ساقی کی زندگی کی کہانی کو سندھ کے سماجی و سیاسی حالات سے جوڑنا اور تحریر کرنا میری زندگی کا سب سے سنجیدہ کام ہے جس سے مجھے ہر ہر لمحہ سیکھنے اور پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کی تاریخ کو مزید سمجھنے کا موقع ملا ہے۔

اس کتاب کے سات ابواب ہیں۔ ہر باب جام ساقی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اُس دور کی سیاسی و سماجی تاریخ کا ایک جائزہ بھی پیش کرتا ہے جس کی تفصیل تو آپ پڑھ ہی لیں گے۔ مگر میں مختصراً یہ کہنا چاہتی ہوں کہ یہ کتاب خاص طور پر آج کے نوجوانوں کے لیے ہے جس سے وہ پاکستان میں جنم لینے والی ترقی پسند تحریکوں کے بارے میں اور اپنے ملک و عوام کی ترقی کے لئے دی گئی قربانیوں کے بارے میں جان سکیں گے۔ یوں یہ کتاب اُمیدِ سحر بھی ہے اور برے وقتوں کی داستان بھی۔

جام ساقی ہی کے الفاظ میں، ''جدوجہد ہمیشہ جاری رہتی ہے۔'' ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کہانی اور اس کہانی کے سینکڑوں کردار نئی نسل کے لئے مشعل راہ بنیں گے اور آنے والے وقتوں میں جام ساقی جیسے پُر امید اور سچائی کی راہ پر چلنے والے سیاسی کارکن پیدا ہوتے رہیں گے اور ایک دن اس دیس کا نصیب بدلنے کا خواب پورا کریں گے۔

نزہت عباس

باب 1

جام ساقی: دھرتی، جنم اور تعلیم

جام ساقی ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو تھر پارکر کی تحصیل چھاچھرو کے ایک چھوٹے سے گاؤں جنجھی میں پیدا ہوئے۔ اس وقت یہاں سے بہت دور دوسری عالمی جنگ تیزی سے اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سوویت یونین میں عوام کا دفاع خصوصاً سٹالن گراڈ کی لڑائی میں نازی فوجوں کی پسپائی سے محوری قوتیں ہتھیار ڈالنے پر آمادہ تھیں۔ ابھی جام چند ماہ کے ہی تھے جب دنیا بھر کے جمہوری اتحاد کی فتح سامنے نظر آ رہی تھی۔ بڑے پیمانے پر انسانی ہلاکتوں کا سلسلہ رکنے والا تھا جب امریکہ نے پہلے ہیروشیما اور ناگاساکی کے ہزاروں معصوم شہریوں کو ایٹمی تباہی کا نشانہ بنا کر امن کو زخم لگایا۔ جام ساقی سمیت پوری انسانیت آج تک اس تباہی پر نوحہ کناں ہے۔

یہاں رک کر جام کے تہذیبی، تاریخی اور انقلابی پس منظر کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جام کی پیدائش سے ٹھیک ایک صدی قبل ۱۸۴۴ء میں جنرل ہوش محمد شیدی وطن کی آزادی کے لیے گوریلا جنگ لڑ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے خون سے وطن کی آزادی کا لافانی نعرہ۔

مرویسوں، مرویسوں، سندھ نہ ڈیسوں

تخلیق کیا تھا۔ یہ داستان سندھ کی پوری دھرتی اور جام کے اپنے خون میں بھی رچی ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ۱۸۴۳ء میں سندھ پر جنرل نیپئر کا قبضہ ہو گیا تو ہوشو شیدی نے آزادی کے اعلان نامے پر اپنے خون سے دستخط کیوں کیے؟ ہم اس بات کو ذرا کھول کر بیان کرنا چاہتے ہیں۔ ۱۸۴۳ء میں میانی میں انگریزوں سے شکست کے بعد سندھیوں نے انہیں میر شیر محمد کی قیادت میں ڈبے کے

میدان میں للکارا۔

شیر محمد خان جو حیدرآباد سے بارہ میل دور پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا، نے ۱۵ مارچ ۱۸۴۳ء کو نیپئر کے نام اپنے پیغام میں کہا کہ اگر وہ گرفتار شدہ میروں کو رہا کر دے تو اسے سندھ چھوڑنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ اس پیغام کا جواب نیپئر نے توپ کے گولے سے دیا۔ دُبے کے میدان میں دونوں لشکروں کا سامنا ہوا۔ اب سندھی، جنگ میانی سے مختلف پوزیشن میں تھے۔ بلوچوں نے گیارہ توپوں سے حملہ کر دیا۔ انگریزوں کی توپوں نے سندھیوں کے بارود پر گولے برسائے اور بے شمار سپاہی شہید ہوگئے۔ پھر نیپئر نے پھلیلی کی طرف سے حملہ کر دیا لیکن اس جانب سے انگریزی لشکر کو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور وہ پسپائی پر مجبور ہو گیا۔ پے در پے پسپائیوں سے پریشان ہو کر نیپئر نے سندھیوں پر کئی جانب سے حملہ کر دیا۔

جام ساقی کا ہیرو، شیدی غلام جرنیل ہوش محمد جس بہادری اور شجاعت کا ثبوت دے رہا تھا، اس نے انگریزوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ یہ حبشی غلام جو میر صوبدار خان کا نوکر تھا اور بقول مرزا عباس علی بیگ کے اسے لڑائی پر آمادہ نہ پا کر خود جنگ میں شامل ہو گیا تھا، نیپئر کے لشکر پر قہر بن کر ٹوٹ رہا تھا۔ جب انگریزی فوج کی شکست کے آثار نمایاں ہونے لگے تو نیپئر نے ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنی آخری چال کو داؤ پر لگا دیا۔ طاقت کے استعمال کے باوجود واضح ناکامی کے بعد اپنی روایتی عیاری سے کام لیتے ہوئے اس نے چند غدار سندھیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ وطن فروش غداروں نے اپنے ہی بارود کو آگ لگا دی اور فوج بے کار ہو کر رہ گئی، لیکن بلوچ جوانوں نے اپنے اُبلتے ہوئے لہو کو بارود بنا لیا اور وہ بھالوں اور تلواروں سے انگریزی لشکر پر ٹوٹ پڑے۔

ہوشو نے صورتِ حال دیکھتے ہوئے شیر سندھ کو میدان جنگ سے دور نکل جانے کا مشورہ دیا لیکن اس نے جواب دیا:

''شیر محمد میدانِ جنگ کو چھوڑ کر مادرِ وطن کی مٹی کو شرمندہ کرے یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ انگریزوں کو شیر محمد کا زندہ جسم نہیں بلکہ لاش ملے گی۔''

ہوشو نے اصرار کرتے ہوئے پھر کہا:

''سرکار، آپ سندھ کی امید ہیں، آپ زندہ ہیں تو سندھ زندہ ہے۔ اگر آپ شہید ہو گئے

تو سندھ کی قسمت کا ستارہ بھی ڈوب جائے گا اور آنے والی نسل کہے گی کہ بلوچ بزدل تھے''

آخر میر شیر محمد نے میدان چھوڑ دیا۔

خوفناک مقابلے میں میر غلام علی تالپور، ہوشو شیدی اور پانچ ہزار بلوچ سپاہی شہید ہوئے۔ مرزا عطا محمد شکار پوری نے اپنی کتاب ''تازہ نوائے معارک'' میں لکھا ہے:

''جب انگریزوں نے میروں کو حیدر آباد میں قید کر لیا تو میر شیر محمد دُبے میں انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ پہلے ہوش محمد ایک دستہ فوج لے کر لڑا اور شہید ہوا۔ پھر میر غلام علی ابن میر عبداللہ تالپور، رحیم خان تالپور، کمال خان مری اور نومانی بلوچ تین سو سپاہیوں کے ساتھ پورے جوش وخروش سے لڑے اور انگریزی فوج کا کافی نقصان کیا۔ نیپئر غصے میں سر کے بال نوچنے لگا۔ اس جنگ میں محمد خان ٹھوڑھو، میر خان محمد اور غلام محمد لغاری انگریزوں کے ایماء پر میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کے بارے میں سارنگی پر گائے جانیوالے چند اشعار ان کے مکروہ کارناموں کی طرح ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

شاعر کہتا ہے:

''لغاریوں نے مقابلہ کیا لیکن ٹھوڑھے کو تو دیکھو

ہرے منہ والا نواب ٹھوڑا سب سے پہلے بھاگا

اس نے اپنی بدکاری سے تمام ٹھوڑہوں کو بدنام کیا

میر کا لاکھوں روپیہ کھا کر ایک کوڑی کو بھی کام نہ کیا

احمد خان لغاری کے بارے میں آپ کو بتاتا ہوں

اس کے منہ پر نہ مونچھ ہے نہ ڈاڑھی ہے

وہ جھوٹے علی مراد کا بکا ہوا آدمی ہے

اس نے اپنے بھائیوں کو بھی رُلایا اور دوسرے بچوں کو بھی

شاعر ہمیشہ سچ بولتا ہے

خواہ دوسرے لوگ ناراض ہوں

مرد کے قول میں جھوٹ نہیں ہونا چاہیے

میں جھوٹ کا پول کھول رہا ہوں
غلام محمد لغاری بھاگ گیا
ہاتھ میں ہاتھ دے کر بھاگ گیا
میر نصیر خان سے قول کر کے پھر گیا
شاعر اپنے میر سے سچ بولتا ہے۔
خان محمد اپنا گھر چھوڑ کر بھاگ گیا اور پوری زندگی تلوار اٹھانے سے توبہ کر لی
دوست محمد بھی احمد خان کو لڑنے کا کہہ کر بھاگ گیا۔''

جام ساقی، شاعر کے ان بولوں کو آج بھی اپنے دل میں دہراتا ہے۔

میر شیر محمد کے میدان چھوڑ جانے کے بعد ہوشو نے بے پناہ بہادری کا مظاہرہ کیا اور ایک ایک شیدی مادرِ وطن کی آن پر کٹ مرا۔

بچے کھچے بارود کے خاتمے کے بعد بھی وہ دشمن کے سامنے ڈٹا رہا۔ اس نے اپنی تلوار سے ہر طرف لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ بے ہتھیار ہوشو فتح مند تھا اور دشمن کے سپاہی ہتھیاروں کے ہوتے ہوئے بھی خاک وخون میں تڑپ رہے تھے۔ اس نے دشمن کو دو میل پیچھے کی طرف دھکیل دیا اور آخر کار ۲۲ رجمنٹ کی ایک توپ نے اس کے بے قرار لہو کو فضاؤں میں اچھال دیا۔ مرتے وقت اس کے منہ پر وہی پرانا نعرہ تھا:

''مر ویسوں، سندھ نہ ڈیسوں''

جنرل نیپئر نے ٹوپی اتار کر ہوشو کی لاش کو سلام کیا۔ فوجی اعزاز اور توپوں کی سلامی کے ساتھ اسے دفن کیا گیا۔ ہوشو کی شہادت کے فوراً بعد جنگ ختم ہو گئی۔ دھرتی نے اپنے بیٹے کو آغوش میں لے لیا تھا۔ اب خاک وخون کے کھیل کا جاری رہنا بے فائدہ تھا۔ سندھڑی نے انگریزی سامراج کا غلام بننے سے پہلے ''غلام'' ہوشو کو اپنے کلیجے سے لگا لیا۔ یہ زنجیریں نیپئر نے سندھڑی کو پہنا دیں۔

بائیسویں رجمنٹ کی ایک توپ نے ہوشو کی جان لے لی۔ اس کی روح کے ساتھ یہ خیال بھی فضاؤں میں بکھر گیا کہ نظریہ نہیں مر سکتا۔ جذبہ ہلاک نہیں کیا جا سکتا۔ موت جسم تک قادر ہے

اس سے آگے اس کے پر جلتے ہیں۔

ہوشو کے بارے میں شاعر نے لکھا:

''ہوش محمد قنبرانی حملہ کرتا ہوا میدان میں آیا۔

اس دولہا نے آتے ہی میدان میں تباہی مچادی

شیدی نے اپنا سر قربان کردیا

(دشمن کے) سیکڑوں سپاہی شیدی پر ٹوٹ پڑے

شیدی پر افسوس نہیں ہے

فتح تو اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے

مرد کا کام تو مقابلہ کرنا ہے۔''

دیکھئے اس مردِ حُر کے بارے میں دشمن کیا کہتا ہے۔ سر چارلس نیپئر لکھتا ہے:

''میانی اور دُبے کی لڑائیوں میں سپہ سالار قابلِ تعریف ہے۔ اس نے جنگ میں رُوح پھونک دی تھی۔ وہ حبشی غلام دل کا بہادر تھا۔ میروں کا یہ خاص نوکر میانی کی جنگ کے بعد اپنے بھائیوں سمیت ہمارے آگے ہتھیار ڈالنے کی بجائے دُبے کی لڑائی میں شریک ہونے کے لیے گیا۔ ہوش محمد دُبے کی لڑائی میں بہادری سے لڑتا ہوا بائیس رجمنٹ کی توپ کے ٹکڑوں سے مر گیا۔ دراصل ہوش محمد کے مرنے کے بعد شیر محمد کی شکست کے آثار نمودار ہوئے اور کئی گھوڑ سوار سپاہی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔''

ایک دوسرے انگریز نے ہوشو کی عظمت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

''اس نے توپ چلائی۔ اس نے حکم دیا اور دوسروں کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ اِدھر تھا۔ اُدھر تھا۔ ہر کہیں تھا۔''

''اس بہادر شخص نے جنگی مہارت کا ایسا زبردست مظاہرہ کیا جو کسی یورپی جرنیل سے بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنے دوسرے شیدی بھائیوں کے ساتھ تھا اور جنگ میں سب سے آگے تھا۔''

ایک انگریز لیفٹیننٹ نے کہا:

''یہ ہوشو ہے سربلند۔''

کیپٹن رچرڈسن سے میجر جیکب نے ہوشو کے لیے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''وہ بے رحمی سے لڑتا ہے۔اس نے ہمارے کتنے ہی نائٹوں کو ہلاک کر دیا ہے۔اسے بجا طور پر قتل کر دو کیپٹن۔''

ایک اور انگریز نے پکارا:

''وہ جو مردوں کے درمیان کھڑا ہے۔وہی اس سرزمین کا بہادر بیٹا ہے جو تنہا مادرِ وطن کے لیے لڑنے کی جرأت کر سکتا ہے۔''

ایک جنگجو دیمیترس نے کیپٹن رچرڈسن سے کہا:

کیپٹن! جو سر سے پاؤں تک لہو میں رنگا ہوا ہے اگر چاہے تو کلہاڑی کے ایک وار سے دھرتی کو چیر ڈالے۔میں نے آج اسے گرجتے ہوئے سنا ہے۔کیپٹن رچرڈسن یاد رکھنا! سندھ میں اس کی آواز صدیوں تک گونجتی رہے گی۔میں نے اپنی زندگی میں ہوشو جیسا جرنیل نہیں دیکھا۔''

اس طولانی داستان کے لیے معذرت لیکن جام کی بغاوت کو سمجھنے کے لیے ان روایات کو سمجھنا ضروری ہے۔

ہوشو سر بلند، جام سر بلند!

پھر ۱۸۵۷ء میں، جب غلامی سے اکتائے ہوئے ہندوستان نے بغاوت کا علم بلند کیا تو سندھ بھی آزادی کی اس جنگ میں کود پڑا حالاں کہ اسے غلامی کی زنجیریں پہنے، صرف چودہ سال ہوئے تھے اور سندھ نے ایک بار پھر اپنے خون سے آزادی کے اعلان نامے پر دستخط کیے۔کراچی کی ایمپریس مارکیٹ، جو اس وقت ایک میدان کا نقشہ پیش کر رہی تھی وہاں جنگِ آزادی کے سپاہیوں کو توپ دم کیا گیا۔دور تک سولیوں کی قطاریں نصب تھیں۔حیدرآباد، میر پور خاص اور سندھ کے دیگر شہروں میں بھی یہ قطاریں پھیلی ہوئی تھیں۔یہ سب جام ساقی کا ورثہ تھا لیکن سرفروشی کی جو مثال روپلو کوہلی نے قائم کی، وہ جام ساقی کے وجود میں اتر گئی۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران روپلو کوہلی نے علم بغاوت بلند کیا اور لڑتے لڑتے انگریزوں کے قبضے میں آیا تو اسے عبرتناک تشدد سے گزرنا پڑا۔وہ تھرپارکر سے ملحق ننگر پارکر کا رہنے والا تھا۔جب وہ لڑ رہا تھا تو حکمرانوں نے اس کی بیوی کو دھمکی دی کہ اگر اس نے ہتھیار نہ ڈالے تو اسے نشانِ عبرت بنا دیا جائے گا۔وہ انگریزی قبضے

میں ہتھیار ڈالنے سے انکاری رہا۔ مقامی روایات کے مطابق، روپلو کی بیوی نے اس سے کہا کہ اگر اس نے ہتھیار ڈالے تو کوئی کوہلی عورت اپنے مرد پر اعتبار نہیں کرے گی۔

روپلو کو جس درخت پر پھانسی دی گئی۔ اس کی لاش کافی عرصہ اس پر لٹکتی رہی۔ یہ درخت ڈیڑھ صدی تک آزادی کے متوالوں کی زیارت گاہ بنا رہا اور اب سے چند سال پیشتر اس کا وجود مٹ گیا لیکن روپلو اور اس کی بغاوت کی یاد کو نہیں مٹایا جا سکا۔ اب بھی یہ تھر کی مقبول ترین کہانی ہے۔

جام کے ورثے میں شہید ہیموں کالانی بھی شامل ہیں، جو ان کی پیدائش کے ارد گرد شہید کیے گئے۔ شہید بھگت سنگھ کے اس چیلے نے اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ تھانوں اور دیگر مقامات کو بموں سے اڑانے کی سات وارداتیں کیں۔ ان میں اکثر وارداتیں کامیاب رہیں۔ جام نے یہ راستہ نہ اپنایا بلکہ جس طرح شہید بھگت سنگھ کے ساتھیوں نے کمیونسٹ پارٹی کا راستہ اختیار کیا۔ اسی طرح جام بھی کمیونزم کی طرف گئے۔ ان کے دیگر گرووں میں ہم سوبھو گیان چندانی، فیض اور شیخ ایاز کا نام لے سکتے ہیں، جن کی روایات پر چلتے ہوئے، محمد جام، جام ساقی بن گئے۔

جام پیدا ہوئے تو انہی دنوں میر پور خاص سے تعلق رکھنے والے کامریڈ غلام محمد لغاری خاکسار تحریک چھوڑ کر ''ہاری حقدار'' تحریک میں سرگرم ہو چکے تھے۔ ان کے ہاتھ میں اب بیلچے کی جگہ سرخ پرچم تھا۔ وسائل سے محروم کامریڈ کاغذ لے کر کاربن کاپیوں کے ذریعے اپنے ہاتھوں سے اشتہار لکھتا اور پھر انہیں دور دراز کے دیہات میں جا کر اہم مقامات پر چسپاں کرتا۔ سرخ پرچم اس کے ہاتھ میں ہوتا۔ وہ روزانہ میلوں پیدل چل کر، جہاں انسانوں کا دور دور تک پتا نہ ہوتا، درختوں اور جھاڑیوں کے سامنے ہی ہاری کی حمایت میں تقریر شروع کر دیتا تا کہ اسے تقریر کرنے کے فن میں مہارت حاصل ہو جائے۔ اپنے سنِ شعور کو پہنچنے پر جام کو جب ان کہانیوں کا پتا چلا تو اسے یہ آدرشی انسان بہت اچھا لگا۔ آخر کو اس نے اسی آدرش کے راستے پر آگے جانا تھا۔

انہی دنوں ۴۵-۱۹۴۴ء میں جام کے محبوب شاعر فیض ادب کی ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ عالمی جمہوری قوتوں کی فتح کی جدوجہد سے بھی جُڑے ہوئے تھے۔ جام جب سکول جانے لگے تو اس دور دراز علاقے میں اسے فیض کے بچپن کے بارے میں بتانے والا کوئی نہ تھا۔ لیکن فیض نے اپنے بچپن کے دنوں میں جس خواب کو اپنے دل میں بسا لیا تھا، وہ آگے چل کر جام کا بھی خواب

بننے والا تھا۔ جب کئی برس بعد انہیں فیض کے بچپن کے دنوں کی کہانی کا پتا چلا تو جام حیران رہ گئے کہ ان کا بچپن فیض کے بچپن جیسا کیوں نہیں تھا اور فیض کیسا بچہ تھا جس نے اتنی کم عمر میں اپنی امارت کو ٹھوکر مار کر اپنے ہم جماعتوں جیسا بننے کی کوشش کی تھی۔ ہوا دراصل یہ تھا کہ فیض کو اپنے زرق برق لباس کے ساتھ ٹاٹ پر بیٹھنا اور ان میلے کچیلے بچوں سے اپنا مذاق اڑوانا پڑا تھا۔ جام کی اس حیرت کا، اس سوال کا جو جواب فیض نے دیا، وہ بھی جام کی آئندہ کی زندگی کا تعین کرنے والا تھا۔ فیض نے بچوں کے ایک ٹی وی پروگرام میں اپنی کہانی سنائی تھی، جو جام اپنی سیاسی روپوشی کے باعث نہیں سن سکے تھے اور بہت برسوں بعد انہیں اس کہانی کو پڑھنے کا موقع ملا تھا۔

''ہوا یہ کہ جب پہلے دن ہمیں جانا تھا سکول، تو ہماری بڑی بہنوں نے ہم کو تیار کیا۔ سکول جانے کے لیے مخمل کے کپڑے ہم کو پہنائے گئے، سرخ رنگ کی واسکٹ تھی اور ویسی ہی نیکر اور ریشمی موزے۔ اور بہت بڑھیا قسم کے جوتے اور کڑھی ہوئی ٹوپی۔ تو جناب یہ پہنا کر ہم کو بھیجا گیا سکول۔ ہم نے تو کبھی سکول دیکھا نہیں تھا۔ ہمیں کیا پتا کہ وہاں کیا تھا۔ اب جب ہم سکول پہنچے تو وہ اسلامیہ سکول تھا۔ تو وہاں جا کر ہم نے دیکھا کہ بے چارے بچے جو ہیں، تو کسی کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں، کسی کے پاؤں میں جوتا نہیں ہے، کسی کے سر پر ٹوپی نہیں ہے۔ تو جب ہم کلاس میں پہنچے تو سب نے ہماری طرف ایسے دیکھا جیسے کوئی عجیب قسم کا جانور آ گیا ہو کلاس میں۔ اس لیے کہ وہ بے چارے سیدھے سادے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ میلے کچیلے اور پھٹے ہوئے۔ اس زمانے میں ڈیسک ویسک نہیں ہوا کرتے تھے چھوٹی جماعتوں میں۔ بڑی جماعتوں میں جا کر ڈیسک ملتے تھے۔ اس وقت تو فرش پر ٹاٹ بچھا ہوتا تھا تو وہیں لوگ بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ اور اب ہم نے کہا کہ ہم میلے فرش پر کیسے بیٹھیں تو ہمیں وہاں بڑی گھبراہٹ ہوئی۔ اور بچوں نے ہمیں اس طرح دیکھا، کچھ مذاق سے اور کوئی تھوڑے سے غصے سے کہ یہ کون آ گیا ہے۔ پھر اگلے دن انہی کی طرح کے کپڑے پہن کر گیا۔ اس کے بعد پھر کبھی ہم نے ایسے کپڑے نہیں پہنے۔ جیسے لوگ رہتے ہوں نا ویسے ہی رہنا چاہیے۔ ان سے الگ ہو کر امارت ظاہر کرنے یا یہ بتانے کے لیے کہ ہمارے پاس بہت پیسے ہیں، ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے کہ جسے لوگ دیکھ کر برا منائیں۔''

اس واقعہ کے تیس برس بعد جام ۱۹۴۴ء میں پیدا ہوئے اور جب پہلے دن سکول گئے تو

پاکستان بن چکا تھا اور فیض پہلے ہی داغ داغ اجالا کی بات کر چکے تھے کہ:

یہ وہ سحر تو نہیں، جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

پھر جام کا بچپن تو تھر پارکر کا بچپن تھا، جو ویسے ہی جدید دور سے ایک صدی پیچھے تھا۔ اسی تھر کے پڑوس کے ایک گاؤں میں کامریڈ غلام محمد لغاری آج سے ایک صدی قبل ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ سال جام کی زندگی کا اہم ترین سال بننے والا تھا اور آج ۲۰۱۶ء میں جام سوویت انقلاب کی ۱۰۰ ویں سالگرہ کے دہانے پر موجود سوچ رہے ہیں کہ انہوں نے جو زندگی بسر کی اس میں انہوں نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ اور جو کچھ پایا، وہ زندگی کا حاصل ہے یا نہیں؟ اور سوویت صدی کے اس تاریخی موقع پر ان کے بارے میں تاریخ کا فیصلہ کیا ہے؟ انسانوں کی زندگیوں اور کردار کا تعین سچ مچ تاریخ نے کرنا ہوتا ہے۔ فیض، کامریڈ لغاری اور جام ساقی نے ۱۹۱۷ء کو اپنی زندگی کا سنگِ میل قرار دیا تو اس میں ان کے اپنے کردار کے علاوہ ۱۹۱۷ء کا انقلابی دور بھی تھا۔ اس بات کی مزید وضاحت کے لیے ہم دوبارہ فیض کے بچپن کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

بچپن کی سب سے پرانی دھندلی سی یادیں۔ ''پہلی عالمگیر لڑائی ختم ہو چکی ہے۔ ایک جانب انگریز حکمران اور ان کے دیسی حاشیہ بردار جشن فتح منا رہے ہیں، سڑکوں پر رنگین جھنڈیاں لگائی جا رہی ہیں، توپیں دَغ رہی ہیں، بینڈ باجے اور فوجی سوار گشت کر رہے ہیں۔ دوسری طرف قومی آزادی کی تحریک شروع ہو چکی ہے، آئے دن جلسے جلوس، نعرے، ''جو بولے سو نہال، ست سری اکال''، ''نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر۔'' قومی نعرہ، ''بندے ماترم، ٹوڈی بچہ ہائے ہائے'' ''آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔'' بڑے بڑے لیڈر پھولوں سے لدی ہوئی گاڑیوں میں شہر سے گزر رہے ہیں۔ یہ موتی لال نہرو ہیں۔ یہ محمد علی اور شوکت علی ہیں۔ یہ ابوالکلام آزاد ہیں۔ یہ بابا کھڑک سنگھ ہیں۔ یہ ڈاکٹر کچلو ہیں۔ جگہ جگہ خوش آمدید کے لیے دروازے سجائے گئے ہیں اور کوچہ و بازار میں تماشائیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہیں۔ آج ترکوں کی کسی فتح کی خوشی میں شہر میں چراغاں ہو رہا ہے، تو کل کسی لیڈر کی گرفتاری پر سارے شہر میں ہُو کا عالم ہے۔

انہی یادوں میں کہیں گڈ مڈ اخباروں کی شہ سرخیاں ہیں اور اخبار بیچنے والوں کا غوغا ہے،

''روس میں زار شاہی کا تختہ الٹ گیا۔'' لینن نے مزدور طبقے کی حکومت قائم کر لی۔'' ''سرخ انقلاب آ گیا۔'' جگہ جگہ لوگوں میں چہ مگوئیاں ہو رہی ہیں۔ ہمارے گھر کے دیوان خانے میں، سکول کے سٹاف روم میں، محلے کی مسجد میں، ہر جگہ ایک ہی تذکرہ ہے۔ یہ روسی انقلاب کیسے ہوا۔ کیوں کر ہوا؟ کیا انقلابی فوجیں ہندوستان پہنچ کر ہمیں بھی آزاد کروالیں گی؟ مزدوروں، کسانوں کی حکومت کیسی ہوتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

''جب ابا کچہری چلے جاتے تو گلی محلے کے لوگ باگ جو ہمارے گھر کے آس پاس دکان یا کاروبار کرتے تھے، اس گھر کے بیرونی چبوترے پر آ جمع ہوتے جہاں ابا کے موکلوں کے لیے بینچ اور مونڈھے وغیرہ پڑے رہتے تھے۔ کوئی گاہک آ گیا تو جلدی سے اسے نمٹا کر پھر آ بیٹھے۔ اللہ دیا پہلوان، چراغ دین تیلی، اللہ رکھا قصاب، خوشیا حجام اور ان کے یار دوست گھنٹوں ملکی اور غیر ملکی سیاست پر گپ لڑاتے رہتے۔ ''ارے بھئی کچھ سنا بھی ہے، مہاتما گاندھی اور محمد علی، شوکت علی نے اعلان کر دیا ہے کہ ''ایک سال کے اندر اندر سب انگریز لاٹ، کمشنر، ڈپٹی کمشنر نکال دیئے جائیں گے اور ان کی جگہ ہمارے لوگ لگائے جائیں گے۔'' اور ''بھئی یہ بھی تو سنا ہے کہ غازی کمال پاشا کی فوجیں انگریزوں کو ہرا کر افغانستان کی طرف سے آ رہی ہیں''۔ ''ہاں ہاں، روسی فوجیں بھی تو ان کے ساتھ مل گئی ہیں، روس کے بادشاہ زار کا تختہ تو الٹ گیا ہے نا! وہاں کوئی لیڈر پیدا ہوا ہے، لینن۔ اس نے مزدوروں کی فوج بنائی ہے اور بادشاہ کو بھگا کر سب روپیہ پیسہ لوگوں میں بانٹ دیا ہے۔'' اور ''مزدوروں کا راج بھی بنا دیا ہے''۔ ''شاباش شیر دے پتر، یار اپنے آغا صفدر سے کہو کہ وہ بھی کوئی ترکیب لڑائیں۔ کچھ ہمارا بھی بھلا ہو۔'' (آغا صفدر شہر کے سیاسی لیڈر تھے) ''کوئی ایسی ترکیب لڑ جائے تو مزہ آ جائے، یہ سامنے والے ساہوکار لالہ ہر جس رائے کا مال بٹے تو ہم سب کے وارے نیارے ہو جائیں۔''

''روس، لینن اور انقلاب کی بات ان بھولے بسرے دنوں میں پہلی بار کان میں پڑی تھی اور اب کچھ اندازہ نہیں کہ ہمارے طفلانہ ذہن نے ان کے بارے میں کیا تصور باندھا ہوگا۔ پھر ہم ذرا بڑے ہو کر سکول میں پڑھنے لکھنے اور دوسری دلچسپیوں میں کھو گئے اور یہ سب کچھ بھول بھال گئے۔''

ہم نے جام سے پوچھا: ''سکول میں آپ کا پہلا دن؟''

جام کو ٹھیک سے یاد نہیں ہے کہ پہلے دن سکول میں کیا ہوا تھا۔ دراصل جام کے والد محمد بچل گاؤں کے پرائمری سکول میں استاد تھے اور جام انہی کے ساتھ گھر سے سکول جایا کرتے تھے۔ انہیں اچھی طرح یاد ہے کہ سکول جانے کے اس معمول میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ جام کے والد سکول میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ ایک سماجی کارکن بھی تھے اور اپنی ساری تنخواہ سماجی کاموں پر خرچ کر دیا کرتے تھے۔ ریت کے ٹیلوں میں گھرا ہوا چھوٹا سا ایک گاؤں تھا۔ والد کے سماجی کاموں کے باعث گھر کے لیے مشکل سے ہی کچھ بچتا تھا اور گھر کے افراد کو کئی بار بھوکا رہنا پڑتا۔ لیکن جام کی والدہ کو اپنے شوہر سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

روز صبح والد کے ساتھ سکول جانا ننھے جام کا معمول تھا۔ گرمیوں میں تپتی ریت اور سردیوں میں کہرے کے باوجود محمد جام اپنے والد کے ساتھ سکول جاتے۔ ایک دن محمد بچل کو سکول جانے میں دیر ہو گئی۔ جام ان کا منتظر تھا کہ والد فارغ ہوں اور وہ سکول جا سکیں۔ یہ قیام پاکستان کے ابتدائی برس تھے غالباً ۵۰۔۱۹۴۹ کے دن۔ جب والد فارغ ہوئے تو جام اپنے والد کے ساتھ سکول کے لیے چل پڑے۔ راستے بھر والد خاموش رہے لیکن سکول پہنچتے ہی جام کو ڈانٹنے لگے کہ تم سکول دیر سے کیوں آئے ہو؟ جام والد کی ڈانٹ کا کیا جواب دیتے، خاموش رہے۔ والد کے ایک ساتھی استاد، سنت رام داس، جن کا تعلق، نچلی ذات کے ہندو گھرانے سے تھا، یہ سب دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے جام کو بلایا اور سمجھانے کے انداز میں کہنے لگے:

''تمہیں پتا ہے، تمہارے بابا جذباتی آدمی ہیں۔ راستے بھر انہوں نے کچھ نہیں کہا کیوں کہ سکول آنے میں دیر ان کی وجہ سے ہوئی لیکن چوں کہ وہ تمہیں اپنے سے بہت آگے دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے جذبات سے پھٹ پڑے۔''

جام نہیں جانتے کہ سکول میں ان کے پہلے دن کے تاثرات کیا تھے لیکن اس واقعہ کو وہ کبھی نہ بھول سکے۔ سکول کے دنوں کے جو اولین تاثرات انہیں یاد تھے وہ یہی تھے۔ اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے جام تلخی محسوس نہیں کرتے۔ ان کا ایک بھائی سلطان اور بہن ماروی تھی۔ آج ان کا بھائی ڈاکٹر ہے اور بہن ہیڈ مسٹریس لیکن یوں لگتا ہے کہ والد نے ساری توقعات جام ہی سے وابستہ

کر لی تھیں۔ جام نے بھی اپنی ساری توجہ زندگی میں آگے بڑھنے پر مبذول کر دی۔ دنیاوی ترقی پر نہیں بلکہ ذہنی اور شعوری ترقی پر۔ یہ قدرتی بات تھی، محمد بچل، خود اپنے خون پسینے کی کمائی اپنے سماجی کاموں پر لٹا رہے تھے، جام کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر بنے تو انہوں نے بھی اپنے پیشے کو خدمت خلق کی بنیاد بنایا۔ جام پرائمری اور مڈل کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اب میٹرک میں تھے۔ جب ۱۹۶۱ء میں انہوں نے تقریری مقابلہ میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو موضوع بحث بنایا اور ایک کامیاب مقرر کے طور پر سامنے آئے۔ پرائمری کے ایک ریٹائرڈ استاد عنایت اللہ، جن کا تعلق پاکستان کی زیر زمین کمیونسٹ پارٹی سے تھا، جام کی تقریر سے بے حد متاثر ہوئے۔ اس ملاقات نے جام کی زندگی کا حقیقی راستہ متعین کر دیا۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کی طرف ایسے کھنچے گئے جیسے پیاسا کنوئیں کی طرف جاتا ہے لیکن پارٹی سے حقیقی جُڑت کے لیے ابھی کچھ مراحل باقی تھے۔ انہیں کچھ عملی تجربوں سے گزرنا تھا۔

۱۹۶۲ء میں لوکل بورڈ سکول چھاچھرو سے میٹرک کرنے کے بعد وہ حیدر آباد آ گئے جہاں انہوں نے گورنمنٹ کالج کالی موری میں فرسٹ ایئر آرٹس میں داخلہ لے لیا۔ اب اپنے ایک استاد باقر سنائی کے ذریعے ان کا کمیونسٹ پارٹی سے رابطہ ہو گیا۔ جلد ہی انہیں روپوشی کی زندگی کا تجربہ ہوا۔ ایک دن باقر سنائی نے انہیں آ کر بتایا کہ ایک روپوش ساتھی سے ملانا ہے۔ حیدر آباد میں پھلیلی کے نزدیک ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔ ان ساتھی کو آٹھ بجے پہنچنا تھا، وہ آٹھ بج کر پانچ منٹ پر آئے اور آتے ہی معذرت کی کہ وہ پانچ منٹ لیٹ ہو گئے ہیں۔ ان کے اس طرح معذرت کرنے پر جام بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے خود بھی وقت کی پابندی کو اپنا شعار بنا لیا۔ وہ ساتھی عزیز سلام بخاری تھے۔ جلد ہی ون یونٹ کے خلاف انہوں نے ایک پمفلٹ لکھا جس کی قیمت دس پیسے تھی۔ مقصد یہ تھا کہ جو بھی اسے خریدے گا وہ اسے پڑھے گا ضرور۔ ان دنوں کامریڈوں کا سستا سیاسی لٹریچر بیچنا ایک اہم سیاسی کام سمجھا جاتا تھا۔ جام نے یہ کتابچہ کالج میں سیکڑوں کی تعداد میں بیچا۔ چند ماہ بعد اس پر پابندی لگنے کی اطلاع اخباروں میں چھپی۔ جس سے کتابچے کی مقبولیت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

یہ سرگرمیاں جاری تھیں کہ کالج میں چند نئے ساتھی داخل ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں عظیم بلوچ

رہنما غوث بخش بزنجو کے صاحبزادے بیزن بزنجو نے داخلہ لیا۔غوث بخش نے پیغام بھیجا:

''میرے بیٹے پر توجہ دی جائے اور اس سے کام لیا جائے۔''

بیزن کے بعد ماتلی سے اسمٰعیل اڈیجو نے داخلہ لیا۔اس کے بعد یونس کھتری اور آصف مرزا بھی کالج میں داخل ہو گئے۔اسمٰعیل کے آنے سے کالج میں ہنسی مذاق کی فضا بن گئی۔۱۹۶۳ء میں جام اور ان کے نئے ساتھیوں نے ایک دستخطی مہم چلائی۔اس مہم کے تین نکات تھے۔پہلا نکتہ یہ تھا کہ مادری زبانوں میں امتحانات لیے جائیں۔دوسرے یہ کہ انٹر سائنس میں پاس ہونے والے طالب علموں کو، متعلقہ شعبوں میں سیٹیں بڑھا کر داخلے دیئے جائیں یا پھر انہیں کھپانے کے لیے نئے کالج کھولے جائیں۔تیسرے یہ کہ طلباء و طالبات داخلے کے وقت جو فیس دیتے ہیں وہ تمام تعلیمی عرصے کے لیے ہو اور ہر سال نئی فیسیں نہ لی جائیں۔ان مطالبات کے لیے جام اور ان کے ساتھیوں نے دو ہزار دستخط اکٹھے کیے۔۶۴۔۱۹۶۳ء کے دوران وہ زور و شور سے ون یونٹ کے خلاف پمفلٹ تقسیم کرنے اور پرانے صوبے بحال کرنے کے حق میں پراپیگنڈا کرتے رہے۔ستمبر ۱۹۶۴ء میں انہوں نے سوچا کہ محض باتوں سے کام نہیں چلے گا، کام کرنے کے لیے تنظیم بنانا ہو گی۔

کمیونسٹ پارٹی سے رابطے کے باعث جام طبقاتی سیاست میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ انہی دنوں مدیجی میں کسان کانفرنس منعقد ہوئی، جہاں ان کی ملاقات سینئر ترقی پسند رہنما کامریڈ غلام محمد لغاری سے ہوئی۔جام ساقی نے ان سے کہا کہ وہ ایک طلبا تنظیم بنانا چاہتے ہیں۔کامریڈ لغاری یہ سن کر بے حد خوش ہوئے۔انہوں نے ہر قسم کے تعاون اور مدد کا وعدہ کیا۔یہ ملاقات ان کی زندگی میں ایک سنگِ میل ثابت ہوئی اور جب چند برس بعد وہ جیل گئے تو وہاں کامریڈ لغاری اور مہر حسین شاہ بھی تھے۔کامریڈ لغاری نے جام سے مہر حسین شاہ کا تعارف کرایا جو زندگی بھر کا نظریاتی تعلق بن گیا۔

۱۹۶۴ء میں مدیجی ہاری کانفرنس سے واپسی پر جام نے یونس کھتری، اسمٰعیل اڈیجو، بیزن بزنجو اور آصف مرزا کے ساتھ مل کر حیدرآباد سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی۔انہوں نے فیصلہ کیا کہ جب تمام اضلاع میں ضلعی سطح پر تنظیم قائم ہو جائے گی تو پھر اسے سندھ کی سطح پر منظم کیا جائے گا۔تنظیم کے دوسرے اجلاس میں مزید ساتھی شامل ہو گئے۔جن میں لطیف سومرو، اعجاز قریشی، یوسف لغاری اور

حبیب خواجہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس اجلاس میں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ ۱۰ نومبر ۱۹۶۴ء کو کنونشن بلایا جائے جس میں صدر اور جنرل سیکریٹری کا انتخاب ہو۔

کنونشن پروگرام کے مطابق منعقد ہوا۔ یوسف لغاری کنوینز اور جام ساقی جنرل سیکریٹری چن لیے گئے۔

جام ساقی کے والد، جوان سے ڈھیروں توقعات وابستہ کیے بیٹھے تھے، ۱۹۶۴ء کے اواخر میں جام سے ناراض ہو گئے۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا سائنس کے مضامین میں مہارت حاصل کرے لیکن سائنس کی طرف سے جام کی توجہ بالکل ہٹ گئی تھی۔ جام کے والد نے انہیں لکھا کہ یا تو سائنس پڑھو ورنہ گاؤں واپس آ جاؤ۔ جام اگر گاؤں واپس جاتے تو سیاسی کام نہ کر سکتے جوان کی نصابی کتب سے کہیں زیادہ اہم تھا۔ معاشی تنگ دستی کے باعث جام نے کام کی تلاش شروع کر دی۔ اسی اثنا میں کبھی اپنے دوست نجم الدین میمن کے گھر کھانا کھا لیتے اور کبھی محض پکوڑوں پر گزارا کر لیتے۔ بڑی جدوجہد کے بعد انہیں واپڈا کے مقامی دفتر میں کام مل گیا۔ یہ ملازمت زیادہ دن نہ چلی اور ساڑھے پانچ ماہ بعد انہیں فارغ کر دیا گیا۔ ملازمت کے دوران بھی وہ شام کے وقت یونیورسٹی یا ہوسٹل چل دیتے تا کہ طلباء سیاست کے کام کو جاری رکھ سکیں۔ یا پھر وہ ایوب خان کے خلاف فاطمہ جناح کی انتخابی مہم میں پہنچ جاتے۔ ان دنوں ملک کی تمام جمہوریت پسند قوتیں ایوب خان کے خلاف فاطمہ جناح کی حمایت کر رہی تھیں۔

ایوب خان نے دھونس اور دھاندلی سے انتخاب تو جیت لیا لیکن اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اسے عوام، خصوصاً مشرقی پاکستان اور کراچی کے عوام نے دھتکار دیا ہے۔ جنوری ۱۹۶۵ء میں فوجی آمر کے بیٹے گوہر ایوب کی سربراہی میں ہزارہ سے درجنوں ٹرک لالوکھیت کی سڑکوں پر سے گولیاں چلاتے گزرے۔ سڑک کے دونوں طرف متعدد لوگ مارے گئے۔ یہ پہلا واقعہ تھا جس نے کراچی میں پشتون مہاجر چپقلش کو جنم دیا۔ اس سانحہ پر فیض نے لکھا:

کہیں نہیں ہے، کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ

نہ مدعی، نہ شہادت، حساب پاک ہوا

یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہوا

جالب نے بھی اس سانحہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ حیدر آباد سٹوڈنٹس فیڈریشن اس سانحہ پر سراپا احتجاج تھی۔ جام ساقی نے اس کے خلاف احتجاجی پروگرام منظم کیے۔ فیڈریشن سیاسی طور پر بہت فعال تھی۔ جام اور ان کے ساتھی رنگ کے ڈبے اور برش اٹھائے راتوں کو حیدر آباد کی سڑکوں پر نکل جاتے اور دیواروں پر مختلف سیاسی نعرے لکھتے:

کشمیر کشمیریوں کا ہے

سیٹو، سنٹو نامنظور

اسلام پسند طلباء یونینیں جام اور ان کی فیڈریشن پر ''سرخے'' اور ''روس اور بھارت کے ایجنٹ'' کے الزامات لگاتیں۔ ان دنوں یہ الزامات اس قدر عام ہو گئے تھے کہ جام کے بقول ''ان کے معنی ہی ختم ہو گئے تھے۔''

انہی دنوں جام اور ان کے ساتھیوں کو دادا فیروز الدین منصور کا ۱۹۵۳ء کا لکھا ہوا ایک کتابچہ جو پاکستان میں قومی زبانوں کی صورت حال سے بحث کرتا تھا، ملا۔ اسے پڑھ کر وہ بے حد متاثر ہوئے۔ اس کتابچے کو بنیاد بنا کر جام نے اردو اور سندھی میں ایک نیا پمفلٹ لکھا، جسے سائیکلو سٹائل پر چھاپا گیا تھا۔ وسائل سے محروم سیاسی کارکنوں کا یہ مقبول طریقہ تھا۔ اس پمفلٹ میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ''بنگالی، بلوچی، سندھی، پشتو اور پنجابی ہماری قومی زبانیں ہیں۔ انہیں تسلیم کیا جائے اور سرکاری سطح پر رائج کیا جائے اور اردو کو سرکاری زبان کی بجائے رابطے کی زبان قرار دیا جائے۔'' خوش آئندہ بات یہ تھی کہ یہی پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی بھی پالیسی تھی۔ اس کتابچے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُسے یکم مئی کو جاری کیا گیا تھا۔

۱۹۶۶ء گزرا جا رہا تھا، گذشتہ چند مہینوں میں ایک زبردست سیاسی دھماکہ ہو چکا تھا۔ کشمیر کے چیمپئن اور ہندوستان سے ایک ہزار سال تک جنگ لڑنے کا دعویٰ کرنے والے ذوالفقار علی بھٹو تاشقند معاہدے سے اختلاف کی بنیاد پر کابینہ سے باہر آ چکے تھے اور پورے ملک کا دورہ کر کے عوام سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ انہی دنوں حیدر آباد سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ کنونشن کے لیے ہماری ایک میٹنگ ہوئی جس میں عنایت کاشمیری نے تجویز پیش کی کہ اس کنونشن میں بھٹو صاحب کو آنے کی دعوت دی جائے۔ تمام دوستوں... مہر حسین شاہ، مقصود علی شاہ، نثار عباسی، علی اکبر بروہی، غلام نبی

مغل اور دیگر نے اس تجویز کو پسند کیا۔ اس کے بعد مہر حسین شاہ اور جام ساقی بھٹو صاحب سے ملے۔ بھٹو صاحب نے اعتراض کیا کہ ایوب حکومت ان کی دشمن ہے، اس لیے وہ فیڈریشن اور اس کے کارکنوں کو بہت تنگ کرے گی۔ اس پر جام بولے کہ یہ ان کا اور حکومت کا معاملہ ہے۔ اس بات پر بھٹو بڑے خوش ہوئے اور گلہ کیا کہ پہلے کبھی آ کر کیوں نہیں ملے۔ جام نے دوٹوک جواب دیا کہ وہ ایوب خان کے وزیروں سے نہیں ملتے۔ اس وقت وہ ان کی موجودہ پوزیشن کی وجہ سے آئے ہیں۔

بھٹو، ایوب خان کی رگ رگ سے واقف تھے اور محسوس کرتے تھے کہ یہ نوجوان ایوب خان کا سامنا نہیں کر سکیں گے اور مکر جائیں گے۔ بھٹو کی یہ بات سن کر جام نے کہا:

''ہم لوگ مکرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ میں ایک سکول ماسٹر کا بیٹا ہوں اور ہمارا کنوینر یوسف لغاری ایک منشی کا بیٹا ہے۔ ہم نہیں ہیں مکرنے والے۔''

اس پر بھٹو صاحب نے ہمارے کنونشن میں آنے اور تقریر کرنے کی حامی بھر لی۔ انہوں نے کنونشن میں شرکت کے لیے ۱۳ دسمبر کی تاریخ دی۔ اب زور و شور سے کنونشن کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ جام ساقی لاڑکانہ میڈیکل کالج (LMC) میں اپنے دوست کامل راجپر سے جا کر ملے اور کہا کہ بھٹو صاحب کے استقبال کے لیے بسوں کی ضرورت ہے۔ اس نے حامی بھر لی۔ اب جام اور دیگر ساتھی جامعہ عربیہ کی انتظامیہ سے ملنے گئے تا کہ وہ اپنے میدان میں جلسہ کرنے کی اجازت دے دیں۔ انہیں بھٹو صاحب کے آنے کا یقین تو نہیں تھا لیکن انہوں نے جامعہ کے میدان میں جلسہ کرنے کی اجازت دے دی۔

۱۳ دسمبر کو کامل راجپر بسیں لے کر سٹیشن پر پہنچ گئے۔ وہیں استقبال کے دوران جام ساقی اور ان کے سیکڑوں ساتھی ون یونٹ کے خلاف نعرے لگا رہے تھے جس پر نہ صرف کامل راجپر بلکہ بھٹو صاحب نے بھی ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس پر جام نے ہنس کر کہا:

''کامل، وقت بڑا حرامی جانور ہوتا ہے تم ہمارے نعروں کی پروانہ کرو۔ تم محض ایک فرد کے پیچھے ہو اور ہم منزل کے مسافر ہیں۔''

اقتدار سے باہر ہونے کے بعد یہ بھٹو صاحب کا پہلا سیاسی جلسہ تھا۔ اس شام جیسے میلہ سا لگ گیا۔ سیکڑوں لڑکے لڑکیاں جمع ہو گئے تھے اس دور میں خان بہادر اور وڈیرے صاحبان ایوب

خان کے چمچے ہوا کرتے تھے۔ کنونشن کے انتظامات کے لیے ہم نے پیر غلام رسول شاہ، رئیس نجم الدین، سائیں محمد عرس اور دیگر سے چندہ جمع کیا تھا۔ ان کے علاوہ صرف میر صاحبان۔ میر غلام رسول تالپور اور میر علی احمد تالپور، بھٹو صاحب کے ساتھ کھڑے رہے۔ باقی تمام وڈیرے بھاگ کھڑے ہوئے۔

کنونشن میں تقریر کے دوران جام ساقی نے بھٹو صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ درباری بڈھوں کی جماعت مسلم لیگ کو چھوڑ کر اور ہمارے ساتھ مل کر ون یونٹ کی مخالفت اور جمہوریت کی حمایت میں آگے آئیں۔ بھٹو صاحب نے اپنی تقریر میں ہندوستان، اسرائیل، انڈونیشیاء میں نسل پرستی اور ایوب حکومت کے خلاف بات کی لیکن ون یونٹ کی مخالفت میں انہوں نے ایک لفظ تک نہ کہا۔

بھٹو صاحب کی ایوب مخالف سیاست میں آمد کی ایک اور روایت کے مطابق ان دنوں بھٹو صاحب سندھ میں سیاسی داخلے کے ٹکٹ کے لیے بے تاب تھے ایسے میں جام ساقی اور ان کی جماعت حیدرآباد سٹوڈنٹس فیڈریشن (موجودہ سندھ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن) ان کے لیے امید کی کرن کی صورت میں ابھرے۔ بھٹو صاحب نے مختلف ذریعوں سے جام ساقی سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ انہیں فیڈریشن کے سالانہ اجلاس کا مہمان خصوصی بنایا جائے۔ اس موقعہ پر جام ساقی کا جواب یہ تھا کہ یہ بات صحیح ہے کہ آپ ایوب خان کی مخالفت کر رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ آپ اعلان تاشقند کے مخالف اور ون یونٹ کے حامی ہیں جب کہ ہماری جماعت اعلان تاشقند کی حامی اور ون یونٹ کی مخالف ہے جہاں تک ایوب خان کی مخالفت کا تعلق ہے آپ اس کی ذات کے مخالف ہیں اور ہم اس کی سیاست کے۔'' جام ساقی کے اس جواب پر بھٹو صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ جلسے میں جمہوریت کی حمایت کریں گے۔ ون یونٹ اور اعلان تاشقند پر خاموش رہیں گے۔ حیدرآباد سٹوڈنٹس فیڈریشن کے لیے یہ جواب گو کہ ناکافی تھا لیکن میر رسول بخش تالپور کے اصرار پر بھٹو صاحب کو اپنے جلسے کا مہمان خصوصی بنانے پر راضی ہو گئے اور جلسے کے بعد میر رسول بخش تالپور صاحب کے گھر حیدرآباد میں بھٹو صاحب نے جام ساقی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، ''جام میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔'' اور بھٹو یہ احسان واقعی نہیں بھولے اور صدر پاکستان بنتے ہی سب سے پہلے جام ساقی کو گرفتار کیا۔ خیر اس گرفتاری کا تفصیلی ذکر آئندہ صفحات میں اپنی جگہ پر آئے گا۔

اس کامیاب جلسے کے بعد جام ساقی اور تنظیم کے دیگر رہنماؤں نے طلباء یونینوں کی حوصلہ افزائی کے لیے مختلف اضلاع کا دورہ کیا۔ انہی دنوں انٹر کالج باڈی کے انتخابات ہونے والے تھے۔ سندھ کے مختلف اضلاع میں سندھی طلباء کی اکثریت تھی جبکہ اردو بولنے والے طلباء کی تعداد خاصی کم تھی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ اس باڈی میں انہیں کم از کم ایک عہدہ ضرور دیا جائے ورنہ وہ اپنی الگ باڈی بنالیں گے۔ جام کو یہ مطالبہ معقول لگا۔ میر رفیق اور جام نے اپنے دوستوں کو یہ مطالبہ ماننے کے لیے بہت سمجھایا اور یہاں تک کہا کہ کوئی عام عہدہ ہی دے دیا جائے تاکہ طلباء اتحاد قائم رہے مگر جام کے دوستوں کو ان کی بات سمجھ نہ آئی اور اردو بولنے والے طلباء نے مہاجر انٹر کالج باڈی بنالی۔

یہ ۱۹۶۷ء کی بات ہے جب جام نے کل سندھ بنیادوں پر طلباء تنظیم قائم کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس مقصد کے لیے مختلف قافلے ان کے ساتھ آکر جڑتے گئے۔ ایک اہم جڑت ندیم اختر اور ان کے ساتھیوں کی تھی جو اپنے طور پر ایک تنظیم ''انجمن ترقی پسند طلباء'' بنانے نکلے تھے لیکن یہ دھارا جام کے ساتھ آکر مل گیا۔ حکایت ذرا طویل ہے لیکن لذیذ تر، اس لیے ندیم اختر کے لفظوں میں ہی بیان کرتے ہیں۔ اس میں ندیم اختر کی داستان بھی آجاتی ہے:

''یہ آج سے کوئی اکیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں حیدرآباد کے گورنمنٹ کالج میں زیر تعلیم تھا اور وہیں میری ملاقات ہدایت حسین سے ہوئی۔ ہم میں دو باتیں مشترک تھیں۔ پہلی تو یہ کہ ہدایت کے بڑے بھائی اور میرے والد دونوں پاکستان کی سول سروس میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور دوسری یہ کہ ہم دونوں بیوروکریسی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ ہم اسے سرمایہ دارانہ سماج کی ایک ایسی مشین سمجھتے تھے جو عوام اور انقلابی مزدور طبقے کو کچلنے اور استحصالی طبقوں کی پالیسیوں پر عمل درآمد کرنے کا کام سرانجام دیتی ہے۔ نظریے کی یہی ہم آہنگی ہماری دوستی کی بنیاد بنی۔

ایک دن ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ ایک طلبہ تنظیم بنائی جائے۔ اس تنظیم کا نام ہم نے ''انجمن ترقی پسند طلبہ'' رکھا۔ اس زمانے میں ''ترقی پسند'' کا مطلب کمیونسٹ ہوا کرتا تھا اور کمیونزم ایک بہت خطرناک چیز سمجھی جاتی تھی۔ حسن ناصر کی شہادت کے بعد پارٹی بدستور زیر زمین کام کر رہی تھی۔ ایوب خان کی آمریت اپنے پورے عروج پر تھی۔ سرکاری سطح پر صبح و شام امریکہ دوستی کے

ترانے گائے جاتے تھے اور اخبارات روس دشمنی اور کمیونسٹ مخالف پروپگنڈے کا جہازی سائز اشتہار محسوس ہوا کرتے تھے۔ ایسے ماحول میں طلبہ کی ایک ترقی پسند تنظیم بنا کر گویا ہم نے اپنے تئیں ایک بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ اپنی نئی تنظیم کا اعلان کرنے کے لیے جب ہمیں کوئی طریقہ نہیں سوجھا تو ہم نے ایک پوسٹر چھپوانے کا فیصلہ کیا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ پوسٹر چھاپنے کے لیے کوئی پریس تیار نہیں تھا۔ ایسے میں مولانا زاہد مرحوم کا 'زاہد پریس' ہمارے کام آیا۔ مولانا موصوف بڑے نجیب الطرفین شخص تھے آگے چل کر جب ان سے راہ ورسم بڑھی تو ان کی شخصیت کے بڑے عجیب پہلو سامنے آئے۔ وہ کمیونسٹوں کے کٹر دشمن تھے لیکن ان کا پریس اس وقت حیدرآباد کا وہ واحد پریس تھا جو کمیونسٹ اور حکومت مخالف پوسٹر، لیف لیٹ اور کتابچے وغیرہ شائع کرنے کی جرأت کرتا تھا۔ وہ بارہا حکومت کے عتاب کا شکار ہوئے۔ کئی مرتبہ ان کا پریس سیل ہوا۔ بالآخر اسے ضبط کرلیا گیا اور انہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔

جب ہم اپنی کوئی چیز چھپوانے لے جاتے تو وہ پہلے اسے خوب توجہ سے پڑھتے، پڑھنے کے بعد اسے اپنے مشین مین کے حوالے کر دیتے۔ چائے کا آرڈر دیتے اور پھر ہم سے اس مواد پر بحث شروع کر دیتے جسے انہوں نے چند لمحوں پہلے چھاپنے کے لیے اپنے مشین مین کو دیا تھا۔ بحث پہلے تو آپ، جناب، تک رہتی، آہستہ آہستہ اس میں تندی آتی چلی جاتی اور آخر میں باضابطہ جھگڑا شروع ہو جاتا۔ ان کا پریس پکے قلعے پر سڑک کے کنارے واقع تھا۔ وہ باہر میز رکھ کر اپنا دفتر کیا کرتے تھے۔ راہ گیر ہماری چیخ و پکار سے متوجہ ہو کر رک جاتے اور بحث سننی شروع کر دیتے۔ یہ کبھی کبھی کا معمول نہیں تھا۔ ہم جب بھی اپنی کوئی چیز چھپوانے لے جاتے تو یہی صورت حال پیش آیا کرتی تھی۔ اندر مشینوں کا شور اور باہر مولانا موصوف اور ہمارے درمیان لفظوں کی پُر شور جنگ۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ چھپائی کا بل ادا کرتے ہوئے پیسے کم پڑ جاتے۔ وہ فوراً ادھار پر رضامند ہو جاتے اور کہتے، ''کمیونسٹ ہوتے بہت خراب ہیں لیکن کمبخت بے ایمان نہیں ہوتے۔'' جواب میں ہم کوئی ایسی چبھتی ہوئی بات کہتے جو انہیں چراغ پا کر دیتی۔ ہم تو اپنی بات کہہ کر رفو چکر ہو جاتے لیکن ان کی آوازیں دیر تک ہمارا پیچھا کرتی رہتیں۔ حیدرآباد کی سڑکوں پر تمام رات ہم لئی کی بالٹی اٹھائے ''انجمن ترقی پسند طلبا'' کے پوسٹر چسپاں کرتے رہے۔ دوسرے دن ہم بڑے ذوق وشوق سے شہر

میں گھوم کر یہ جائزہ لیتے رہے کہ عوام خصوصاً نوجوان اس میں کتنی دلچسپی لے رہے ہیں۔ان دنوں کی صورتِ حال میں کسی پوسٹر میں انقلابی باتوں اور نعروں کا ہونا ایک غیر معمولی بات تھی۔ ہم جب لوگوں کو وہ پوسٹر پڑھتے ہوئے دیکھتے تو ایک عجیب سی خوشی ہوتی اور کچھ یوں لگتا جیسے ہم نے انقلاب کی طرف بڑا اہم قدم اٹھالیا ہے۔''

ندیم اختر کی کہانی کچھ زیادہ طولانی ہوگئی ہے اور جام ساقی کا ذکر ابھی تک ناپید ہے۔ دراصل یہ پوسٹر ہی تھا جو ان کی توجہ کا مرکز بنا اور وہ خود کھوج لگا کر ندیم اختر تک پہنچے۔کہانی کا یہ حصہ بھی خاصا دلچسپ ہے۔لیکن ندیم اختر کی زبانی ہی سنتے ہیں:

''میرے اور جام کے براہ راست تعلق کے حوالے سے یہ پوسٹر ایک خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ ہوا یہ کہ جام ساقی جو اس وقت ''حیدرآباد سٹوڈنٹس فیڈریشن'' نامی ترقی پسند طلبہ کی ایک تنظیم کے صدر ہوا کرتے تھے۔ ہمارے دیواری پوسٹر ان کی نظروں سے بھی گزرے۔ جام نے بعد میں مجھے بتایا کہ انہوں نے یہ پوسٹر پڑھ کر سوچا کہ حیدرآباد کے ایسے کون سے انقلابی نوجوان ہیں جنہیں میں نہیں جانتا، ہو نہ ہو ضرور یہ حال ہی میں کہیں باہر سے وارد ہوئے ہیں۔تو جناب جام نے ہماری تلاش شروع کردی۔

سرکاری جاسوسوں اور جام کا جنم جنم کا ساتھ ہے۔ وہ خوبی حاصل کرنے کا قائل ہے چاہے وہ جہاں سے آرہی ہو۔اپنا تعاقب کرنے والے سی۔آئی۔ڈی کے لوگوں سے اس نے لوگوں کو تلاش کرنے کا فن سیکھا ہے اگر وہ آپ کی تلاش میں ہے اور آپ اس دنیا سے ابھی تک کوچ نہیں کر چکے ہیں تو وہ آپ کو ضرور ڈھونڈ نکالے گا۔یہی کام اس نے ہمارے سلسلے میں کیا۔

ایک دن ہم نے معقول ڈیل ڈول والے نوجوان کو جو جھومنے کے انداز میں بڑی تیزی سے چل رہا تھا اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا۔

''کیا آپ ندیم اختر ہیں؟'' نہ سلام نہ دعا نہ خیریت نہ عافیت۔اس براہ راست سوال پر پہلے تو ہمیں بڑا غصہ آیا لیکن سوال کرنے والا اتنی موہنی صورت اور دلنواز شخصیت کا مالک تھا کہ ہمارا سارا غصہ آن کی آن میں ہوا ہوگیا۔

''جی ہاں۔'' ہم نے مختصر سا جواب دیا۔

''یار تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

'آپ جناب' سے فوراً 'یار' کی جانب قلابازی نے خوب لطف دیا۔ نظریاتی دوستیوں میں لفظ 'آپ' صرف نظری وابستگی معلوم کرنے کے لیے ادا کیا جاتا ہے۔ جیسے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ دونوں ہم نظریہ ہیں تو 'آپ' سے آپ اڑ جاتا ہے اور اس کی جگہ یار، بھائی، جانی اور کامریڈ جیسے، جذبوں سے چھلکتے ہوئے الفاظ لے لیتے ہیں۔

جام سے ''طویل یک طرفہ مذاکرات'' کے بعد جس میں وہ بلا تکان بولتا رہا اور ہم ہوں، ہاں، تو پھر یہ کیسے ہوگا؟ اور واقعی! قسم کے لفظوں سے جتاتے رہے کہ یہ 'مذاکرات' مکمل طور پر یک طرفہ نہیں ہیں۔ بات وہیں پہنچی جہاں جام اسے پہنچانا چاہتا تھا۔ اس نے ہمیں قائل کر لیا کہ اگر نظریاتی ہم آہنگی ہو تو مل کر ایک پارٹی اور ایک پلیٹ فارم پر کام کرنا چاہیے الگ الگ بٹ کر کام کرنے کی بجائے متحد ہو جانا چاہیے۔ تاکہ جدوجہد کو تیز کیا جا سکے۔ میں اور ہدایت حیدرآباد سٹوڈنٹس فیڈریشن میں شامل ہو گئے۔ یہیں سے ہمارا رابطہ پہلی مرتبہ مزدوروں، کسانوں اور سیاسی جماعتوں سے ہوا۔

زبردست تیاریوں کے بعد حیدرآباد کے ہوٹل انڈس میں ایک کنونشن کا انعقاد کیا گیا۔ صوبے کے تقریباً ہر شہر، تحصیل یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں سے طلبہ کے پرجوش وفود کنونشن میں شرکت کے لیے حیدرآباد آئے۔ ملک کے مختلف علاقوں سے کئی اہم ہم خیال شخصیتوں نے بطور مہمان اور ترقی پسند اور سامراج دشمن تنظیموں کے مرکزی عہدیداروں نے بطور مبصر اس کنونشن میں شرکت کی۔ کنونشن بڑا ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ بعض طلبہ لیڈروں نے جام ساقی کی مقبولیت، اس کی سیاسی پہل کاری اور تنظیمی صلاحیت کو اپنے لیے خطرہ سمجھا۔ سخت گھبراہٹ کے عالم میں انہوں نے کنونشن کو ناکام بنانے اور اسے ہائی جیک کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن باشعور طلبہ نے ان کی ہر چال کو ناکام بنا دیا۔ انقلابی نعروں اور پرجوش تالیوں کی گونج میں ''سندھ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن'' کے قیام کا اعلان ہوا۔ جام ساقی اس کے پہلے صدر، میں سنیئر نائب صدر اور میر تھیبو جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔

''کیا کہتے ہیں جام! اس کہانی کے بارے میں؟''

''ہاں ہم نے سندھ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن (SNSF) بنادی۔ میں اکیلا نہیں تھا، ان سارے ساتھیوں نے، حیدرآباد سٹوڈنٹس فیڈریشن کو سندھ این ایس ایف بنانے میں اپنا اپنا حصہ ڈالا۔'' جام نے لمبے چوڑے دعوے کیے بغیر آہستگی سے کہا۔

اس کے ساتھ ہی جام ساقی پر جیل کے دروازے کھل گئے۔ اہمیت کا یہ عالم تھا کہ ''خفیہ والے'' نوکروں چاکروں کی طرح ان کے آگے پیچھے پھرتے۔ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۶۹ء تک وہ ہر سال جیل میں گئے۔ ان پر ون یونٹ کے خلاف پمفلٹ بانٹنے اور جدوجہد کرنے کے الزامات تھے۔ ون یونٹ ۱۹۵۵ء میں مسلط کیا گیا تھا۔ اس کا ظاہری مقصد نام نہاد قومی یک جہتی تھی۔ لیکن خفیہ مقاصد کئی تھے۔ بنگالی اکثریت میں تھے، انہیں کٹ ٹو سائز کرنا ایک مقصد تھا یعنی مغربی پاکستان کا صوبہ بنا کر مشرقی پاکستان کو نام نہاد برابری (Parity) کی سطح پر لانا پھر مغربی حصے کے صدیوں پرانے صوبوں کی قومی اور تہذیبی شناخت کو کچلنا تھا۔ یہی نہیں، ان کے مادی وسائل کو بھی لوٹنا تھا۔ ون یونٹ کی خفیہ دستاویز پنجاب کے ایک مسلم لیگی سیاست دان میاں ممتاز خان دولتانہ نے لکھی تھی جس کے مطابق خیبر پختونخوا کی بجلی، سندھ کی زمینوں اور بلوچستان کی معدنیات کو پنجاب کے تصرف میں لانا تھا۔ یہ دستاویز اب خفیہ نہیں رہی اور آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت ان صوبوں کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان کے وسائل کو بھی لوٹ رہی تھی اور شیخ مجیب الرحمان کو اسلام آباد کی سڑکوں سے پٹ سن کی بو آتی تھی۔ طویل جدوجہد اور پورے پاکستان کے دباؤ ڈالنے پر یحییٰ خان کو ۲۸ نومبر ۱۹۶۹ء کو ون یونٹ توڑنے کا اعلان کرنا پڑا۔ جام ساقی ۷ جون ۱۹۶۴ء سے کمیونسٹ پارٹی کا حصہ تھے اس لیے ون یونٹ کے خلاف ان کی جدوجہد کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی کے عین مطابق تھی۔

۱۹۶۷ء کے دوران جدوجہد کا بھی رنگ بدلا۔ ۴ مارچ کی طلباء تحریک سندھ کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ سندھ یونیورسٹی جامشورو کے وائس چانسلر کو غیر قانونی طور پر ہٹا دیا گیا تو طلباء کی احتجاجی مہم شروع ہوگئی۔ طلباء پر قابو پانے کے لیے کمشنر مسرور حسن نے طلباء پر بے پناہ تشدد کیا۔ ظاہر ہے پورے سندھ میں آگ لگ گئی۔ درجنوں دیگر رہنماؤں کی طرح جام ساقی کو بھی گرفتار کر لیا گیا کیوں کہ حیدرآباد سٹوڈنٹس فیڈریشن پوری طرح متحرک اور فعال تھی۔ جام ساقی نے موقع

سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو ون یونٹ مخالف تحریک میں بدل دیا۔ جام کی گرفتاری کی کہانی بھی کافی دلچسپ ہے۔ان کی اپنی زبانی سنتے ہیں:

''۵ مارچ کو میں ایک ہوٹل میں چائے پی رہا تھا کہ ایک صوبیدار میرے پاس آیا اور بولا،''چلوتمہیں ایس پی صاحب بلا رہے ہیں۔'' میں سمجھ گیا کہ مجھے گرفتار کرنے آ گئے ہیں۔ ظاہر ہے، رشتہ کرنے کے لیے تو نہیں بلایا ہوگا۔ میں ہوٹل کا بل ادا کر کے اس کے ساتھ چل پڑا۔ ہم ایس پی آفس پہنچے۔تو وہاں پہلے سے ایک نوجوان موجود تھا۔ اس نے پوچھا،''آپ کون ہیں؟'' یہ سوچ کر کہ یہ خفیہ کا کوئی آدمی ہے۔ میں خاموش رہا۔اس طرح کے لوگ اکثر طلباء تنظیموں میں کام کرتے ہیں۔تھوڑی دیر بعد ڈی ایس پی اندر آیا اور پوچھنے لگا،''تم کون ہو، کس کے بیٹے ہو۔'' اور میرا جواب لکھنے لگا۔ پھر اس نے ویسے ہی سوال دوسرے لڑکے سے بھی کیے اور انہیں بھی نوٹ کرنے لگا۔ ڈی ایس پی کے جانے پر میں نے اس سے پوچھا،تم بھی گرفتار ہو کر آئے ہو؟ بولا،''ہاں۔'' اب مجھے اپنے آپ پر شرمندگی محسوس ہوئی اور میں فوراً بول پڑا،''معاف کرنا دوست، میں تمہیں سی آئی ڈی کا آدمی سمجھا تھا۔'' پھر میں نے بے تکلفی سے کہا،''یار سگریٹ نکالو'' اور ہم سگریٹ پینے لگے۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ میری جیب میں ایک سائکلو سٹائل پمفلٹ موجود ہے۔ میں اپنی کرسی گھسیٹ کر کچرے کی ٹوکری کے نزدیک ہو گیا۔ میں وہ پمفلٹ ٹکڑے کرتا اور اس ٹوکری میں پھینکتا گیا۔ پھر خیال آیا کہ اگر یہ ٹکڑے بھی ان لوگوں کے ہاتھ لگ گئے تو وہ اسے جوڑ کر پڑھ لیں گے۔ میں نے یوسف تالپور سے سگریٹ لی اور اسے جلانے کے بہانے جلتی تیلی اس ٹوکری میں پھینک دی۔ آگ لگتے ہی میں کرسی کھسکا کر آگ بجھانے کا دکھاوا کرنے لگا۔ جلد ہی وہ کاغذ جل کر راکھ ہو گیا۔ یوسف نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔ اس چھوٹی سی کامیابی پر میں بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گیا۔''

۵ مارچ کو جام ساقی گرفتار کر لیے گئے۔ ۴ مارچ کو کمشنر مسرور حسن کو یونیورسٹی کے معاملات میں مداخلت اور وائس چانسلر کو جبراً ہٹانے کے ردِعمل میں ۱۰۰۰ طلباء نے یونیورسٹی سے جلوس نکالا۔ جلوس کو حیدرآباد سٹوڈنٹس فیڈریشن نے منظم کیا تھا۔ پولیس نے طلباء کے خلاف وحشیانہ تشدد کیا۔ ۲۰۷ طلباء کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۴ مارچ کی تحریک کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ایک طرف اس میں قوم پرستی کا دھارا تھا اور ون یونٹ کے خلاف زبردست جذبات کا اظہار بھی تھا۔ اس

میں طلبا کے ساتھ ساتھ مزدور، کسان اور سماج کے دیگر طبقات بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس اعتبار سے اس تحریک کا دائرہ بے حد وسیع تھا۔ اور یہ پھیلتے پھیلتے ایوب خان کے خلاف ایک زبردست تحریک میں بدل گئی تھی۔ لال خان نے اپنی ایک کتاب میں جام ساقی کے حوالے سے اس تحریک کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جام ساقی، لال خان کو بتاتے ہیں:

''۴ مارچ ۱۹۶۷ء کو مزدوروں، کسانوں، طالب علموں اور سماج کے دوسرے کچلے ہوئے طبقات نے سندھ میں ایک تحریک شروع کی۔ اس تحریک کے مطالبات و مقاصد میں آمریت کا خاتمہ اور سماج میں سوشلسٹ معاشی اور سماجی تبدیلیاں لانا تھا۔ کامریڈ جام ساقی نے ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے بتایا جب تحریک شروع ہوئی تو میں ایک طالب علم لیڈر تھا۔ ہم مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں کا دورہ کر کے طالب علموں اور نوجوانوں کو تحریک میں شمولیت کے لیے آمادہ کرتے۔ صورتِ حال یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ صرف اخبار میں پریس ریلیز لگنے سے ہی طالب علم اور مزدور ہڑتال کر دیا کرتے تھے۔ جب تحریک شروع ہوئی تو میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی صوبہ سندھ کی کمیٹی کا سیکریٹری تھا۔ پارٹی کی مرکزی قیادت نے طلباء، مزدور کسان رابطہ کمیٹی قائم کی تھی تاکہ ایک دوسرے کے کام کو جدوجہد کے مرحلہ میں باہم جوڑا اور مربوط کیا جائے۔ سندھ ہاری کمیٹی جسے حیدر بخش جتوئی نے قائم کیا تھا، ان کی بھرپور حمایت کر رہی تھی۔ بھٹو بھی سیاست میں متحرک تھا۔ لیکن تحریک کے شروع ہونے تک وہ اتنا مقبول نہیں تھا۔ تحریک نے اسے مقبولیت دی کیوں کہ وہ سوشلزم کا نعرہ بلند کر رہا تھا۔ جس کے نتیجے میں عوام کا انقلابی ابھار بھٹو کو متاثر کرتے ہوئے اسے زیادہ سے زیادہ اور روز بہ روز بائیں بازو کی طرف کھینچتا چلا جا رہا تھا۔ جام کے الفاظ میں تحریک کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ پولیس اور فوج کو کسی بھی غریب اور مجبور شخص کے ساتھ بدتمیزی کرنے کی جرأت نہیں تھی جو اس سے پہلے روزمرہ کا معمول ہوتی تھی۔ جام نے بتایا کہ پاکستان ریلوے کے مزدوروں کی ٹریڈ یونین سب سے بڑی اور مؤثر ترین یونین تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۹۶۷ء کی ریلوے مزدوروں کی ہڑتال ان بڑے واقعات میں سے ہے جو اسے ابھی تک زبانی یاد ہیں۔ یہ ایک بہت ہی مشہور ہڑتال تھی، دوسری بڑی مؤثر ٹریڈ یونین واپڈا کے مزدوروں کی تھی ان دونوں یونینوں نے دیگر چھوٹی یونینوں کے ساتھ مل کر سرمایہ دارانہ نظام اور ریاست کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایک واقعہ کا ذکر

کرتے ہوئے جام نے بتایا کہ پاکستان ریلوے کے مزدور جب ہڑتال پر تھے تو انتظامیہ نے ہڑتال توڑنے کے لیے ٹرینوں کو زبردستی چلانے کی کوشش کی۔ روہڑی ریلوے سٹیشن پر ریلوے کے مزدور ریل کی پٹڑی پر لیٹ گئے اور ریلوے ٹریفک کو بلاک کر دیا۔ یہ اس تحریک کے جوش جذبے اور جرأت کی ایک زندہ مثال ہے۔ اس وقت واپڈا اور ریلوے کے مزدوروں کی حمایت کا رخ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی طرف تھا۔''

پہلی جیل، جام کو اتنی خراب نہیں لگی جتنی ان کے تصور میں تھی۔ جام کے بعد کے جیل تجربات کے مقابلے یہاں صورتِ حال اتنی بُری نہ تھی۔ پھر ان کا قیام بھی زیادہ طویل نہ تھا۔ جونہی ان کی گرفتاری عمل میں آئی باقی طلباء ان کی رہائی کے مطالبے لیے سڑکوں پر نکل آئے۔ اگلے روز کسان اور مزدور بھی ان جلوسوں اور مظاہروں کا حصہ بن گئے۔ دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی جس کو مظاہرین خاطر میں لائے بغیر سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ اس دفعہ کے مطابق ۴ سے زائد افراد کسی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ قانون کی خلاف ورزی پر انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا لیکن یہ اقدامات حکومت کے خلاف ۱۹۶۸ء کی عظیم بغاوت کا راستہ ہموار کر رہے تھے۔ بہر حال جام پندرہ بیس روز سے زیادہ جیل میں نہیں رہے اور انہیں بغیر مقدمہ چلائے رہا کر دیا گیا، جام ۶۹۔۱۹۶۸ء کے دوران بھی بار بار جیل میں گئے۔

جام کی یادیں بیان کرتے ہوئے ندیم اختر جیل کے قیام کی وہ یادیں بیان کرتے ہیں جو نہ صرف ان کی استقامت بلکہ اس دور کے دیگر سیاسی کارکنوں کے کردار پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔

''مجھے آج بھی وہ دن یاد ہیں جب میں اور جام اپنے بہت سے رفیقوں کے ساتھ حیدر آباد کی سینٹرل جیل میں قید تھے۔ یہ ایوبی آمریت کے آخری سال تھے۔ پاکستان کے عوام اور کچلی ہوئی قومیتوں کے قومی جمہوری حقوق اور ملک کو سامراجی لوٹ کھسوٹ سے آزاد کرانے کی جدوجہد کے ''وطن دشمن جرم'' کی پاداش میں ہمیں گرفتار کر کے پس زنداں ڈال دیا گیا۔

ہمیں چار کمروں والی ایک بیرک میں رکھا گیا تھا۔ یہ وہی بیرک تھی، جن میں نام نہاد پنڈی سازش کیس، کے سلسلے میں سجاد ظہیر، فیض احمد فیض اور دیگر لوگوں کو نظر بند رکھ کر مقدمہ چلایا گیا تھا۔ ایک کمرے میں جام، میر تھیبو، سید باقر علی شاہ عنایت اور میں تھا اور دوسرے ملحقہ کمروں میں

کامریڈ غلام محمد لغاری، رسول بخش پلیجو، یوسف تالپور، مسعود نورانی، لالہ عبدالقادر، اقبال ترین اور دیگر کئی لوگ نظر بند تھے۔

ان دنوں رسول بخش پلیجو صاحب ادیب اور نقاد کی حیثیت سے زیادہ اور ایک سیاسی رہنما کے طور پر کم جانے جاتے تھے۔ وہ ماؤزے تنگ سے بے حد متاثر تھے اور بڑی شدومد سے پیکنگ کی پالیسیوں کی حمایت میں دلائل دیا کرتے تھے۔ ان دنوں ان کے نزدیک کسی موضوع پر بحث ایک جنگ کی طرح ہوتی تھی۔ جس طرح جنگ میں ہر حربہ جائز ہوتا ہے اسی طرح وہ بحث جیتنے کے لیے ہر طریقہ آزماتے تھے۔ جس شخص سے انہیں خطرہ ہوتا تھا کہ وہ بحث میں ان پر بھاری پڑ سکتا ہے اس پر وہ صبح، شام، اٹھتے بیٹھتے طنز کرتے، مضحکہ اڑاتے اور ایسی زوردار چوٹیں کرتے کہ آس پاس موجود لوگ خوب محظوظ ہوتے۔ نفسیاتی دباؤ کا یہ عمل متعلقہ شخص کے اعصاب کے ٹوٹ جانے تک جاری رہتا۔ اس کے بعد وہ کسی موزوں وقت اسے سنجیدہ بحث میں گھیر کر فوراً چت کر دیا کرتے تھے۔
یہی گُر وہ جام پر آزمانے کی کوشش کیا کرتے تھے لیکن جام پر ایسی باتوں کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔ جام پیٹی بورژوا طبقے کا کوئی ایسا نوجوان نہیں تھا جو مختلف کمپلیکسوں کا شکار ہوتا ہے۔ جس کی انا بات بے بات مجروح ہوتی رہتی ہے یا وہ لوگوں کے ہنسنے یا مذاق اڑائے جانے کو اپنی بے عزتی تصور کرتا ہے۔ جام طبقاتی طور پر محنت کش طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ قحط زدہ تھر کے ایک غریب اور مفلوک الحال پرائمری سکول کے ٹیچر کا بیٹا! معمولی کپڑے کی شلوار قمیض اور پھٹی پرانی ہوائی چپل پہن کر اور اپنے محنت کش ہونے پر فخر کرنے والا جام ساقی شہر کے مڈل کلاسیوں کی عجیب وغریب حرکتوں پر ناراض ہونے کی بجائے اپنے مخصوص انداز میں قہقہے لگایا کرتا تھا۔ وہ ایک مارکسٹ ہے، ایک سماجی سائنسدان (Social Scientist) اس لیے ہر رویے کا تجزیہ کر کے اصل اسباب کا سراغ لگا لیتا ہے۔

جیل کے ساتھیوں میں آج ہمیں سید باقر علی شاہ مرحوم اکثر بہت یاد آتے ہیں۔ وہ ان دنوں سندھ نیپ کے جنرل سیکریٹری ہوا کرتے تھے۔ آج وہ اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن کتنی ان گنت یادیں اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ شاہ صاحب خیر پور میرس کے سید خانوادے کے فرد، انگلینڈ کے فارغ التحصیل، نظریاتی طور پر ایک سچے کمیونسٹ اور انتہائی نفیس و دلپذیر شخصیت کے مالک تھے۔ سب

سے محبت کرنے والے اور ہم سے تو بے انتہا محبت کرنے والے۔ جب ہم کبھی اداس ہوتے تو وہ اپنی خوبصورت لے میں ہمیں انقلابی گیت سناتے۔ کبھی ہمیں کوئی کامیابی ہوتی تو خوب ترنگ میں آجاتے۔ ہم کہتے ''کامریڈ رقص ہو جائے۔'' تو ان کا گورا چٹا خوبصورت چہرہ خوشی سے اور دمک اٹھتا۔ وہ پہلے تو آنا کانی کرتے لیکن اس وقت رقص کرنے کو تو ان کا بھی دل چاہتا تھا۔ ہم ذرا سا اور اصرار کرتے تو وہ مان جاتے۔ اتنی مہارت سے رقص کرتے تھے کہ دیکھنے والے مبہوت ہو کر رہ جاتے۔ واقعی کسی نے ٹھیک کہا ہے رقص اور موسیقی فن کا نہیں جذبوں کا نام ہے۔ ڈسٹرکٹ کونسل حیدرآباد کی عمارت میں پہلی منزل پر ان کا آفس ہوا کرتا تھا۔ پیشے کے اعتبار سے بیرسٹر تھے لیکن ہم نے ان کے دفتر میں موکل شاید ہی کبھی دیکھے ہوں۔ ان کا آفس دفتر کم اور مسافر خانہ زیادہ تھا۔ لیکن اس مسافر خانے میں ہر مسافر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ ٹھہرنے والے مسافر کے لیے ضروری تھا کہ وہ تاریخ کے ارتقائی سفر کا مسافر ہو۔

کامریڈ باقر اپنے پیچھے رونے والے کم اور فخر کرنے والے زیادہ چھوڑ گئے ہیں۔ ان کی زندگی عالیشان بنگلوں میں بیٹھ کر انقلاب کی باتیں کرنے والوں اوران لوگوں کے لیے ایک مثال ہے جن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی کہ خود کو کس طرح ڈی کلاس کر کے پرولتاریہ کے ساتھ جوڑا جاسکتا ہے۔

سب کہاں، کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

حیدرآباد جیل سے ہمیں کراچی منتقل کر دیا گیا۔ وہاں شیخ ایاز اور جی ایم سید صاحبان بھی نظر بند تھے۔ سیاسی تحریکوں کے دوران جیل خانے، سیاسی کارکنوں کے لیے نظریاتی سکول بن جاتے ہیں جہاں بحث مباحثے ہوتے ہیں۔ گروپ سٹڈی ہوتی ہے اور نظریاتی مخالفین سے زور دار مناظرے ہوتے ہیں۔ جام ایسے موقعوں پر ایک بہترین استاد، عالم اور مقرر کا روپ دھار لیتا ہے۔ جیل سے باہر حکومت اس سے ڈرتی ہے تو جیل کے اندر اس کے سیاسی مخالفین اس سے گھبراتے ہیں۔ دوستوں اور کارکنوں کی کچہری لگانے میں جام کا کوئی ثانی نہیں۔ ہلکے پھلکے پُر لطف پیرائے میں وہ بڑی کمال کی باتیں کہہ جاتا ہے۔ اس کی کہانی ہو، تقریر ہو یا نظمیں ہوں، الفاظ سیدھے دل میں

اُترتے چلے جاتے ہیں۔''

اس دور میں جام ساقی کو سچائی کے راستے سے ہٹانے کے لیے، انسے بار بار خریدنے کی کوشش بھی کی گئی۔ ۱۹۶۸ء میں جب میر تھیبو گرفتار ہوئے تو جام نے ان کی ضمانت پر رہائی کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں جام اس وقت کے ڈپٹی کمشنر عثمان علی عیسانی سے جا ملے۔ عیسانی جام کو ملنے کے لیے پہلے کئی بار پیغام بھیج چکے تھے۔ جسے جام نے ہر بار نظر انداز کر دیا تھا۔ اب ضرورت پڑ جانے پر خود گئے، غالباً ان کے ساتھ یوسف تالپور بھی تھے۔ ڈپٹی کمشنر ان سے بہت اچھی طرح سے ملے اور کہا کہ میر تھیبو کو آج ہی رہا کر دیا جائے گا۔ پھر انہوں نے جام سے اکیلے میں بات کرنے کی خواہش کی تو یوسف تالپر باہر چلے گئے۔ جب جام اکیلے رہ گئے تو عیسانی صاحب کہنے لگے، ''اگر تمہیں کلاس ون کی نوکری چاہیے تو حکومت تیار ہے اور اگر تم سی ایس ایس کا صرف امتحان دے دو تو حکومت تمہیں پاس کر کے ڈپٹی کمشنر لگا دے گی۔ اس طرح بھی تو تم عوام کی خدمت کر سکتے ہو۔''

جام بولے: ''سائیں! میں کس سے کہوں گا کہ کرسی پر بیٹھ کر عوام کی خدمت کرنی ہے۔''

جام کے انکار پر ڈپٹی کمشنر صاحب بالکل پگھل گئے اور بولے، ''آف دی ڈیوٹی۔ مجھے فخر ہے کہ میری قوم میں ایسے نوجوان بھی ہیں، جو ڈپٹی کمشنر کی پیشکش کو بھی ٹھکرا سکتے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی۔ اس کے بعد وہ جب بھی جام ساقی سے ملے۔ انہیں اپنے بچوں کی طرح محبت اور عزت دیتے رہے۔

ایک اور آفر کا بھی ذکر کرتے چلیں۔ انہی دنوں، سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر محمد صالح قریشی نے انہیں بلایا اور کہا کہ: ''اگر ڈھاکہ یا پشاور یونیورسٹی داخلہ لینے پر رضامند ہو جاؤ تو حکومت تمہیں ۱۰ ہزار روپیہ ہر مہینے دینے کے لیے تیار ہے'' جام نے اس پیشکش کو بھی دھتکار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر پینے لگے۔ اس پر وائس چانسلر نے ناراض ہو کر کہا، ''یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تم ایک طالب علم ہو اور ایک استاد کے سامنے بیٹھے ہو۔''

جام جو ان دنوں، اپنے استاد، تو اپنے استاد، کسی دوسرے کے استاد کے سامنے بھی سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ یہ استاد، شاگرد کے رشتے کا تقدس تھا۔ بولے:

''قریشی صاحب، آپ نے استاد اور شاگرد کا رشتہ خود ہی توڑ دیا۔ اب آپ ایک دکان دار ہیں اور میں آپ کا ایک گاہک۔ اب میں سگریٹ پیوں یا کچھ بھی کروں، آپ کو اس سے سروکار نہیں ہونا چاہیے۔''

جب جام وہاں سے نکل کر چلے گئے تو وائس چانسلر جام کے ڈیپارٹمنٹ جا پہنچے اور بولے: ''جام ساقی کو ہم نے ۱۰ ہزار ماہانہ کی سکالرشپ دینا چاہی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ایسا لگتا ہے اسے کسی دوسری جگہ سے، اس سے بھی زیادہ پیسے ملتے ہیں۔''

ابھی وائس چانسلر کی بات پوری بھی نہ ہوئی کہ جام کے کلاس فیلوز نے ''وی سی مردہ باد'' کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

پیشکشوں کو ٹھکرانے کے بعد، وہ ایم اے نہ کر سکے اور ان کا تعلیمی سلسلہ انقلابی سیاست کی نذر ہو گیا۔ اس کے کئی سال بعد ۱۹۸۵ء میں جام نے حیدرآباد جیل سے پولیٹکل سائنس میں ایم اے کیا۔

باب 2

جام ساقی اور طلبا تحریک

۳ مارچ ۱۹۶۸ء کو جام ساقی نے شادی کر لی۔ سکھاں ان کی بیوی ہی نہیں، کامریڈ بھی تھیں۔ جام سے سکھاں کی محبت کا یہ عالم تھا کہ جب ۱۹۷۸ء میں جام گرفتار ہوئے اور انہیں مار دیئے جانے کی افواہیں پھیلیں تو سکھاں نے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر اپنی جان دے دی۔ اس کے گہرے تعلق کے باوجود شادی نے جام کی سیاسی سرگرمیوں کو متاثر نہیں کیا۔ اس کے ایجنڈے پر سب سے اہم کام طلباء تحریک کو منظم کرنا اور آگے بڑھانا تھا۔

سندھ این ایس ایف کے قیام کی تفصیلی داستان ہم گذشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ ۳ نومبر ۱۹۶۸ء کا یہ تاریخی واقعہ آگے چل کر ایوب مخالف تحریک میں ایک تاریخ ساز کردار ادا کرنے والا تھا۔ اس تحریک میں طلباء کے علاوہ مزدور، کسان، وکلا اور عام شہری شریک تھے جن میں سے اکثریت سوشلسٹ رجحان رکھنے والے کارکنوں کی تھی۔ واقعات کے مطابق ۷ نومبر ۱۹۶۸ء کو راولپنڈی میں پولی ٹیکنیک کے سترہ سالہ طالب علم عبدالحمید کی شہادت نے پورے ملک کی طلباء برادری میں آگ لگا دی۔ اس سے تین ماہ قبل اگست ۱۹۶۸ء میں حکومت نام نہاد ترقی اور اصلاحات کا عشرہ منانے میں مصروف ہوگئی۔ حیدرآباد سٹوڈنٹس فیڈریشن نے فوری ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا کہ اصلاحات کب اور کہاں ہوئیں؟ عوام کی زندگی میں کون سی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ فوجی آمریت اور ون یونٹ کی لعنت بدستور ملک پر مسلط ہے۔ فیڈریشن نے انقلابی اصلاحات کے ڈھونگ کو بے نقاب کرتے ہوئے کہا کہ ملک کے ذرائع پیداوار پر سامراج کے

پروردہ اجارہ دار سرمایہ کاروں اور نئے پرانے جاگیرداروں کی گرفت اسی طرح مضبوط ہے۔ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کراچی بھی اس جنگ میں کود پڑی۔ اس نے جشن اصلاحات کے مقابلے میں ''ہفتہءمطالبات'' اور ''ہفتہءتعلیم'' منانے کا اعلان کر دیا۔ ہفت روزہ ''لیل ونہار'' ۲ تا ۸ نومبر کی اشاعت کے مطابق ۷ اکتوبر ۶۸ء کو طلباء نے ہفتہءمطالبات کا آغاز کر دیا۔ ''محنت کش عوام کے جذبات جو اندر ہی اندر گھٹ رہے تھے۔ راستہ پا کر اُبل پڑے۔ عوام نے طلباء کا ساتھ دیا۔ اس تحریک کو کچلنے کے لیے انتظامیہ پوری طرح حرکت میں آ گئی، ۱۳ اور ۱۴ اکتوبر کر پولیس نے نہتے طلبا اور عوام کے جلوس پر اندھا دھند لاٹھیاں برسائیں اور آنسو گیس چھوڑی۔

۷ نومبر ۱۹۶۸ء کو راولپنڈی میں گورڈن کالج کے تقریباً ۲ ہزار طلباء نے کسٹم کے افسروں کے خلاف ایک احتجاجی جلوس نکالا۔ کسٹم نے غیر قانونی طور پر طلبا کا سامان ضبط کر لیا تھا اور احتجاج کرنے پر ان کے ساتھ انتہائی متشدد سلوک کیا گیا۔ طلبا کا احتجاجی جلوس پشاور روڈ پر پہنچا تو پولیس نے کسی اشتعال کے بغیر انہیں منتشر کرنے کے لیے لاٹھی چارج اور فائرنگ کر دی جس سے ایک نوجوان طالب علم عبدالحمید شہید ہو گیا۔ اس اندوہناک واقعہ سے طلبا میں سخت اشتعال پھیل گیا۔ اور انہوں نے تین سرکاری بسیں نذرِ آتش کر دیں۔ اس ہنگامے میں ۴ پولیس والے بھی شدید طور پر زخمی ہوئے۔ دوسرے دن پنڈی کے تمام سکول اور کالج غیر معینہ مدت کے لیے بند کر دیئے گئے۔

راولپنڈی کے اس واقعہ نے جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا۔ ایوب شاہی، سامراج کے گماشتوں اور نوکر شاہی کے خلاف انتقام کی آگ پوری شدت سے پھیل گئی۔ ملک کے طول وعرض میں طلبا کے احتجاجی مظاہروں کا ایک تانتا سا بندھ گیا۔ عوام کی دلی ہمدردیاں طلبا کے ساتھ تھیں، ملک کے کسی شہر میں طلبا کا جلوس نکلتا تو مزدور اور عام شہریوں کی بھاری تعداد اس میں شرکت کرتی اس طرح طلبا کی جدوجہد بتدریج عوامی جدوجہد کا رنگ پکڑتی چلی گئی۔

۸ نومبر کو کراچی میں تقریباً ساٹھ افراد گرفتار کر لیے گئے جن میں طالب علم اور مزدور رہنما بھی شامل تھے۔ مشتعل ہجوم نے بسیں اور کاریں جلا دیں۔ ۸ نومبر سے ہی کراچی اور حیدر آباد کے تمام سکولوں اور کالجوں کو غیر معینہ مدت کے لیے بند کر دیا گیا۔ اُدھر راولپنڈی کے واقعات سنگین صورت اختیار کر گئے تھے۔ شہری پولیس عوامی جذبات کے کچلنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ لہٰذا راولپنڈی کو

فوج کے سپرد کر کے کرفیو نافذ کر دیا گیا۔

لاہور، پشاور، ڈھاکہ، چٹا گانگ اور پاکستان کے دیگر کئی شہروں میں طلباء سڑکوں پر نکل آئے۔لیل و نہار کی اسی اشاعت کے مطابق:

''لاہور میں طلباء اور پولیس کے درمیان جگہ جگہ جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ کسٹم ویگن اور دوسرکاری بسیں جلا دی گئیں۔ مشتعل ہجوم نے کمرشل بینک، نیشنل بینک، ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن اور سینٹرل پوسٹ آفس کی عمارتوں پر حملہ کر کے نقصان پہنچایا۔اس کے جواب میں بڑے پیمانے پر گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔لاہور کے تمام سکول اور کالج بند کر دیئے گئے۔

۹ نومبر کو راولپنڈی کے کرفیو میں مزید توسیع کر دی گئی۔اس کے باوجود طلبا نے جلوس نکالا۔ پولیس نے ایک بار پھر سنگ دلانہ اقدام کا مظاہرہ کرتے ہوئے فائرنگ کی جس سے دو افراد ہلاک ہو گئے۔اس کے جواب میں مشتعل ہجوم نے ۱۳ گاڑیاں اور بعض نجی املاک جلا دیں۔ لاہور میں ریلوے سٹیشن کو نقصان پہنچایا گیا۔ایک بس جلا دی گئی۔اور بعض شاہراہوں کے ٹریفک سگنل توڑ دیئے گئے،طلبہ کی تحریک کے جواب میں پشاور اور لائل پور کے سکولوں اور کالجوں کو بھی بند کر دیا گیا۔

۱۰ نومبر کو پشاور میں پولیس فائرنگ سے ۲ افراد ہلاک ہوئے نوشہرہ کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ چارسدہ میں شکر کے کارخانے کے مزدوروں پر فائرنگ کی گئی جس سے ایک آدمی ہلاک ہو گیا۔

۱۳ نومبر کو پیپلز پارٹی کے رہنما ذوالفقار علی بھٹو اور نیپ کے لیڈر ولی خان اور گیارہ دوسرے لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ان گرفتاریوں سے حالات مزید بگڑ گئے۔۱۳ نومبر سے لے کر ۳۰ نومبر تک کراچی، حیدرآباد، لاہور، راولپنڈی، ملتان، سرگودھا، لائل پور، پشاور، چارسدہ اور دوسرے شہروں میں سیاسی پارٹیوں اور عوام کے مختلف طبقات کی جانب سے احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ جاری رہا۔ ایوب حکومت کی مشینری عوامی ابھار کو دبانے کے لیے اپنے پورے وسائل اور طاقت استعمال کرتی رہی۔جگہ جگہ کرفیو نافذ کیا گیا۔ وسیع پیمانے پر گرفتاریاں کی گئیں۔لاٹھی چارج آنسو گیس اور فائرنگ روز کا معمول بن گیا۔

حالات پر جام ساقی اوران کے ساتھی گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ ۳ نومبر ۱۹۶۸ء کوانہوں نے سندھ این ایس ایف کی داغ بیل ڈال دی، جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں بیان کی جا چکی ہے۔ جام ساقی کہتے ہیں کہ ۶۹ ـ ۱۹۶۸ء کی ایوب مخالف تحریک پر سوشلسٹ نظریے کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ۱۳ نومبر کو ذوالفقار علی بھٹو بھی میدان میں نکل آئے۔ ان کی اور بائیں بازو کے دیگر رہنماؤں کی گرفتاری نے عوامی جدوجہد میں مزید تیزی پیدا کر دی۔ دسمبر ۱۹۶۸ء کا مہینہ خون آشام ثابت ہوا۔

یکم دسمبر کو پشاور میں تقریباً ۱۵۰ افراد کو گرفتار کرلیا گیا۔ مغربی پاکستان کے کئی شہروں میں وکلاء نے ایوب حکومت کے خلاف مظاہرہ کیا۔ راولپنڈی کے حالات دوبارہ خراب ہو گئے۔ لہٰذا کنٹونمنٹ کے علاقے کو فوج کے سپرد کر دیا گیا۔ لاہور ساہیوال اور راولپنڈی میں بے شمار گرفتاریں ہوئیں۔

''لیل ونہار'' مزید رقمطراز ہے کہ ۸ دسمبر کو مشرقی پاکستان میں طلباء نے ایوب کے آمرانہ نظام اور پولیس کے تشدد کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا پولیس نے حالات کو قابو سے باہر دیکھ کر فائرنگ کی جس سے دو افراد ہلاک اور بے شمار زخمی ہو گئے۔ بپھرے ہوئے ہجوم نے بہت سی سرکاری گاڑیوں کو جلا دیا۔ تقریباً ۱۲۸ افراد گرفتار کر لیے گئے۔

۱۳ دسمبر کو چٹا گانگ میں ایک مشتعل ہجوم پر پولیس نے فائرنگ کی جس سے بارہ افراد ہلاک ہو گئے اس طرح مشرقی پاکستان میں پولیس نے اپنے سنگدلانہ اقدام کو نقطہ عروج پر پہنچا دیا۔

۱۹ اور ۲۰ جنوری کو ڈھاکہ میں پولیس نے دوبارہ فائرنگ کی جس سے دو ہلاک اور لاتعداد افراد زخمی ہو گئے۔ مغربی پاکستان کے شہروں خصوصاً، ملتان، ڈیرہ غازی خان، پشاور کوہاٹ، بنوں، لاہور اور راولپنڈی میں احتجاجی جلسے اور جلوسوں کا سلسلہ دفعہ ۱۴۴ کے باوجود جاری رہا، پولیس اور عوام کے درمیان بار بار جھڑپیں ہوئیں۔ اور وسیع پیمانے پر طالب علموں اور مزدوروں کو گرفتار کیا گیا۔ ۲۴ جنوری کو ڈھاکہ کے حالات قابو سے باہر ہو گئے، لہٰذا ڈھاکہ کو فوج کے حوالے اور ۲۴ گھنٹے کے لیے کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ لیکن طلبا اور مزدوروں نے کرفیو کے باوجود جلوس نکالا۔ پولیس نے فائرنگ کی جس سے ۵ افراد ہلاک ہو گئے۔ کھلنا کی فائرنگ میں تین افراد ہلاک ہو گئے۔

کراچی میں بھی فائرنگ ہوئی اور تقریباً ۱۹۰ افراد زخمی ہوئے۔

۲۵ جنوری کو کراچی میں چوبیس گھنٹے کے لیے کرفیو لگا دیا گیا۔ چند بسیں اور پٹرول پمپوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اس واقعے کے بعد دو سو افراد گرفتار کیے گئے۔ کھلنا میں ۳۱ گھنٹے کے لیے کرفیو نافذ کیا گیا۔ فوج کی فائرنگ سے پانچ افراد ہلاک اور بارہ زخمی ہو گئے، ۲۰ جنوری کو نارائن گنج اور ڈھاکہ میں فائرنگ سے چار افراد ہلاک ہو گئے۔ ۲۷ جنوری کو کراچی میں فائرنگ سے چھ افراد ہلاک ہوئے۔ شہر کے بعض علاقے فوج کے حوالے کر دیئے گئے۔ پشاور اور لاہور میں بھی فوج بلا لی گئی اور کرفیو لگا دیا گیا۔ گوجرانوالہ اور ڈیرہ اسماعیل خان میں پولیس فائرنگ سے تین افراد ہلاک ہو گئے۔

ایوب خان نے روایتی انداز میں تحریک کو کچلنے کی کوشش کی لیکن تحریک اس کی آمریت کے مقابلے میں بہت بڑی بن چکی تھی۔ اس لیے ایوب خان کو ناکامی کو منہ دیکھنا پڑا۔ ۷ نومبر سے شروع ہونے والی تحریک، طلبا مزدوروں، کسانوں، دانشوروں اور دیگر طبقوں کی شرکت سے اسے روکنا ایوب آمریت کے بس میں نہ رہا اور ۲۴ مارچ ۱۹۶۹ء کو اُسے اقتدار، ایک اور فوجی آمر کے حوالے کر کے بھاگنا پڑا۔ جنوری ۱۹۷۰ء میں ایک بڑی سیاسی پیش رفت ہو چکی تھی۔ جس میں ایوب خان کو اپنا اقتدار بچانے کی ہلکی سی امید پیدا ہوئی لیکن اس کی یہ امید بھی دو ماہ میں ٹوٹ گئی۔ نئی سیاسی پیش رفت یہ تھی کہ:

۸ جنوری ۱۹۶۹ء کو ڈھاکہ میں حزبِ اختلاف کی آٹھ سیاسی پارٹیوں کے مشترکہ اجلاس میں ایک جمہوری مجلس، عمل بنائی گئی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ 'شخصی آمرنہ نظام' جس کی وجہ سے ملک تباہی و بربادی کے کنارے تک پہنچ گیا تھا، کو ختم کر کے منظم اور پُر امن عوامی جدو جہد کے ذریعہ جمہوریت بحال کرائی جائے۔ جمہوری مجلس عمل نے نو نکات پر مشتمل مطالبات کی ایک فہرست بھی تیار کی تھی جو حسب ذیل تھے:

۱۔ یونیورسٹی آرڈیننس کی تنسیخ۔

۲۔ بلا واسطہ اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر جمہوریت کی بحالی۔

۳۔ اظہار رائے اور پریس کی مکمل آزادی، اخبارات ورسائل پر سے حکومت کی

عاید کردہ پابندیوں کا خاتمہ نیز حکومت نے جن اخبارات ورسائل کو ضبط کرلیا ہے، انہیں ان کے اصل مالکوں کو دے دیا جائے۔

۴۔ مشرقی پاکستان کی مکمل خودمختاری، مرکزی حکومت سے صوبوں کے تمام اختیارات کی منتقلی سوائے دفاع، امور خارجہ اورزرمبادلہ، مشرقی پاکستان کے لیے علیحدہ کرنسی، مشرقی پاکستان میں مسلح افواج یا پیراملٹری فورسز کا قیام، ایک آرڈیننس فیکٹری اور بحریہ کے ہیڈکوارٹر کا قیام۔

۵۔ مغربی پاکستان میں سب فیڈریشن کا قیام، بلوچستان، سندھ اور سرحد کے لیے مکمل صوبائی خودمختاری۔

۶۔ بینکوں، انشورنس کمپنیوں اور بڑے صنعتی اداروں کو قومی تحویل میں لینا۔

۷۔ ملک میں ہنگامی حالات کا خاتمہ، ایسے تمام قوانین کی فوری تنسیخ جس کے ذریعہ مقدمہ چلائے بغیر لوگوں کو نظر بند کیا جاتا ہے۔ ہڑتال کے حق کی بحالی۔

۸۔ تمام سیاسی اسیروں کی رہائی، اگرتلہ سازش کیس کا خاتمہ۔

۹۔ نئی آزاد خارجہ پالیسی کی تشکیل، سیٹو اور سنٹو کے معاہدہ سے پاکستان کی علیحدگی۔

جمہوری مجلس عمل کے رہنماؤں نے ان نو نکات کی بنیاد پر ایوب خان سے بات چیت کا فیصلہ کیا تھا لیکن کانفرنس میں تعطل پیدا ہوگیا۔ اور یہ لیڈر عام انتخابات، بالغ رائے دہی کے اصولوں پر سمجھوتہ کر کے جسے ایوب خان پہلے ہی منظور کر چکے تھے اور مزید مطالبات پر بات کیے بغیر چپ چاپ واپس آ گئے۔

ایوب خان نے سیاسی عمل کے ذریعے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی اس نے سیاسی پسپائی اختیار کرتے ہوئے ۱۳ مارچ ۱۹۶۹ء کو جمہوری مجلسِ عمل کو گول میز کانفرنس کے ذریعے معاملات طے کرنے کی دعوت دی۔ مجلس عمل کے سیاسی قائدین میں نیشنل عوامی پارٹی کے ولی خان، جمیعت العمائے اسلام کے مولانا مفتی محمود، ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان، عوامی لیگ کے شیخ مجیب الرحمان، جماعت اسلامی کے مولانا مودودی، پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی کے نوابزادہ نصر اللہ خان،

کونسل مسلم لیگ کے میاں ممتاز احمد خان دولتانہ اور نظام اسلام پارٹی کے چوہدری محمد علی اور مولوی فرید احمد شامل تھے۔ نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی گروپ کے مولانا بھاشانی اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ذوالفقار علی بھٹو نے گول میز کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اس کانفرنس سے باہر عوامی مطالبات کی حمایت کرتے رہیں گے۔ ایوب خان نے صدارتی کی بجائے پارلیمانی نظام اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کرانے کے مطالبات تسلیم کر لیے لیکن مجلس عمل کے نو نکاتی مطالبات پر پیش رفت نہ ہو سکی اور کانفرنس ناکام ہو گئی۔

سندھ این ایس ایف اس سارے عرصے میں فعال رہی۔ کمیونسٹ پارٹی اس بات کی حامی تھی کہ ایوب خان سے مذاکرات کی کامیابی عوام کی فتح ہو گی۔ اسی لیے نیشنل عوامی پارٹی نے، جو کمیونسٹ پارٹی کا قانونی اور سیاسی فرنٹ تھی، ان مذاکرات میں شریک ہوئی۔ مذاکرات کی ناکامی کا مشرقی پاکستان اور سندھ بالخصوص کراچی میں شدید ردِعمل ہوا اور پُرتشدد واقعات پھر شروع ہو گئے۔

۱۵ مارچ کو نواکھلی میں ایک مشتعل ہجوم نے تھانے پر حملہ کر کے چار سپاہیوں کو ہلاک کر دیا۔ جمال پور میں سات افراد ہلاک ہوئے اور دو افراد آتشزدگی سے ہلاک ہو گئے۔ ڈھاکہ اور چٹاگانگ کی صورت حال انتہائی مخدوش ہو گئی تھی۔۔ ۲۰ مارچ کو کراچی میں سائٹ ایریا کے مزدوروں نے ایک زبردست احتجاجی جلوس نکالا۔ کنونشن مسلم لیگ کے غنڈوں نے جلوس پر حملہ کر کے ایک مزدور کو ہلاک کر دیا۔ مشرقی پاکستان کے شہر راج شاہی میں بھی فائرنگ ہوئی جس سے ۱۱۳ افراد ہلاک ہو گئے۔

ایوب خان کے خلاف عوامی جدوجہد محض ایک شخص کے خلاف نہ تھی، بلکہ استحصال کرنے والے طبقوں کے خلاف تھی چنانچہ مارشل لا کے نفاذ کے باوجود کارخانوں کے مزدور اور محنت کش عوام نے بہتر حالات کار، اجرتوں میں اضافہ، طبی اور رہائشی سہولت کے حصول کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ ان کی جدوجہد کا رُخ صاف طور پر ایک نئے اقتصادی نظام کے قیام کی طرف تھا۔

جام ساقی، سندھ این ایس ایف اور کمیونسٹ پارٹی کے دیگر محاذ عوامی جدوجہد کو آگے بڑھا رہے تھے۔ نظام وہی تھا، صرف فوجی چہرہ تبدیل ہوا تھا۔ جنرل یحییٰ خان کو اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا تھا کہ عوام کے بنیادی مطالبات کو تسلیم کیے بغیر وہ اقتدار میں نہیں رہ سکتا۔

جام ساقی، جو کمیونسٹ پارٹی سندھ کے سیکریٹری تھے، اپنے دل میں بھٹو کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ ان کے اپنے لفظوں میں ''میرا خیال تھا کہ پیپلز پارٹی کے کارکن سوشلزم کی طرف زیادہ جھکاؤ رکھتے ہیں۔ جبکہ کمیونسٹ پارٹی تحریک کو جمہوری تبدیلی تک محدود رکھنے کی بات کر رہی تھی۔ حقیقت میں تحریک ان معاملات سے بہت آگے نکل گئی تھی۔ حقیقت میں یہ بھٹو نہیں تھا، جس نے عوام کو آواز بخشی، بلکہ یہ عوام تھے، جنہوں نے بھٹو کو آواز بخشی۔

شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی ۱۹۶۹ء میں جام ساقی، ایک بار پھر، سلاخوں کے پیچھے بھیج دیئے گئے۔ اس بار جیل میں انہیں قیدِ تنہائی میں رکھا گیا۔ اس سے قبل اوائل اپریل سے جام ساقی نے ایوب خان کے بعد یحییٰ خان کو بھی چیلنج کرنے سے اپنی نئی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا تھا۔ شاہ لطیف بھٹائی کے میلے میں جام نے ایک پمفلٹ تقسیم کیا جس میں مندرجہ ذیل مطالبات کیے گئے تھے:

۱۔ ون یونٹ کا خاتمہ کیا جائے۔

۲۔ فوج سے انعامی زمین واپس لے کر مقامی ہاریوں میں تقسیم کی جائے۔

۳۔ سندھی زبان کو قومی زبان تسلیم کیا جائے۔

جام اور ان کے چاروں ساتھی... مہر حسین شاہ، میر تھیبو، علی اکبر بروہی اور اقبال میمن... زور وشور سے پمفلٹ تقسیم کر رہے تھے کہ انہیں سپیشل برانچ کا ایک سندھی سپاہی مل گیا۔ اس نے بتایا کہ پمفلٹ خفیہ اداروں کے ہاتھ بھی لگ گیا ہے اور میلے میں پمفلٹ تقسیم کرنے والوں کی تلاش شروع ہو گئی ہے۔ انہوں نے فوراً پمفلٹ بانٹنے بند کر دیئے اور سٹیشن سے ہوتے ہوئے ہالہ پہنچ گئے۔ اگلی صبح وہ حیدرآباد واپس آ گئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ گرفتاری نہ دی جائے اور الگ الگ روپوش رہا جائے۔ جام ساقی نے ہمیں بتایا:

''ہم سب اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ دو تین روز بعد میں اپنے دوست انور نظامانی کے ساتھ ایک ویگن میں جا رہا تھا کہ خفیہ والوں نے مجھے دھر لیا۔ جونہی میں گرفتار ہوا۔ انور ضد کرنے لگا کہ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ میں جام کو اکیلا گرفتار نہیں ہونے دوں گا۔ انور کی ضد پر خفیہ والے اسے بھی ساتھ لے چلے۔ وہ ہمیں ٹانگے میں بٹھا کر ایس پی آفس لے جانے لگے۔ میری کوشش تھی کہ انور کسی طرح چلا جائے۔ ٹانگے میں بھی بحث چلتی رہی۔ میں نے اسے کہا، ''میاں ایسے میں مجھے مار بھی دیں

گے تو بتانے والا کوئی نہیں ہوگا۔'' اس پر وہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ ایس پی آفس سے مجھے حیدر آباد جیل بھیج دیا گیا۔ مہر حسین شاہ اور میر تھیبو بھی گرفتار ہو کر حیدر آباد سینٹرل جیل میں ہی بھیج دیئے گئے۔

انہی دنوں مغربی پاکستان کے گورنر جنرل موسیٰ نے حیدر آباد کا دورہ کیا۔ اس نے شکایت کی کہ طلبا بہت شور مچا رہے اور ون یونٹ کے خلاف نعرے لگا رہے ہیں۔ خفیہ اداروں نے رپورٹ پیش کی کہ یہ سب ان تین لڑکوں کا کیا دھرا ہے جو یہاں جیل میں بند ہیں۔ اس رپورٹ پر میر تھیبو کو ڈیرہ اسماعیل خان، مہر حسین شاہ کو ہری پور ہزارہ اور جام ساقی کو پشاور جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ تینوں مارشل لاء کے سیکشن ۱۹ کے تحت جیلوں میں بند تھے۔ اس وجہ سے جیل والے ان کی عزت کرتے تھے لیکن جس دن نیپ کے رہنما اور شاعر و سیاستدان اجمل خٹک اور سکندر خان خلیل جام کو جیل ملنے گئے تو ان کی پہلے سے کہیں زیادہ عزت ہونے لگی۔

جام نے پشاور جیل میں پشتو پڑھنا شروع کی۔ دیگر سزا یافتہ قیدیوں کی طرح انہیں مشقت بھی کرنا پڑتی تھی۔ جام کو یقیناً حسرت موہانی کا جیل کا دور یاد آتا ہوگا۔

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

لیکن جام نے مشقِ سخن کی جگہ مکتوب نگاری کا راستہ نکال لیا۔ جیل کے ہسپتال کا ٹھیکیدار نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) کا ہمدرد تھا، ان صاحب کی معرفت جام نے جیل سے باہر کے دوستوں سے رابطے استوار کر لیے۔ وہ ٹھیکیدار کے پتے سے باہر دوستوں کو خط بھیجتے اور اسی پتے سے ان کے خط وصول کرتے۔ جن دوستوں نے جیل میں وقت نہیں کاٹا، وہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ جیل میں خطوں، خصوصاً آنے والے خطوں کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔

پشاور جیل ہی سے جام نے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کرنے کی تیاری شروع کر دی اور امتحانی فارم بھر کر بھیجا۔ اسی طرح کا پروگرام ڈیرہ اسماعیل خان اور ہری پور کی جیلوں میں قید میر تھیبو اور مہر حسین شاہ نے بھی بنایا۔ لیکن انہیں جیل حکام نے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہ دی جس پر احتجاج کرتے ہوئے جام ساقی نے امتحانی ہال سے واک آؤٹ کیا۔ طلباء کے مسلسل احتجاج

کے نتیجے میں جام ساقی جلد ہی جیل سے رہا کر دیئے گئے۔

جام ساقی نے کئی برس بعد حیدرآباد کی خصوصی فوجی عدالت کے روبرو جو تاریخی بیان دیا، اس میں بھی اس قید و بند کا حوالہ ملتا ہے

''مجھ پر یحییٰ خان کے غیر قانونی اقتدار کے دوران بھی خصوصی فوجی عدالتوں میں مقدمے چلائے گئے۔ ۱۹۶۹ء کے اوائل میں مجھے اس بنیاد پر گرفتار کیا گیا تھا کہ میں نے ون یونٹ کے خلاف بیجز تقسیم کیے تھے۔ مجھ پر مئی ۱۹۶۹ء میں ایک میجر جاوید مجید کی خصوصی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔ سی آئی ڈی کے ایک گواہ نے عدالت کو بتایا کہ ''انہیں ایک وائرلیس پیغام موصول ہوا ہے کہ سرحد پار کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، مجھے اس پر شدید دکھ ہوا اور میں اپنے جواب میں جذباتی ہوگیا۔ پریذائڈنگ آفیسر میرے جذبات کو محسوس کر رہا تھا کیوں کہ میں نے اسے آبدیدہ دیکھا تھا مگر اس نے مجھے ایک سال قید سخت کی سزا سنادی۔

مجھے ایک اور انوکھا واقعہ یاد ہے۔ مجھ پر مارشل لاء ریگولیشن ۵، ۱۶، ۱۹ کی خلاف ورزی پر مقدمہ قائم کیا گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے ون یونٹ کی مخالفت کر کے ایم ایل آر ۱۹ کی خلاف ورزی کی تھی میں نے صدر عدالت سے پوچھا کہ یہ ایم ایل آر ۵ اور ۱۶ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ وہ نہیں جانتا، میں نے اس پر کہا کہ میں اس وقت تک عدالت کو مقدمہ جاری رکھنے کی اجازت نہیں دوں گا جب تک عدالت یہ نہیں جان لیتی کہ وہ قواعد کیا ہیں جن کی خلاف ورزی کا الزام مجھ پر عائد کیا گیا ہے۔ میجر جاوید نے دس منٹ کے وقفے کا اعلان کیا اور جب کارروائی دوبارہ شروع ہوئی تو اس نے بتایا کہ ایم ایل آر ۵ غداری کے بارے میں ہے اور پھر مسکراتے ہوئے بتایا کہ جہاں تک ایم ایل آر ۱۶ کا تعلق ہے حیدرآباد کے ''بگ گائے'' کو بھی اس کے متعلق علم نہیں ہے۔ تاہم بغیر کسی مزید تاخیر کے اس نے وہ سزا سنادی جس کے لیے اسے بھیجا گیا تھا۔

مجھ پر دسمبر ۱۹۶۹ء میں دوبارہ ایک فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اس عدالت کی سربراہی کوئی میجر بیگ کر رہا تھا۔ اس نے مجھے زرعی کالج کے ہوسٹل کے کمرے میں چھ سو طلباء کے سامنے اشتعال انگیز تقریر کرنے کے الزام میں ایک سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ ہوسٹل کے چھوٹے سے کمرے میں چھ سو طلباء۔ بیان کی نہ تو تصحیح کی گئی اور نہ اسے حذف کیا گیا جب کہ مجھے سزا

سنادی گئی۔''

جام ساقی کمیونسٹ تھے۔ ون یونٹ کو ایک قومی مسئلہ سمجھ کر اس کے خلاف پندرہ سال تک (۱۹۵۵ء تا ۱۹۷۰ء) جدوجہد کی گئی تھی۔ جام ساقی نے جس استقامت اور بہادری سے اس جبری اتحاد کے خلاف تحریک چلائی، ایسی تحریک قوم پرست بھی نہ چلا سکے۔ ون یونٹ کے تحت مغربی پاکستان قوموں کا قید خانہ تھا۔ اسے پاکستان کی قوموں کو دبانے اور ان کا استحصال کرنے کے لیے مسلط کیا گیا تھا اور جام کا کہنا تھا کہ کمیونسٹ کسی بھی قوم کو دبانے کے حق میں نہیں ہوتے۔

''اسی لیے ہم ون یونٹ کی سوچ کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے''

یحییٰ خان نے ۲۸ نومبر ۱۹۶۹ء کو اعلان کیا کہ حکومت نے اصولی طور پر ون یونٹ کو توڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور یکم جولائی ۱۹۷۰ء سے مغربی پاکستان کے چاروں صوبے بحال کر دیئے جائیں گے۔ ۳۰ جون ۱۹۷۰ء کی رات کو ون یونٹ ٹوٹنے کی خوشی میں پورے سندھ میں چراغاں کیا گیا اور یکم جولائی کا سورج صدیوں پرانے سندھ کی بحالی کے ساتھ طلوع ہوا۔ سندھ کے تمام سیاسی کارکنوں، دانشوروں اور شاعروں، ادیبوں نے پورے سندھ میں اس جشن کا اہتمام کیا۔ پنجاب سے شیخ ایاز کی درخواست پر راقم الحروف (احمد سلیم) نے سکھر میں اس جشن میں شرکت کی جبکہ قوم پرستوں کے جلسے میں پندرہ سو لوگ بھی نہیں تھے۔ جام ساقی نے جیکب آباد میں ایک بڑے جلسہ کا اہتمام کیا جس میں پندرہ ہزار سے زائد لوگوں نے شرکت کی۔ یہ جام کے موّقف اور نظریے کی صداقت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ کمیونسٹ اور ترقی پسند کارکنوں کی کامیابی یہ تھی کہ ون یونٹ کے مسئلے پر عام لوگ ان کے نظریے کی تائید کرتے تھے۔

ون یونٹ ٹوٹنے سے کچھ عرصہ قبل مغربی پاکستان کے گورنر جنرل موسیٰ خان نے سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو ایک خط لکھا کہ وہ یونیورسٹی کے طلباء سے ملنا چاہتا ہے۔ وائس چانسلر نے جام کو وہ خط دیا۔ جام نے گورنر سے ملنے کا فیصلہ کیا اور ملاقات طے ہوگئی۔ یہ ملاقات حیدرآباد کے سرکٹ ہاؤس میں ہونی تھی۔ جام ساقی سمیت مختلف طلباء نمائندے سرکٹ ہاؤس پہنچے جہاں طلباء نے اپنے اپنے مسائل بیان کیے۔ کسی نے لائبریری کا مسئلہ پیش کیا تو کسی نے ہاسٹل کی بات کی، جب جام کی باری آئی تو وہ بولے:

''گورنر صاحب! جب طلباء تحریک میں تیزی آتی ہے تو آپ انہیں سلام کرنے آ جاتے ہیں۔ آپ لوگ کبھی ون یونٹ لگاتے تو کبھی مارشل لاء مسلط کر دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ اب بند ہو جانا چاہیے۔''

جام کے ان لفظوں نے سرکٹ ہاؤس کے باہر ایک داستانی صورت اختیار کر لی۔ تلخ کلامی کی خبریں مشہور ہوئیں۔ یہ افواہ بھی اڑی کہ جام ساقی نے جنرل موسیٰ خان کو تھپڑ مار دیا ہے۔ حالاں کہ اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ دراصل لوگوں کی خواہش تھی کہ ایسا ہو۔ البتہ موسیٰ خان پر اس ملاقات کا کوئی خوشگوار اثر نہیں پڑا تھا۔ اسے کہنا پڑا کہ سیاسی طور پر حیدرآباد گرم ترین شہر ہے جنرل موسیٰ کے لفظ تھے:

Hyderabad is the hottest city.

سول اور فوجی حکمرانوں نے ون یونٹ پر جو سخت مؤقف اختیار کر رکھا تھا، جام کا اس پر ردِعمل فطری اور حق بجانب تھا۔ اس کی تائید اس دور کے تمام ترقی پسند حلقے بھی کرتے تھے۔ سندھ میں محمد ایوب کھوڑو اور پیر علی محمد راشدی ون یونٹ کو مسلط کرانے کے ذمہ دار تھے۔ اس سلسلے میں جناب رکن الدین قاسمی کی تحریر کردہ ایک دلچسپ دستاویز ہمارے سامنے ہے جس میں وہ راشدی سے سوال کرتے ہیں کہ کیا انہیں ون یونٹ کی سازش کا علم پہلے سے نہ تھا اور سندھ کے گلے میں لعنت کا یہ طوق ڈالنے والوں میں وہ کیوں شامل ہوئے؟ رکن الدین قاسمی لکھتے ہیں:

''ہمارے سندھ کے پیر علی محمد راشدی دلچسپ آدمی ہیں۔ وہ ایک بار پیر پگاڑو کی بندہ پروری کی بدولت سندھ کی صوبائی اسمبلی تک پہنچ گئے تھے۔ اور پیرزادہ عبدالستار اور خان بہادر کھوڑو کے طفیل وزارت کی مسند پر بھی فائز تھے۔ یہ سلسلہ چھوٹے بڑے وقفوں سے وزارت اور سفارت تک اس وقت تک کھنچتا چلا گیا جب تک بعض نا قابل بیان وجوہ کی بناء پر موصوف ایک لمبے عرصہ تک ہانگ کانگ میں ''روپوش'' ہونے پر مجبور نہیں ہو گئے۔

اب کہ انہوں نے جی ایم سید صاحب کا دامن پکڑا ہے اور ان کی دستگیری سے ایک حلقہ ''محال کوہستان'' سے انتخاب لڑ کر اسمبلی تک پہنچنا چاہتے ہیں، راشدی صاحب کا خیال ہے کہ ان کے نامہ اعمال کا سیاہ ترین ورق وہ ہے جو ون یونٹ سے نتھی ہے۔ اس لیے وہ اسی دھبے کو اپنے

دامن سے کھرچنے میں مصروف ہیں حالاں کہ ان کا دامن اس سے بھی بڑے بڑے بے شمار دھبوں سے داغدار ہے۔ وہ ایک دھبے کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں تو دوسرا دھبہ نمایاں ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

راشدی صاحب نے اپنے دھبے دھونے کے لیے روزنامہ جنگ مورخہ ۴ جولائی کے ''مشرق و مغرب'' کے کالم کو استعمال کرتے ہوئے ون یونٹ کا ذکر چھیڑا ہے اور سب سے پہلے یہ شکوہ کیا ہے کہ آج کل لوگ تاریخ کو مسخ کر رہے ہیں اور ون یونٹ سے متعلق واقعات غلط رنگ میں پیش کیے گئے ہیں۔

ون یونٹ کے معاملہ میں راشدی کی خاموشی اور پھر خاموشی کو توڑنے کی اصل وجوہات وہ نہیں ہیں جو راشدی نے بیان کی ہیں بلکہ ان کی خاموشی کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان قومی مجرموں میں سے ایک ہیں جو ون یونٹ بنانے اور ۹ نومبر ۱۹۵۴ء اور ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۵ء کے درمیانی عرصے میں ون یونٹ کی خاطر سینکڑوں دھاندلیوں، بدعنوانیوں اور بے قاعدگیوں کے مرتکب رہے ہیں اور خاموشی کو توڑنے کی وجہ یہ ہے کہ انتخابات قریب آنے پر ان کو اپنے لیے زمین ہموار کرنے کی ضرورت آ پڑی ہے۔''

قاسمی صاحب اپنے تابڑ توڑ سوالات کے ذریعے راشدی اور ون یونٹ کی حقیقت کو واضح کرتے ہیں:

اصل مسئلہ یہ ہے:

۱۔ علی محمد راشدی کو ون یونٹ بننے سے قبل یہ علم تھا یا نہیں کہ سندھ کے باشندے ون یونٹ کے خلاف ہیں؟

۲۔ اس کے باوجود راشدی نے سندھ کے ۷۰ لاکھ باشندوں کی گردن میں ون یونٹ کی لعنت کا طوق زبردستی ڈالنے میں بھرپور حصہ لیا یا نہیں؟

۳۔ راشدی نے یہ ذلیل حرکت کر کے مادر سندھ سے غداری کی یا نہیں؟

۴۔ ون یونٹ کی وجہ سے سندھ کو جو بے شمار نقصانات پہنچے ہیں، پہنچ رہے ہیں

اور آئندہ پہنچنے کے امکانات موجود ہیں، راشدی کے اوپر ان کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے یا نہیں؟

۵۔ ون یونٹ مسلط کرتے وقت سندھ میں قیامت صغریٰ برپا کرنے، دہشت گردی پھیلانے، بے گناہ لوگوں کی تلاشی اور گرفتاری کے وارنٹ جاری کرنے، ان کے خلاف جھوٹے مقدمے بنانے، مارشل لاء اور کرفیو جیسے ہنگامی حالات پیدا کرنے، پولیس کو بے لگام چھوڑ دینے اور شرفا کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کی شرمناک کارروائیاں کرنے پر راشدی نے کھوڑو کو اکسایا یا نہیں اور وہ ان تمام کارگزاریوں میں اس کے مشیر کار اور شریک کار رہے یا نہیں؟

۶۔ اگر وہ سندھ پر ون یونٹ مسلط کرنے کے حق میں نہیں تھے تو کھوڑو وزارت میں شریک کیوں ہوئے؟ اگر ان کو پہلے سے اس سازش کا علم نہیں تھا اور بعد میں پتا چلا تو وہ مستعفی کیوں نہیں ہو گئے؟

۷۔ اگر وہ ان تمام دھاندلیوں، بے قاعدگیوں اور بدعنوانیوں میں شریک نہیں تھے یا ان کو پسند نہیں کرتے تھے تو وہ ان سے بری الذمہ ہونے کا اعلان کر کے کھوڑو وزارت سے علیحدہ کیوں نہیں ہو گئے؟

اب وہ کس منہ سے پاک دامن ہونے، سندھ اور سندھیوں کا دوست بننے اور محب الوطن ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔:

"شرم تم کو مگر نہیں آتی"

جام نے ون یونٹ کے خلاف تحریک چلا کر ایک باشعور سیاسی کارکن ہونے کا ہی نہیں۔ بلکہ ایک سچا کمیونسٹ ہونے کا ثبوت بھی دے دیا۔

جام نے طلبا قیادت کے اپنے آخری دور میں قوموں کے مصنوعی اتحاد کی بجائے طلباء اتحاد کی بات کی۔ ۶ مارچ ۱۹۷۰ء کو جام ساقی لاہور پہنچے جہاں انہوں نے پاکستان فیڈرل یونین آف سٹوڈنٹس کے قیام کے سلسلے میں منعقد ہونے والی ملک گیر کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی۔ فیڈرل یونین میں پاکستان بھر کی طلباء تنظیمیں۔ ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس یونین، بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن، پختون سٹوڈنٹس یونین، سندھ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن اور این ایس ایف (کاظمی گروپ) شامل تھیں۔ ہمارے گورداسپور مغل ان دنوں لاہور سے ہفت روزہ "لیل و نہار" کے

نمائندہ تھے کراچی سے یہ جریدہ فیض احمد فیض، سبط حسن اور حسن عابدی مل کر نکال رہے تھے۔ فیڈرل یونین کی لاہور کانفرنس کی مفصل روداد امین مغل کے قلم کا نتیجہ ہے۔ گورو کا لکھا ہمارا لکھا۔ اس لیے ہم ان کی روداد سے بعض حصے آپ کی نذر کر رہے ہیں۔

''ہم نسل انسانی کے اعلیٰ آدرشوں کی خاطر اپنی تمام جسمانی، ذہنی اور جذباتی توانائیاں وقف کر دیں گے۔''

تا کہ اس دنیا میں

- فرد معاشرے کے لیے ہو اور معاشرہ فرد کے لیے
- فرد معاشرے کا ضمیر ہو اور معاشرہ فرد کا جسم

یہ الفاظ اس عہد نامے کے ہیں جسے پنجاب بھر کے طالب علم نمائندوں نے ۷ مارچ ۱۹۷۰ء کی صبح کو لاہور میں تیار کیا۔ پنجاب کے مختلف علاقوں کے مندوبین نے اس موقع پر پنجاب سٹوڈنٹس یونین کی بنیاد رکھی اور پنجاب، بلوچستان، سندھ، کراچی اور سرحد کے طالب علموں نے پاکستان گیر وفاقی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

ڈیلی گیٹ کانفرنس

اس کانفرنس میں لاہور، لائل پور، راولپنڈی، پاک پٹن، جڑانوالہ، ملتان، گوجرانوالہ کے علاوہ کئی اور مقامات سے طالب علم مندوبین نے شرکت کی۔ بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا چالیس افراد کا وفد اپنے چیئرمین عبدالحیٰ بلوچ کی قیادت میں آیا تھا۔ پختون سٹوڈنٹس یونین کے احمد کمال اور نثار احمد شنواری اپنے ساتھیوں سمیت موجود تھے۔ سندھ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کا وفد اپنے قائد جام ساقی کی رہنمائی میں اور کراچی سے قائم مقام صدر نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن محمد احمد اپنے ساتھیوں سمیت آئے ہوئے تھے۔ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر امیر حیدر کاظمی خود شرکت نہیں کر سکے کہ وہ کراچی سینٹرل جیل میں قید تھے۔ ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس یونین کے صدر شمس الضحیٰ اور سابق صدر مطیعہ چودھری نے اپنے اپنے پیغام میں کانفرنس کو مکمل تعاون اور یک جہتی کا یقین دلایا تھا۔ پنجاب سے باہر کے نمائندے اس کانفرنس میں بطور مبصر شریک ہوئے۔

۶ مارچ کے افتتاحی اجلاس کی صدارت سندھ کے فرزند جام ساقی نے کی۔ جام ساقی ایک شاعر بھی ہے اور شعلہ بیاں مقرر بھی۔

جام ساقی کی صدارت میں پنجسُو کے کنوینز محمد اشرف نے عوامی جدوجہد کے موجودہ دور میں، جب لوگوں کو معاشی، تہذیبی اور معاشرتی مسائل درپیش ہیں، یہ طے کرنا ضروری ہو گیا ہے کہ ہمارے تعلیمی مسائل کیا ہیں؟ ان مسائل کا حل کیا ہے؟ ان کا ملکی مسائل سے کیا رشتہ ہے اور انہیں حل کرنے میں طلبا کی قوت کیا لائحہ عمل وضع کر سکتی ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے کون سا کردار ادا کر سکتی ہے۔

اس تقریب میں فیض صاحب موجود نہیں تھے لیکن ان کا پیغام موجود تھا۔

''طلبا کے مسائل پر آپ کی تحریر اس قدر صحیح، مدلل، واضح اور باشعور ہے کہ جی خوش ہو گیا۔ آپ کے اغراض و مقاصد بھی صحیح خطوط پر ہیں۔ اگر آپ اپنی برادری کی ان خطوط پر مؤثر ذہنی تربیت کر سکیں، انہیں جماعتی قومی اور بین الاقوامی معاشرے کے حقائق و مسائل سے روشناس کرا سکیں اور انہی حقائق کی روشنی میں ان کے فکر و عمل کی صحیح راہیں متعین کر سکیں تو بڑا کام ہو گا۔

عطاء اللہ مینگل نے اپنے پیغام میں یاد دلایا کہ طلبہ نے آمریت کے قلعہ کو مسمار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب عام لوگوں کے درپیش دوسرے مسائل کو حل کرنے کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔ انتخابات کے زمانے میں ان کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ ''انتخاب کوئی ایسی طلسمی چھڑی نہیں کہ چشم زدن میں عوام کو خوشحالی اور خوشی کی دولتوں سے مالا مال کر دے۔''

محمود علی قصوری نے اپنے پیغام میں کہا: ''نوجوانوں کو قدرت نے راست گو، بہادر اور بے باک ہونے کی نعمت عطا کی ہے۔ پرائمری سے یونیورسٹی مدارج تک مفت تعلیم اب خواب نہیں رہنی چاہیے۔''

عوامی ادبی انجمن کے جواں سال پنجابی ادیب احمد سلیم نے کہا: ''ہم ادب کے راستے زندگی کی جس منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں اس کی سمت آپ تعلیم کے راستے سے آگے جا رہے ہیں۔ ہمیں، یونہی تمام مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں کو مختلف چھوٹے بڑے راستوں سے ہوتے ہوئے بالآخر ایک شاہراہ پر ملنا ہے، ہمیں ایک بڑی اکائی میں بدلنا ہے۔''

تعلیمی سیشن کی صدارت بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے چیئرمین عبدالحئی بلوچ نے کی۔ مسکراتی ہوئی آنکھیں، سیدھا سادہ انداز بے باکی اور انکسار، یہ عبدالحئی تھے جو ڈاکٹر صاحب کہلاتے تھے۔ بلوچوں کی نیکی، شرافت اور غیرت کا مظہر، حلقہ یاراں میں بریشم کی طرح نرم۔ اس محفل میں نوجوان تحریک کے پرانے رہنما سعید حسن خان نے بتایا کہ کس طرح نوجوانوں کی عالمی ترقی پسند تحریک، ڈیموکریٹک فیڈریشن آف یوتھ کو ناکام بنانے کے لیے سی آئی اے نے متوازی تنظیم بنائی۔

امین مغل نے نوجوانوں اور طالب علموں کے عالمی کردار کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اس کے خطرناک رجحانات کی نشاندہی کرتے ہوئے طالب علموں کے محنت کش طبقہ کی رہنمائی میں سماج کے دوسرے حصوں کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے پر زور دیا۔

جام ساقی بے حد پرجوش تھے اور ساتھیوں سے بار بار کہہ رہے تھے، ''یہ ہے پنجاب کا اصلی چہرہ۔''

اگلے دن تنظیمی اجلاس تھا جس کی صدارت پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سابق صدر احمد کمال نے کی۔ پنجاب کے مختلف طالب علم نمائندوں نے تقریریں کیں۔ راولپنڈی کی نیشنلسٹ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے پروفیسر راغب نے اپنی تنظیم کے پنجسو میں مدغم ہونے کا اعلان کیا۔ عہدنامہ، آئین اور منشور منظور کیے گئے اور پنجسو کا انتخاب کیا گیا۔ باسط میر صدر، عباس رضوی سیکرٹری اور لیاقت علی خزانچی چنے گئے۔ مختلف تعلیمی سیاسی قومی اور بین الاقوامی مسائل پر قراردادیں منظور کی گئیں۔ اسی اجلاس میں کانفرنس کے مہمان اور مبصر حبیب جالب نے اپنی نظمیں سنائیں۔ انجمن جمہوریت پسند خواتین کی سیکریٹری جنرل طاہرہ مظہر علی نے بھی تقریر کی اور یہ محض اتفاق تھا لیکن کتنا حسین اتفاق تھا کہ شام کو مہمان طلبہ لینن کے صد سالہ جشن کی ایک تقریب میں شریک ہوئے جس میں حبیب جالب، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر مبشر حسن، مظہر علی خان اور کمیٹی کے صدر لاہور کے مشہور دانشور ڈاکٹر نذیر احمد نے سامعین سے خطاب کیا۔

طلبہ کی نمائندہ تنظیموں کی رابطہ کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق یہ کانفرنس ایک پاکستان گیر تنظیم بنانے کے لیے بلائی گئی تھی۔ اس میں بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائیزیشن، پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن، سندھ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن، (کراچی) نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن اور پنجسو کے نمائندے بطور

مندوب شریک ہوئے۔ اس موقع پر ایک پاکستان گیر وفاقی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کا نام ''پاکستان فیڈرل یونین آف سٹوڈنٹس'' رکھا گیا۔ عہد نامہ، آئین اور منشور اصولی طور پر منظور کر لیے گئے۔ قراردادیں پاس کی گئیں اور یہ طے پایا کہ تین ماہ کے اندر اندر فیڈرل یونین کے انتخابات کرائے جائیں۔ اس غرض سے ہر وفاقی یونٹ نے تین تین ارکان پر مشتمل پندرہ رکنی تنظیمی کمیٹی تشکیل پائی جس میں تین نمائندے مشرقی پاکستان سٹوڈنٹس یونین سے لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ صدر شمس الضحیٰ اپنے خط میں اس وفاق کے قیام کی تائید کر چکے تھے۔ اجلاس کی صدارت این ایس ایف کے قائم مقام صدر محمد احمد نے کی۔ مقررین میں محمد احمد، جام ساقی، عبدالحیٔ بلوچ، نثار احمد شنوازی (پختون) اور پنجاب کے مندوبین شامل تھے۔

شام کے اجلاس کی صدارت پنج سو کے نومنتخب صدر باسط میر نے کی۔ میاں محمود علی قصوری، شیخ رفیق احمد، لطیف افغانی، پیکیجز ورکرز یونین کے الطاف بلوچ اور انجمن جمہوریت پسند خواتین کی نسیم اشرف ملک نے تقریریں کیں۔ عوامی ادبی انجمن اور پنج سو کے اشتراک سے ادبی محفل کا انعقاد ہوا، جس میں گل خان نصیر، اجمل خٹک، شیخ ایاز، حبیب جالب کی شاعری کے علاوہ ہر علاقے کے طالب علم شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ محفل کے صدر منیر احمد نے سندھی ادب کی تاریخ کا ایک جائزہ پیش کیا۔

ان دونوں کانفرنسوں کے فیصلے تاریخی اہمیت رکھتے تھے؟ ان سے طالب علموں کی بالغ نظری، وسعت قلب اور بین الاقوامی انقلابی جذبے کا پتا چلتا تھا۔ مثلاً سیاست کے باب میں یہ طے پایا کہ طلبہ کا سیاست میں حصہ لینا ان کا تاریخی فریضہ ہے اور انہیں سیاست سے علیحدہ رکھنے کی تمام کوششیں گہری سازش کا نتیجہ ہیں۔ مختلف مقررین نے اعلان کیا کہ طالب علم اور سیاست لازم و ملزوم ہیں۔ طالب علموں نے عالمی سیاست میں فعال کردار ادا کیا ہے۔ اور انہیں یہ فعال کردار ادا کرتے رہنا چاہیے۔

مزدوروں، کسانوں، دانشوروں، چھوٹے دکانداروں اور طالب علموں کو خراج تحسین پیش کیا گیا کہ انہوں نے اپنی با اصول جدوجہد سے ایوب آمریت کے سنگین بت کو پاش پاش کر دیا اور اس طرح ایک بار پھر اس تاریخی اصول کو دہرایا کہ اقتدار کا منبع عوام ہیں، چھوٹے صوبوں،

مشرقی پاکستان اور پنجاب کے ترقی پسند عوام کو مبارک باد پیش کی گئی کہ ان کی کوششوں نے ون یونٹ کا خاتمہ کر دیا۔

اعلان کیا گیا کہ اب جب کہ ون یونٹ کا خاتمہ ہو گیا ہے، منافرت کی مصنوعی دیواریں قائم رہنے کے لیے کوئی منطقی جواز نہیں رہتا۔ کانفرنس میں حیدر آباد کے سانحہ پر افسوس کیا گیا اور طالب علموں سے اپیل کی گئی کہ دوسری ترقی پسند طاقتوں کے ساتھ مل کر اپنے اپنے علاقے میں عوام کو یہ شعور بخشیں کہ اصل دشمن یعنی سامراج بالخصوص امریکی سامراج، اجارہ دار سرمایہ داری، جاگیرداری اور ان کے آلہ کار نوکر شاہی کے خلاف متحدہ محاذ وقت کی اہم ضرورت ہے، جس کے لیے پورے ملک کے محنت کش عوام ایک وحدت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تمام محب وطن اور ترقی پسند سیاسی جماعتوں اور عناصر سے اپیل کی گئی کہ وہ جمہوریت کی مخالف قوتوں کے خلاف صف آرا ہو جائیں تاکہ قومی جمہوری انقلاب کی تکمیل کے لیے جدوجہد کی جا سکے، جس کے تحت بیرونی سرمایہ ضبط کیا جائے، بڑے بڑے بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے، صنعت میں قومی شعبہ کی توسیع کی جائے۔ بھاری صنعت لگائی جائے، بیرونی تجارت کو ریاستی کنٹرول میں لے لیا جائے، جاگیرداری ختم کیا جائے، حدِ ملکیت مقرر کی جائے، عوامی جمہوری حقوق بحال کیے جائیں، تعلیم دسویں تک مفت کی جائے اور معاشرتی اور ثقافتی پسماندگیوں، نوآبادیاتی باقیات کو ختم کیا جائے۔ سامراج دشمن، آزاد، غیر جانبدار خارجہ پالیسی اختیار کی جائے اور پڑوسی ممالک سے تنازعات پرامن گفت وشنید کے ذریعے طے کیے جائیں۔

تمام محب وطن ترقی پسند طالب علموں کی تنظیموں سے اپیل کی گئی کہ وہ مندرجہ بالا مقاصد اور طلبا کے مسائل کے حقیقت پسندانہ سائنسی حل کے لیے متحد ہو کر جدوجہد کریں، پنج سُو نے کہا! پنجاب سٹوڈنٹس یونین اپنے آپ کو ان مقاصد کے حصول کی واحد اجارہ دار نہیں سمجھتی؛' طالب علموں سے اپیل کی گئی کہ اپنے اتحاد سے محب وطن، ترقی پسند سیاسی جماعتوں کو مجبور کریں کہ وہ ملک کے معاشی اور ثقافتی حل کے لیے مشترکہ طور پر جدوجہد کریں۔

ان تمام سیاسی اور مفاد پرست عناصر کی مذمت کی گئی جو نظریہ پاکستان کے تحفظ کے حسین پردوں کی آڑ میں مذہبی جنون پھیلا رہے ہیں۔ اور اپنے مفادات کے لیے ملک میں انتشار پیدا

کر رہے ہیں۔

سیاسی کارکنوں اور ٹریڈ یونین اور طالب علم رہنماؤں کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا تا کہ ملک میں امن قائم ہو، ساتھ ہی یہ کہا گیا کہ عوام کی بے اطمینانی کو تشدد سے دبانے کی بجائے سائنسی اور غیر جذباتی انداز میں مسائل کا تجزیہ کیا جائے۔

۱۔ تمام کالے قوانین منسوخ کیے جائیں۔

۲۔ مکمل جمہوری حقوق بحال کیے جائیں اور انجمن سازی کے غیر مشروط حقوق بحال کیے جائیں۔

۳۔ مزدور دشمن قوانین منسوخ کیے جائیں اور انجمن سازی کے غیر مشروط حقوق بحال کیے جائیں۔ تعلیمی اداروں اور سٹوڈنٹس یونینوں کو جمہوری طور پر چلانے کے مواقع اور ضمانت دی جائے۔ پریس اینڈ پبلی کیشن قوانین کو منسوخ کیا جائے۔

۴۔ کراچی اور پنجاب یونیورسٹی یونینوں کے انتخابات میں دھاندلیوں کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے۔

۵۔ آزاد کشمیر میں بنیادی اور جمہوری حقوق بحال کیے جائیں تا کہ وہاں پر جمہوری ادارے کام کر سکیں۔

اس امر کا اظہار کیا گیا کہ تعلیم کے موجودہ مسائل نتیجہ ہیں اس نو آبادیاتی نظام کے نافذ کردہ تعلیمی نظام کا جسے ارباب حکومت نے معمولی تبدیلیوں کے ساتھ جُوں کا تُوں برقرار رکھا ہے مطالبہ کیا گیا کہ ملک کی معاشرتی ثقافتی اور معاشی پسماندگیوں کو دور کرنے کے لیے نیا نظام تعلیم وضع کیا جائے جو مذہبی، نسلی، علاقائی اور صنفی تعصبات سے آزاد ہو، جو سائنسی طرز فکر پر استوار ہو اور سائنسی طرزِ فکر کو فروغ دے جس کا مقصد سامراجی اثرات سے آزاد، خود مختار، جمہوری، غیر جانبدار اور خوش حال پاکستان کا قیام ہو، اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے طلبہ کی غالب اکثریت اس طرزِ فکر کی حامی ہے، اور یہ کہ نظامِ تعلیم میں تبدیلی کے لیے معاشی ڈھانچہ میں تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔

مطالبہ کیا گیا کہ قومی منصوبہ بندی میں تعلیم کو ترجیحی درجہ دیا جائے۔ طلبہ اور اساتذہ کو تعلیمی

منصوبہ بندی میں موثر نمائندگی دی جائے، سینٹوں، سنڈیکیٹوں اور تعلیمی اداروں کے انتظامی شعبوں میں طلبہ اور اساتذہ کو موثر نمائندگی دی جائے۔ اس امر کا اظہار کیا گیا کہ تعلیمی نظام میں تبدیلیاں لانے کے لیے ضروری ہے کہ تعلیمی نظام میں سیاسی اقتدار حاصل کیا جائے۔

مطالبہ کیا گیا کہ اساتذہ کا سماجی مقام بلند کرنے کے لیے ان کی تنظیموں کے مطالبے منظور کیے جائیں اور ان کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے۔

تعلیم کو فنی رنگ دیا جائے، سائنسی تعلیم عام کی جائے اور اس کی خاطر اعلیٰ تعلیمی ادارے پھیلا کر سب علاقوں میں بنائے جائیں۔ بلوچستان، بہاولپور اور دوسرے علاقوں میں یونیورسٹیاں اور اعلیٰ سائنسی اور غیر سائنسی تعلیمی ادارے قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

انگریزی کی جگہ اردو اور بنگلہ رائج کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ مطالبہ کیا گیا کہ پنجابی کو پنجاب میں ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے تاکہ تعلیم میں جمہوری ماحول قائم ہو سکے اور تعلیم آسانی کے ساتھ دی جا سکے۔ پنجاب کے نشر و اشاعت کے اداروں میں پنجابی کے لیے وقت کا بیشتر حصہ وقف کر دیا جائے۔ پنجاب یونیورسٹی میں پنجابی کا شعبہ از سرِ نو کھولا جائے۔ مطالبہ کیا گیا کہ ہر تعلیم یافتہ فرد کے لیے روزگار کی ضمانت دی جائے۔

جام ساقی پوری کانفرنس پر چھائے ہوئے تھے اور کانفرنس کی دستاویزات کی تیاری میں پیش پیش رہے تھے۔ کانفرنس کے دوران انہوں نے کئی موقعوں پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ اب وہ طلباء سیاست کو پیچھے چھوڑ چکے ہیں لیکن یہ کانفرنس ان کے لیے ہمیشہ یادگار رہے گی۔

''میں نے پنجاب کا ترقی پسند اور انسان دوست چہرہ دیکھا ہے، یہ روشن چہرہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔'' جام ساقی نے پنجاب سٹوڈنٹس یونین کے منظور کردہ عہد نامہ کی خاص طور پر تعریف کی۔ اسے سندھ این ایس ایف سمیت بلوچ اور پشتون تنظیموں کے نمائندوں نے بھی اصولی طور پر تسلیم کیا۔ اس میں کہا گیا تھا:

تاریخ کے سامنے طالب علموں کی گواہی

ہم طالب علم یہ سمجھتے ہیں کہ:

- تمام انسان بلا لحاظ مذہب، ملت، رنگ، نسل، جنس اور قوم ایک وحدت ہیں۔
- انسانی زندگی خیر، حسن اور صداقت کی اقدار کی تخلیق، پرورش اور نگہداشت کے لامتناہی عمل کی کڑی ہے۔
- خیر، حسن اور صداقت کی تخلیق پرورش اور نگہداشت کے لیے امن اور خوشحالی ہونا ضروری ہے۔
- خیر، حسن اور صداقت کی بلندیوں کی طرف ہر لحظہ پرواز کے راستے میں حائل تمام رکاوٹیں انسانی عظمت کے امکانات کو محدود کرتی ہیں۔ ان کے خلاف جدوجہد روح انسانی کا پاکیزہ اور اعلیٰ فریضہ ہے۔
- خیر، حسن اور صداقت کے راستے میں حائل قومی، نسلی، جنسی، مذہبی اور طبقاتی امتیازات کو ختم کرنا ضروری ہے۔
- انسان ساختہ، امتیازی معیارات کی بنیادوں پر انسانوں کی تقسیم کو ختم کرنے کے لیے حقیقت پسندانہ عقلی اور سائنسی طریقہ پر ان کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔
- حقیقت پسندانہ، عقلی اور سائنسی طرز فکر ہی نسانی کی انسان کے خلاف صف آرائی کی تاریخی اصل تلاش کر سکتا ہے جس کی روشنی میں انسان کو انسان کے برابر کرنے کی بااصول، باشعور، مجاہدانہ جدوجہد کی جا سکتی ہے۔
- خیر، حسن اور صداقت کی تخلیق کے لیے شعور کا ثبات ضروری ہے۔ تعلیم نسل انسانی کی ایک ایسی تخلیق ہے جس کے ذریعہ ان قدروں کے مظہر وقت کا سفر طے کرتے اور نسل بعد نسل منتقل ہوتے ہیں۔
- ہم زمان کے اس لمحے میں مکان کے اس نقطہ پر تعلیم کے تخلیقی عمل میں حصہ لے رہے ہیں۔

ہم طالب علم عہد کرتے ہیں:

- ہم نسل انسانی کے اعلیٰ آدرشوں کی خاطر اپنی تمام جسمانی، ذہنی اور جذباتی توانائیاں وقف کر دیں گے۔

تا کہ اس دنیا میں

- فرد معاشرے کے لیے ہو اور معاشرہ فرد کے لیے
- فرد معاشرے کا ضمیر ہو اور معاشرہ فرد کا جسم۔

جام ساقی، لاہور سے واپس آئے تو بے حد خوش تھے وہ سانحہ حیدر آباد، جس کا کانفرنس کے دوران بھی ذکر رہا تھا، کے بارے میں کافی تشویش میں مبتلا تھے۔ فروری ۱۹۷۰ء میں جام شورو اور حیدر آباد میں خانہ جنگی کی جو صورت پیدا ہوئی، اس کے پس منظر میں صنعتی حالات، زرعی مسائل، ملازمتوں کے مسائل، تعلیمی حالت، سیاسی حالات اور تہذیبی مسئلے سمیت متعدد گمبھیر مسائل نے سندھ کو نئے اور پرانے سندھیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

حیدر آباد کی مختلف طلباء تنظیموں میں سندھ این ایس ایف نے اس سانحہ کی شدت کو کم کرنے میں بے حد اہم کردار ادا کیا۔ جام ساقی اس تنظیم کے صدر اور اب عملی سیاست سے وابستہ ہو کر وہ نیشنل عوامی پارٹی ولی خان گروپ کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس تنظیم میں نئے اور پرانے سندھی دونوں شامل تھے (مثلاً ندیم اختر اور ہدایت) اس کی ان دنوں سندھ بھر میں ۸۶ شاخیں تھیں، جن کا زیادہ اثر بالائی سندھ میں تھا۔ احمد الطاف کے تجزیے کے مطابق:

''پرانے سندھی اور نئے سندھی محاذوں کے اکابرین نے فرقہ وارانہ جذبات کی جو آگ سلگائی تھی، رفتہ رفتہ طلباء تک بھی پہنچی اور اسی نوع کی تفریق ان میں بھی پیدا ہوئی۔ صدر ایوب کے خلاف عوامی تحریک کے دوران میں طالب علم لیڈروں کو جو اہمیت حاصل ہوئی اس کے سبب سے بعد کو نوجوان سیادت اور قیادت سنبھالنے کے لیے وہی رنگ ڈھنگ اختیار کرنے لگے جو اہلِ غرض سیاست پیشہ لوگوں کا خاصہ ہیں اور ہر چھوٹی بڑی بات پر پرانے سندھی اور نئے سندھی طلباء کے قائدین ایک دوسرے سے الجھنے اور اپنے ساتھیوں کو ایک دوسرے سے الجھانے لگے۔ چنانچہ سندھ کے ایک غیر سندھی وائس چانسلر نے کسی پرانے سندھی افسر سے بعض بے ضابطگیوں کے بارے میں باز پرس کی تو پرانے سندھی طلبا برہم ہو گئے۔ یونیورسٹی میں کچھ پرانے سندھی طلباء نے بعض نئے سندھی اساتذہ سے بدتمیزی کی تو نئے سندھی طلبا مشتعل ہوئے۔ پھر ایک پرانے سندھی بزرگ سے

مبینہ طور پر نئے سندھی طلباء نے بدتمیزی کی اور یوں بات بڑھتے بڑھتے فسادات تک پہنچی جس پر سبھی فریق کفِ افسوس مل رہے تھے اور اپنی اپنی معصومیت کا اظہار کر رہے تھے۔

جام ساقی اور ان کی تنظیم نے باہمی نفرت کی شدت کو ختم کرنے میں کافی جدوجہد کی۔ نئے اور پرانے سندھیوں کی تقسیم اب بدقسمتی سے شہری اور دیہی سندھیوں کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

مارچ ۱۹۷۰ء میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک ملک گیر کسان کانفرنس منعقد ہوئی تو ۲۲۔۲۱ جون کو سندھ میں سکرنڈ ہاری کانفرنس نے ایک تاریخ ساز اجتماع کیا۔ اس کانفرنس کی کامیابی میں جام ساقی کا بہت اہم کردار تھا۔ پنجاب سے انجمن جمہوریت پسند خواتین، عوامی ادبی انجمن، نیشنل عوامی پارٹی پنجاب، پنجاب سٹوڈنٹس یونین، مزدوروں، کسانوں، دانشوروں اور سیاسی کارکنوں کے ایک بہت بڑے وفد نے کانفرنس میں شرکت کی۔

۱۹۷۰ء میں سال بھر کے دوران سندھ این ایس ایف کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ جولائی ۱۹۷۰ء میں نواب شاہ میں سندھ این ایس ایف نے ایک جلوس نکالا جس سے بشیر احمد میمن نے خطاب کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ڈومیسائل سرٹیفکیٹوں کی تبدیلی بند کی جائے اور گرفتار شدہ طلباء، ہاریوں، مزدوروں اور سیاسی کارکنوں کو رہا کیا جائے۔

یہ پورا دور طلبا کی جدوجہد کا دور ہے۔

۱۹ جولائی کو سکھر نیشنل عوامی پارٹی کے سیکریٹری جناب حسن حمیدی اور مقامی بار کونسل کے نائب صدر مسٹر فتح اللہ عثمانی سندھ ہاری کمیٹی کے مقامی سیکریٹری ورکرز فیڈریشن کے مزدور رہنما فیض گھا گھرو اور سندھ این ایس ایف کے مسٹر نور الدین منگریو نے مشترکہ بیان میں سندھ کے مختلف مقامات پر طلبا ہاری اور مزدور کارکنوں کی گرفتاریوں پر تشویش کا اظہار کیا اور مطالبہ کیا کہ سندھ کی سیاسی فضا کو پُر امن رکھنے کے لیے تمام گرفتار شدگان کو رہا کیا جائے اور ڈومیسائل کی دھاندلیوں کی تحقیقات کی جائے۔ عام لوگوں کا کہنا تھا کہ طلباء کی عمر اور ذہنی پختگی کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرنا چاہیے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ تعلیمی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے خیر سگالی کا مظاہرہ کر کے تمام طلباء کو رہا کرے۔

ان دنوں طلباء تحریک کا مرکز ایگریکلچر کالج ٹنڈو جام بن چکا تھا۔ سندھ یونیورسٹی جام شورو کیمپس میں امتحان کے دنوں میں بھی سناٹا تھا۔ کلاس روم بھائیں بھائیں کر رہے تھے اور ہوسٹل خالی تھے ایک طرف طلباء نے امتحانات کا بائیکاٹ کر رکھا تھا تو دوسری طرف یونیورسٹی سنڈیکیٹ نے امتحانات کو غیر معینہ مدت تک ملتوی کر دیا تھا۔ تیسری طرف طلباء اپنا ایک سال ضائع ہونے کے خدشے سے دوچار تھے۔ سارا معاملہ سندھ یونیورسٹی نیو کیمپس کی تعمیرات میں ایک کروڑ چونتیس لاکھ روپے کی مبینہ مالی بدعنوانیوں کے الزام سے شروع ہوا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر افغانی پرنسپل انجینئرنگ کالج غبن کے الزام میں گرفتار تھے لیکن طلباء ان کے خلاف مقدمہ واپس لینے اور انہیں رہا کرنے کے معاملے پر بھوک ہڑتال کیے ہوئے تھے۔ حیدر آباد، میر پور خاص، نواب شاہ، دادو، کوٹری اور ٹنڈو جام سے اس وقت تک تین سو سے زائد بھوک ہڑتالی طلباء مارشل لاء کے ضابطہ ۱۶ کے تحت گرفتار کیے جا چکے تھے جن میں سے بیشتر طلباء کو حیدر آباد کی سرسری فوجی عدالتوں سے مختلف میعاد کی قیدِ بامشقت کی سزائیں اور ایک سے پانچ ہزار تک جرمانے عائد کیے جا چکے تھے۔ ۲۳ جولائی کو حیدر آباد کے گاڑی کھاتہ ٹریفک آئی لینڈ سے مزید ے بھوک ہڑتالی گرفتار کیے جا چکے تھے۔ ۲۴ جولائی کو حیدر آباد میں لڑکیاں بھی بھوک ہڑتال میں شامل ہو گئیں۔ زرعی کالج ٹنڈو جام کے تین طلباء کے ساتھ سندھ یونیورسٹی کی طالبات اختر بلوچ (موجودہ ایم این اے سسّی پلیجو کی والدہ) اور نسیم سندھی نے بھی تا دمِ مرگ بھوک ہڑتال کر دی۔ ڈاکٹر افغان پر غبن کے الزامات اور طلبا کی اندھا دھند گرفتاریوں پر تشویش کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ جام ساقی ان حالات میں خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ سندھ این ایس ایف کے رہنما میر تھیبو نے ایک بیان میں مطالبہ کیا کہ تمام گرفتار شدہ طلباء کو غیر مشروط طور پر فوراً رہا اور مہر حسین شاہ و دیگر طلباء کے وارنٹ گرفتاری واپس لیے جائیں۔

سوا تین مہینے کے تعلیمی تعطل کے بعد یکم اکتوبر سے سالانہ تعطیلات کے دوران میں ہی سندھ یونیورسٹی کے سالانہ امتحانات شروع ہو گئے۔ جیل میں مقید یونیورسٹی کے چھ طالب علموں کی سہولت کے پیشِ نظر امتحانات دینے کے لیے جیل میں انتظام کیا گیا۔ انجینئرنگ کالج چودہ ہفتے تک بند رہنے کے بعد ۱۸ اکتوبر سے کھل گیا۔ طلباء کی بھوک ہڑتال اور گرفتاریوں کے سبب سے سندھ یونیورسٹی اور انجینئرنگ کالج یکم جولائی سے بند تھے۔

گرفتار شدہ طلبا میں سے ۲۵ رِہا کیے گئے ۔تقریباً ۴۵ طالب علم ابھی جیل میں بند تھے ۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق سندھ این ایس ایف (جام ساقی گروپ) سے تھا۔انہوں نے کسی قسم کی تحریر دے کر مشروط طور پر رِہا ہونے سے انکار کر دیا۔ان گرفتار طلباء کو حیدر آباد کی سرسری سماعت کے بعد فوجی عدالت سے مارشل لاء کے ضابطوں کے تحت کوڑوں کے علاوہ مختلف میعاد کی سزائیں سنائی گئی تھیں ۔ قیدی طالب علموں میں سندھ این ایس ایف کے نائب صدر مسٹر علی اکبر بروہی، جنرل سیکریٹری میر تھیبو، پریس سیکریٹری مسٹر احمد خان جمال اور مسٹر احمد خان ملکانی نیز دیگر طالب علم رہنما شامل تھے ۔ ان کی فوری اور غیر مشروط رہائی کے لیے بیشتر طالب علم انجمنوں کے علاوہ تقریباً تمام سیاسی پارٹیاں مسلسل مطالبہ کر رہی تھیں ۔ اس ضمن میں مختلف حلقوں کی جانب سے عام جلسوں میں لاتعداد قراردادیں منظور کی گئیں ۔

عام تاثر تھا کہ گزشتہ چند برسوں کے دوران میں ملکی سیاسیات میں ملک گیر جدوجہد اور قربانیوں کی وجہ سے طلبہ کے سیاسی کردار کی اہمیت میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ خصوصاً ایوبی آمریت کے خلاف طلباء کی تاریخ ساز تحریک کے باعث عام شہریوں کی نظر میں تعلیم یافتہ نوجوان نسل کے لیے ہمدردی اور احترام کے جذبات دو چند ہو گئے ۔ چنانچہ طالب علم مزدور، ہاری اتحاد کے نعرے اکثر و بیشتر سنائی دینے لگے ۔لیکن طالب علم برادری میں بھی متصادم گروہ موجود تھے، جن کے مکتبہء فکر اور سیاسی رجحان مختلف تھے ۔ یہی سبب تھا کہ طبقاتی معاشرہ میں طلبا کی تنظیمیں بھی مثبت اور منفی ترقی پسند یا رجعت پسند رجحان رکھتی تھیں ۔اس وقت اندرون سندھ میں کم و بیش دس طالب علم انجمنیں سرگرم عمل تھیں جن میں تقریباً ہر ایک کسی نہ کسی سیاسی جماعت کی حامی تھی ۔ سب سے نمایاں سندھ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن (جام ساقی گروپ) تھی جو سندھ میں طلبا کی ایک فیڈریشن تھی، جس کی شاخیں بالائی و زیرین سندھ کے تقریباً تمام اہم مقامات میں قائم تھیں ۔ اس ہمہ گیر فیڈریشن میں پرانے سندھی طلبا کے ساتھ اکثر نئے سندھی بھی شامل تھے ۔اسے یہاں این ایس ایف کا سوشلسٹ یا جام ساقی گروپ بھی کہا جاتا تھا۔اس کا رابطہ کراچی کے این ایس ایف (کاظمی گروپ) سے تھا اور اپنے سیاسی کردار میں یہ نیپ (ولی خان گروپ) کے پروگرام کی حامی تھی ۔اب جام ساقی نے خود کو طلباء سیاست سے الگ کر لیا تھا۔

۲۵ مئی کو نواب شاہ میں اس فیڈریشن کی کونسل کا جلسہ ہوا تھا جس میں سندھ کے تقریباً تمام شہروں اور قصبوں سے مندوبین نے شرکت کی تھی۔ کونسل نے نئی مجلس عاملہ کے لیے مندرجہ ذیل افراد کو منتخب کیا۔

صدر: مسٹر مہر حسین شاہ، نائب صدر: مسٹر علی اکبر بروہی، نائب صدر: مسٹر امداد علی اڈھو، نائب صدر مسٹر عزیز مہرانوی، جنرل سیکریٹری: مسٹر میر تھیبو، جوائنٹ سیکریٹری: مسٹر سومرو اور مسٹر نبی بخش ساہو، پریس سیکریٹری: مسٹر احمد خان جمالی، سوشل سیکریٹری: مسٹر ایوب لغاری، ویلفیئر سیکریٹری: مسٹر اشفاق حسین جمالی، خازن مسٹر قمر معین اور آڈیٹر مسٹر تاج بلوچ اور مسٹر خیر محمد جونیجو۔

کونسل نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ پیش رو صدر جام ساقی اور مسٹر ندیم اختر ۱۹ ممبروں پر مشتمل مجلسِ عاملہ میں موجود رہیں گے تاکہ ان کے مشوروں سے فیڈریشن مستفیض ہو سکے۔ کونسل نے پندرہ نکاتی مطالبات وضع کے لیے اور ان مطالبات کے لیے یکم اگست سے مظاہرے شروع کیے۔ مطالبات مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ فیسوں میں کمی کی جائے۔

۲۔ میٹرک تک مفت اور لازمی تعلیم دی جائے۔

۳۔ تعلیم کے خاتمے پر ملازمت کی ضمانت دی جائے۔

۴۔ سندھی کو قومی و سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔

۵۔ مادری زبانوں کو یونیورسٹی کی سطح تک ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔

۶۔ زراعتی کالج ٹنڈو جام کو یونیورسٹی کا درجہ دیا جائے اور سندھ میں مزید تعلیمی اور ٹیکنیکل ادارے قائم کیے جائیں۔

۷۔ زمین کی حدِ ملکیت سو (۱۰۰) ایکڑ مقرر کی جائے۔

۸۔ ۱۲۵ ایکڑ تک مالگزاری معاف کی جائے۔

۹۔ ہاریوں کی بے دخلی بند کی جائے۔

۱۰۔ سول اور فوجی حکام کو نیلام میں دی گئی اراضی واگزار کر کے کاشتکاروں کو دی جائے۔

۱۱۔ بیراج کی نئی اراضیات بھی واپس لے کر ہاریوں میں تقسیم کی جائیں۔

۱۲۔ غیر ملکی سرمایہ ضبط کیا جائے۔ ہر قسم کی اجارہ داری ختم کی جائے۔ بڑی صنعتوں، بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لیا جائے۔

۱۳۔ صوبائی خود مختاری بحال کی جائے اور مرکز کے پاس صرف دفاع، امور خارجہ اور کرنسی کو رہنے دیا جائے۔

۱۴۔ ملک میں مارشل لا ختم کر کے دوایوانی پارلیمانی نظام قائم کیا جائے۔

۱۵۔ تمام گرفتار شدہ طالب علموں، مزدوروں، ہاری ورکروں اور سیاسی کارکنوں کو غیر مشروط طور پر رِہا کیا جائے۔

دیگر طلباء تنظیموں میں سندھ این ایس ایف (رشید گروپ) سندھ سٹوڈنٹس کلچرل آرگنائزیشن، سندھ شاگرد تحریک، سندھ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، مہاجر طلباء محاذ اور راجپوت سٹوڈنٹس فیڈریشن قابلِ ذکر تھیں لیکن مرکزی کردار جام ساقی کے نام سے وابستہ سندھ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ہی رہا۔

۱۹۷۰ء پاکستان کے پہلے عام انتخابات کا سال بھی تھا۔ جام ساقی نے اندرون ضلع تھرپارکر (چھاچھرو اور ننگر پارکر) کے علاقہ سے صوبائی اسمبلی کی نشست کے لیے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ سندھ کے طلباء سمیت، ترقی پسند حلقے جام کی حمایت کر رہے تھے لیکن ان کا مقابلہ بڑے ٹھاکروں اور بنیوں سے تھا جن کا سربراہ رانا چندر سنگھ جیسا بڑا جاگیردار تھا۔ اس حلقے کی تمام چراگاہیں اور تجارت انہی ٹھاکروں اور بنیوں کے قبضے میں تھیں۔ نتیجہ ظاہر ہے ٹھاکروں اور بنیوں کے حق میں نکلنا تھا۔ ٹھاکر اور بنیے، ۶۰ فی صد ہریجن آبادی (کوہلی، بھیل، مینگھواڑ) کی تقدیر کے مالک تھے۔ ۵ فی صد مسلمان بھی انہی ٹھاکروں کے رحم و کرم پر تھے۔ اس دشوار گزار اور پسماندہ ریگزار میں جام ساقی کے حامی اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار یا پیادہ انتخابی دورے کر رہے تھے۔ جام اگرچہ انتخابات میں شکست کھا گئے لیکن عوام سے رابطوں سے یہ عمل بے حد مفید ثابت ہوا۔

حسن ناصر شہید کی برسی

۱۳ نومبر کی سہ پہر شہید چوک (صنعتی علاقہ) حیدر آباد میں ویسٹ پاکستان ورکرز

فیڈریشن کے زیر اہتمام، شہید حریت حسن ناصر کی دسویں برسی کے موقع پر مزدوروں، ہاریوں، طالب علموں اور دانشوروں کا مشترکہ جلسہ عام منعقد ہوا۔ کرسی صدارت پر کسی فرد کی بجائے عوامی آرٹسٹ اعیز کی بنائی ہوئی حسن ناصر شہید کی قلمی تصویر جلوہ گر تھی۔

مزدور رہنما مسٹر شیم واسطی نے محنت کش عوام کے سرخ جھنڈے کی پرچم کشائی کی اس کے بعد مزدور لیڈر مسٹر قوس گل خٹک نے حسن ناصر شہید کی متبسم تصویر سے نقاب سرکائی۔ بعد ازاں ایک مزدور ساتھی خان محمد نے عوامی شاعر حبیب جالب کی نظم اور انقلابی ترانہ سنایا۔

اس کے بعد حسن ناصر شہید کے احترام میں کھڑے ہوکر دومنٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ پھر سٹیج سیکریٹری مسٹر اعیز عزیزی نے حسن ناصر شہید کا ۱۹۵۹ء کا تحریر کردہ مضمون ''موجودہ صورت حال میں مزدور طبقہ کی ذمہ داریاں'' پڑھ کر سنایا۔ ازاں بعد جامعہ سندھ کے ایک طالب علم مسٹر غلام محمد ملکانی نے حسن ناصر شہید کو خراج عقیدت پیس کرتے ہوئے مزدور، ہاری، طلبا عوامی اتحاد پر زور دیا۔ سندھ کے مشہور صحافی اور ادیب جناب ابن حیات پہنور نے ایک حیات افروز مضمون پڑھا جس میں حسن ناصر شہید کے آدرش کی وضاحت کرتے ہوئے محنت کشوں کی جدوجہد کو تیز کرنے کی تلقین کی۔

پاکستان ٹیکسٹائل ملز یونین کے کارکن میر لائق اور ٹریڈ یونین ورکر اسلم قائم خانی نے محنت کش عوام پر کیے جانے والے مظالم بیان کرتے ہوئے کہا کہ مزدوروں، ہاریوں اور تمام مظلوموں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ حسن ناصر کے خون سے روشن کی ہوئی مشعل لے کر آگے بڑھیں اور ظلم اور تاریکی کو ختم کرنے کے لیے ان کے کاز کو آگے بڑھائیں۔

سندھ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر مسٹر مہر حسین شاہ نے انقلابی حسن ناصر کو سلام عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ حسن ناصر شہید اس کمیونسٹ پارٹی کے ایک بلند حوصلہ اور جانباز ممبر تھے جس پر امریکی سامراج کے اشارے پر ۵۴ء میں مقتدر سامراج حکومت نے پابندی عائد کردی۔ مسٹر مہر حسین شاہ نے کہا کہ حسن ناصر کی ہستی ہم نوجوانوں کو انسانیت کی مسرتوں سے ہمکنار کرانے اور محنت کی عظمت کو منوانے کا درس دیتی ہے۔ حسن ناصر کی روشن کی ہوئی چنگاری آج شعلہ بن چکی

ہے۔ سندھ این ایس ایف کے صدر نے ولولہ انگیز تقریر کرتے ہوئے حکومت سے پرزور مطالبہ کیا کہ وہ طالب علم رہنماؤں، مسٹر علی اکبر بروہی، میر تھیبو، احمد خان ملکانی اور دیگر طلباء رہنماؤں، مزدور کارکنوں اور سیاسی لیڈروں کو رہا کردے۔

جناب فیرز شاہ نے کہا کہ ہمارا لیڈر حسن ناصر اس لیے معظم تھا کہ وہ سچے فلسفہ یعنی سائنسی سوشلزم کا مبلغ تھا اور اپنی جان قربان کر کے اس نے اپنے نظریہ حیات کی عظمت کو برقرار رکھا۔

سندھ این ایس ایف میرپور خاص شاخ کے سیکریٹری مسٹر تاج بلوچ نے حسن ناصر شہید اور بابائے سندھ ہاری لیڈر حیدر بخش جتوئی مرحوم کی زندگی، جدوجہد اور قربانی کا ذکر کرتے ہوئے مزدوروں، ہاریوں اور طالب علموں کے مثبت اتحاد پر زور دیا۔

مزدور رہنما جناب قموس گل خٹک نے کہا کہ حسن ناصر کے قتل کا ذمہ دار ایک فرد نہیں بلکہ مزدوروں، کسانوں کے دشمن سرمایہ دار، جاگیردار اور نوکر شاہی اور ان کا پشت پناہ سامراج ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ امریکی سامراج اپنے مفادات کی غرض سے دنیا کے ہر ترقی پذیر مملک کے عوام کی جدوجہد آزادی کو کچلنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے

ویسٹ پاکستان ورکرز یونین فیڈریشن کے صدر اور حیدرآباد شہر کے جی وارڈ سے صوبائی اسمبلی کی نشست کے امیدوار، مزدور رہنما جناب شمیم واسطی نے خطاب کرتے ہوئے سامراجی لوٹ کھسوٹ اور ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کیا اور کہا کہ حسن ناصر کی جان لے کر عوام دشمن قوتوں نے یہ سوچا ہوگا کہ محنت کشوں کی تحریک کو کچل دیا جائے گا لیکن انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ حسن ناصر کی تحریک کا وارث محنت کش طبقہ بیدار ہو گیا ہے اور وہ وقت قریب آتا جا رہا ہے جب حسن ناصر کے قتل کا بدلہ معہ سود کے لوٹا دیا جائے گا جو ہم پر قرض ہے۔

مسٹر سلیم قریشی اور متحدہ مزدور فیڈریشن کے مسٹر ایف این انصاری نے بھی حسن ناصر شہید کو خراج تحسین پیش کیا۔ آخر میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں حکومت سے پرزور مطالبہ کیا گیا کہ وہ حسن ناصر شہید کے قتل کی از سر نو تحقیقات کرے اور غیر جانبدارانہ انتخابات کی خاطر تمام سیاسی گرفتار شدگان کو فوری طور پر رہا کردے۔

۱۹۷۰ء کے پہلے عام انتخابات میں کمیونسٹ پارٹی کے سیاسی محاذ نیشنل عوامی پارٹی کو

بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں کامیابی ملی اور نیشنل عوامی پارٹی نے جمیعت العلمائے اسلام کے تعاون سے دونوں صوبوں میں اپنی حکومتیں بنائیں لیکن یہ انتخابی نتائج کم و بیش ایک سال تک لٹکے رہے کیوں کہ پیپلز پارٹی نے جو سندھ اور پنجاب میں کامیاب ہوئی تھی انتقال اقتدار کے پارلیمانی اصول کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور عوامی لیگ، جس نے مکمل اکثریت حاصل کی تھی کو اقتدار کی منتقلی کی مخالفت کی۔ عوامی لیگ نے چھے نکات کی بنیاد پر انتخاب لڑا تھا اور وہ اپنے منشور سے ہٹنے پر آمادہ نہیں تھی۔ مارچ میں دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہونا تھا لیکن بھٹو صاحب نے اجلاس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور اس دباؤ میں یحیٰی خان نے اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا۔ عوامی لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ جس کے نتیجے میں تین بڑوں (یحیٰی، مجیب، بھٹو) کے درمیان ڈھاکہ میں ناکام مذاکرات ہوئے۔ ۲۶۔۲۵ مارچ کی درمیانی شب فوج نے مشرقی پاکستان کے عوام پر حملہ کر دیا۔ اس موقع پر بھٹو صاحب کا بیان تھا:

''شکر ہے، پاکستان بچ گیا۔''

فوج کشی کے خلاف بنگالی عوام کی جدو جہد کامیاب ہوئی اور ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستانی فوجوں نے، بھارتی کمانڈ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

اس سارے عرصے میں کمیونسٹ پارٹی اور اس کے سیاسی، ثقافتی، ادبی، لیبر، کسان، خواتین اور طلباء محاذوں کے ارکان کو قید و بند یا روپوشی کے اذیت ناک دور سے گزرنا پڑا۔ راقم الحروف کی پنجابی نظم ''سدا جیوے بنگالی دیش'' اس کی گرفتاری کا سبب بنی۔ نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی۔ پارٹی کے تمام محاذوں کو کچل دیا گیا۔ ان سب کا واحد قصور یہ تھا کہ وہ بنگالی عوام کو انتقالِ اقتدار کی منتقلی چاہتے تھے۔ پنجاب سٹوڈنٹس یونین نے لاہور سے ایک پمفلٹ جاری کیا جس میں بنگالی عوام کے قتل عام کی مذمت کی گئی تھی۔ یونین کے کرتا دھرتا گرفتار کر لیے گئے۔ فیض اور جالب نے بنگالی عوام کے حق میں نظمیں لکھیں۔ فیض پر دباؤ بڑھایا گیا کہ وہ لینن امن انعام سے دستبردار ہو جائیں۔ ظاہر ہے، فیض یہ بات قبول نہیں کر سکتے تھے، حبیب جالب نے لکھا:

بگھیا لہو لہان

انہوں نے کئی اور نظمیں بھی لکھیں اور جیل پہنچ گئے۔ پنجاب، سندھ، خیبر پختونخوا اور

بلوچستان میں نیپ اور دیگر پارٹی محاذوں کی تمام قیادت کو یا تو گرفتار کرلیا گیا یا انہیں روپوش ہونا پڑا۔ جام ساقی نے یہ سارا عرصہ روپوشی میں گزارا، بقول فیض:

جنوں میں جتنی بھی گزری، بکار گزری ہے
اگر چہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

جام ساقی نے ''فکر وعمل'' میں ''پاکستان کا قومی مسئلہ'' کے زیرِ عنوان لکھا:

''ایوب خان کا دور ختم ہوا، جنرل یحییٰ سرچشمہء اقتدار پر قابض ہوئے۔ انتخابات ہوئے لیکن اقتدارِاعلیٰ کی منتقلی کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اقتدارِاعلیٰ کی عوامی نمائندوں کو منتقلی میں مشکل یہ تھی کہ حقیقی اقتدارِاعلیٰ امریکہ کے پاس تھا جس کی نمائندگی اور نگرانی کا کام پاکستان کی فوج کے سپرد تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا امریکہ پاکستان پر سے اپنے اقتدارِاعلیٰ سے دست بردار ہوکر اس کے عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیتا؟ جب ایسا دنیا میں کہیں نہیں ہوا تو اس ملک میں کیسے ہوتا۔ انتخابات کے نتائج کو قبول کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ جب بنگال کے عوام نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا تو ان کا قتل عام شروع کر دیا گیا۔ تیس لاکھ معصوم افراد کو شہید کیا گیا۔ دو لاکھ عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ یہ اعداد وشمار آج بھی بین الاقوامی ایجنسیوں کے ریکارڈ پر موجود ہیں اور اس گھناؤنے جرائم کا منہ بولتا ثبوت ہیں جو امریکی سامراج کے ایماء پر عوام دشمن رجعت پرست قوتوں اور فوج نے جمہوریت اور قومی حقوق مانگنے والے بنگال کے عوام کے خلاف کیے۔

فوج کو شکست بنگال کے عوام نے دی۔ لیکن ڈرامہ یہ رچایا گیا کہ ہندوستانی افواج کے ہاتھوں شکست اٹھانی پڑی۔ اس پروپیگنڈہ کا مقصد موجودہ پاکستان کے عوام کو یہ باور کرانا تھا کہ فوج کو شکست دینا عوام کے بس کی بات نہیں بلکہ فوج کو صرف دوسری فوج ہی شکست دے سکتی ہے تاکہ جب کل دوبارہ مارشل لاء لگایا جائے تو عوام اس کے خلاف لڑنے سے گریز کریں۔''

جام ساقی کے بقول بنگالیوں کی بیداری ہمارے حکمرانوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ ان کے خیال میں فوج کا ایک گروپ ایسا تھا، جو طاقت کے وحشیانہ استعمال سے بنگالیوں کو مکمل طور پر کچلنا چاہتا تھا۔ ان میں سے ایک جرنیل ٹکا خان نے کہا تھا کہ انہیں بنگالی نہیں، بلکہ ان کی سرزمین چاہیے۔

ہم نے پوچھا: ''ان دنوں آپ کیا کر رہے تھے؟''

جام کہنے لگے: ''اس وقت میرے پاس پارٹی کا کوئی عہدہ نہیں تھا لیکن میں نے اپنے طور پر سندھ میں مظاہرے کرنے کی کوشش کی۔ جب میں نے اس مقصد کے لیے میٹنگ بلوائی تو اکثر دوستوں نے مجھے اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے سمجھایا کہ ریاست وحشیانہ جبر پر اتر آئی ہے اس لیے اس میں بہت خطرہ ہے۔ میں نے کہا، پارٹی ممبر کے طور پر یہ میرا فرض ہے کہ میں یہ خطرہ مول لوں۔ چنانچہ میں نے اپنی ذمہ داری پر مظاہرہ منظم کیا۔ اس میں میرے ساتھ احسان عظیم، محبوب قریشی، بشیر بحرا اور میری شریک حیات سکھاں شامل تھی۔ ہمارے مظاہرے کی خبر چلی تو مجھے گولی سے اڑا دینے کے احکامات جاری کیے گئے۔ اس وقت جالب کے یہ شعر میری زبان پر تھے۔

محبت گولیوں سے بو رہے ہو

وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو

گماں تم کو، کہ رستہ کٹ رہا ہے

یقیں مجھ کو، کہ منزل کھو رہے ہو''

گولی مارے جانے کے حکم کا سن کر جام ساقی دوبارہ روپوش ہو گئے۔ اس بار انہوں نے ایک مولوی کا روپ دھار لیا۔ وہ فوج کے ہاتھ نہ لگے تو ملٹری سمری کورٹ میں ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔ اور انہیں ایک سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ مسلسل روپوشی کا دور خاصا طویل تھا۔ اسی حالت میں وہ ایک مہم جو کی طرح روپوشی کی زندگی گزارتے رہے۔

اسی روپوشی کے دوران ان کے بارے میں افواہیں پھیلائی گئیں کہ وہ ہندوستان فرار ہو گئے ہیں کیوں کہ ہندوستان سے ان کے بیانات نشر ہوئے تھے۔

مسلسل روپوشی میں ۱۹۷۲ء آ گیا۔ خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں نیپ کی حکومتیں بن چکی تھیں۔ بلوچستان میں جام کے دوست غوث بخش بزنجو گورنر بن چکے تھے۔ اب جام نے روپوشی ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ آریسر والی مسجد میں گئے اور ڈاڑھی وغیرہ صاف کی۔ اس وقت ہوٹل شمریز میں کامریڈ غلام محمد لغاری اور سید باقر علی شاہ نیپ کی طرف سے پریس کانفرنس کر رہے تھے۔ یہ وہاں پہنچ گئے لیکن طلباء اور سیاسی رہنماؤں کی موجودگی میں پولیس انہیں گرفتار کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔

وہاں سے وہ یونیورسٹی کی بس میں بیٹھ کر ہوسٹل گئے۔ رات جلسہ سے خطاب کیا۔ دوسرے دن نواب شاہ چلے گئے۔ جہاں نیپ اور ہاری کمیٹی کا مشترکہ جلسہ ہونا تھا۔ ان کی شرکت نیپ اور مزدور محاذ کی طرف سے تھی۔ ابھی انہوں نے بولنا شروع ہی کیا تھا کہ پولیس نے، جو اس بار پوری تیاری کر کے آئی تھی۔ انہیں دھر لیا۔ یحییٰ خان کی مارشل لاء حکومت نے ان کے وارنٹ جاری کر رکھے تھے لیکن پیپلز پارٹی کی سویلین مارشل لاء حکومت کی پولیس انہیں گرفتار کیے بغیر نہ رہ سکی۔

گرفتاری کے بعد جام کو سٹی تھانہ لے جایا گیا۔ وہاں نہ تو مارشل لاء کی دی گئی سزا پر عمل درآمد شروع ہوا اور نہ ان سے کسی کو ملنے کی اجازت تھی۔ جام ساقی نے اس کے خلاف احتجاجاً بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ یہ بھوک ہڑتال بارہ روز تک چلی۔ حالت خراب ہو جانے پر انہیں ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ حکومت انہیں رہا کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتی تھی۔ سندھ کا وزیر اعلیٰ ممتاز علی بھٹو جو بھٹو صاحب کا "ٹیلنٹڈ کزن" تھا اپنے شکار کو کیسے جانے دیتا۔ اس کے حکم سے جام کو ملتان جیل بھیج دیا گیا۔ ساتھ ہی وزیر اعلیٰ کا خط بھی گیا کہ اسے 'بی' میں نہیں 'سی' کلاس میں رکھا جائے۔ جیل حکام کو مزید شہ مل گئی اور جام پر کافی سختیاں بڑھا دی گئیں۔ یہی نہیں بھٹو کے ایک اور شیر گورنر پنجاب، غلام مصطفیٰ کھر نے جیل میں فوجیوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی جو ہر وقت اس بات پر نظر رکھتی کہ جام سے کون ملنے آتا ہے اسے کن کے خط آتے ہیں، یہ کن کو خط لکھتا ہے۔ یہ چھان بین کا سلسلہ جام کی سزا پوری ہونے تک چلتا رہا۔ بقول جام ساقی، ممتاز بھٹو اور کھر، بھٹو صاحب کی آستین کا سانپ تھے جنہوں نے انہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچایا۔ ملتان میں نیپ کے جنرل سیکریٹری سید قسور گردیزی جیل میں ان کی خبر گیری کرتے رہے۔ جب سزا پوری ہوئی تو قسور گردیزی جیل کے گیٹ پر موجود تھے۔ وہ جام کو لے کر سیدھے ایئر پورٹ گئے، اور اپنے بیٹے کے نام پر ٹکٹ لے کر انہیں کوئٹہ کی فلائٹ پر بٹھا دیا۔ قسور گردیزی کہنے لگے، "وہاں ہماری حکومت ہے، اس وقت کوئٹہ ہی آپ کے لیے محفوظ جگہ ہے۔ ہم کسی اور پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔"

کوئٹہ پہنچ کر جام سیدھے گورنر ہاؤس چلے گئے۔ وہاں گارڈ نے انہیں اندر جانے سے روک دیا۔ اتنی دیر میں وہاں بسم اللہ کرار آئے اور گارڈ سے کہنے لگے کہ ان جیسے لوگوں کو کیوں روکتے ہو۔ یہی تو وہ لوگ ہیں، جس کا میر صاحب انتظار کرتے ہیں۔ میر غوث بخش بزنجو سے جام کی تفصیلی

ملاقات ہوئی۔ رات گئے، انہیں بھٹو صاحب کا فون آیا۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ جام ساقی رِہا ہو کر بلوچستان گئے ہیں اور بزنجو صاحب کے مہمان ہیں۔ بھٹو کہنے لگے:

''کامریڈ سے کہیں، تم ہمیں بھول جاؤ، ہم تمہیں بھول جاتے ہیں بھٹو صاحب کا اشارہ جام کی سیاسی سرگرمیوں کی طرف تھا میر صاحب سے بھٹو کا پیغام سن کر جام بولے:

''بھٹو صاحب سے کہیے گا، بھول جانے سے یاد رکھنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔''

۱۹۷۲ء کے اواخر میں نئے آئین کی منظوری کے معاہدے پر بحث ہوئی تھی جسے کمیونسٹ پارٹی نے اس بنیاد پر رد کر دیا تھا کہ اس میں مذہبیت زیادہ اور صوبائی خودمختاری کم ہے۔ بزنجو صاحب کا خیال تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کے اس عمل سے قید و بند کا دور دوبارہ شروع ہو جائے گا۔

جام نے ہمیں بتایا:

''قید و بند سے ہمیں گریز نہ تھا۔ اس پر نیپ کے اور ہمارے درمیان اختلافات شروع ہو گئے۔ اس کے بعد مجھے دوبارہ رُوپوش ہونا پڑا۔ انہی دنوں محمود علی قصوری نے ولی خان کو بتایا کہ کچھ خفیہ پیپرز بھٹو صاحب کے ہاتھ لگے ہیں جن کے مطابق منصوبہ یہ تھا کہ جام ساقی کو انڈین آرمی کی وردی پہنا کر گولی ماردی جائے اور یہ ظاہر کیا جائے کہ وہ انڈین آرمی کے ساتھ مل کر پاکستان پر حملہ کرنے والا تھا۔''

باب 3

صلیبیں میرے دریچے کی

دوبارہ روپوشی کا دو رکئی سال چلا، یہاں تک کہ جام ساقی کو ضیا مارشل لاء کے دوران ۱۹۷۸ء میں گرفتار کر لیا گیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ان کی روپوشی کے دوران ہر طرف یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ جام ساقی غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے ہندوستان چلے گئے ہیں اور یہ کہ غیر ملکی اخبارات میں پاکستان کے خلاف ان کے بیانات چھپے ہیں۔ جہاں تک جام ساقی کے ہندوستان چلے جانے کا تعلق ہے، انہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اوّل تو جام ساقی سیاست اپنے عوام اپنے وطن کی بھلائی کے لیے کر رہے تھے اور جو شخص اپنے وطن اور عوام کے لیے سیاست کرتا ہے وہ وطن کی سرزمین میں اپنے عوام کے سامنے جان دینا پسند کرتا ہے، وطن چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ پھر ایسے شخص کے لیے جو عوام کے لیے سیاست کرتا ہے، عوام کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں اور عوام کے لاکھوں کروڑوں گھر اس کے اپنے گھر ہوتے ہیں جب کہ عوام دشمن اور مفاد پرست سیاستدان جو اونچی دیواروں اور فصیلوں سے گھرے ہوئے محلات میں بیٹھ کر عوام کے خلاف سازشیں کرتے ہیں، ان فصیلوں سے باہر نکلتے ہی اپنے لیے زمین تنگ محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جام کو بھی اپنا جیسا سمجھ کر بات کرتے ہیں اور الزام تراشی پر اتر آتے ہیں۔

رہا سوال جام ساقی کے بیان کی غیر ملکی اخبارات میں اشاعت اور ریڈیو سے نشر ہونا، موجودہ زمانے میں یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ جب کہ ہر ملک میں دنیا بھر کی خبر رساں ایجنسیوں اور اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمائندے موجود ہوتے ہیں اور اس وقت بھی پاکستان میں یہ

نمائندے موجود تھے اور آج بھی ہیں۔ اسی لیے ایک ایسے بیان کا جو اخبارات کو جاری کیا گیا ہو غیر ملکی اخبارات میں چھپنا اور ریڈیو سے نشر ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ یہ بات وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو جام ساقی کے خلاف اس مہم کے خالق ہیں مگر جب یہ تہیہ کرلیا گیا ہو کہ ''جھوٹ اس کثرت اور ڈھٹائی سے بولا جائے کہ سچ لگنے لگے'' تو کوئی منطق اور دلیل کام نہیں آسکتی ہے۔

جام ساقی کے خلاف پروپیگنڈے کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اپنی روپوشی کے دوران کئی بار جام ساقی میر رسول بخش تالپور کے ہاں گئے ہیں اور ان سے متعدد بار ملاقاتیں کیں ہیں اس بات کا انکشاف اپنی گرفتاری سے تھوڑی دیر قبل جام ساقی نے اپنی سکھر کی پریس کانفرنس میں کیا تھا اور یہ بات ڈاکٹر اعزاز نظیر نے بھی ایک جلسے میں دہرائی تھی۔ اگر ہندوستانی ریڈیو سے کسی کا بیان نشر ہونا ہی اس کے ہندوستان جانے کی دلیل ہے تو یہ بات جام ساقی تو کیا پاکستان کے ہر سیاسی رہنما کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ جن دنوں کا یہ ذکر ہے۔ ان دنوں جام ساقی سمیت پاکستان کے متعدد معروف سیاسی رہنماؤں کے بیانات اور تقریریں ہندوستان کے اخبارات میں چھپتی رہی تھیں۔ ظاہر ہے، نہ تو وہ تمام سیاستدان اور نہ جام ساقی ہندوستان گئے۔ اس جھوٹے پراپیگنڈے کا مقصد سندھ کے اس مخلص اور فعال سیاسی رہنما کو مسلسل قید و بند میں رکھنے کے جواز کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

قید و بند کی طرح روپوشی بھی کچھ کم اذیت ناک نہیں ہوتی بلکہ جام اور کمیونسٹ پارٹی کے معاملے میں تو یہ کچھ زیادہ ہی اذیت ناک تھی۔ پارٹی رہنماؤں کی گرفتاری کے بہانے وہ بغیر وارنٹ کے ان کے گھروں میں جا گھستی تھی۔ بھٹو صاحب نے دسمبر ۱۹۷۱ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد پولیس کے اختیارات بڑھا دیئے تھے۔ حالاں کہ یہ وہی پولیس تھی جس کی لاٹھیوں کا ذکر وہ اپنی تقریروں میں بار بار کرتے رہے تھے بلکہ ان کے وفاقی وزیر عبدالحفیظ پیرزادہ تو قمیص اٹھا کر کئی بار پیٹھ پر پڑنے والے بید کے نشانات بھی دکھا چکے تھے جس کی تصویریں اس دور کے اخبارات کی فائلوں میں اب بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ پولیس پہلے ہی بے لگام تھی اب نئے اختیارات ملنے پر وہ بلا اجازت کسی کے بھی گھر میں گھس جاتی تھی۔ اس طرح وہ گھروں میں گھس کر خواتین کو پریشان کرنے لگی۔ اس کی بھیانک صورت اس وقت سامنے آئی جب پارٹی مزدور رہنما جاوید شکور کو گرفتار کیا گیا۔ ہوا یہ تھا کہ رات کے ڈیڑھ بجے جاوید شکور کے دروازے پر کسی نے دستک دی تو ان کی اہلیہ

نے دروازہ کھول کر پوچھا کون ہے؟ دروازہ کھلنا تھا کہ پولیس والے انہیں دھکا دے کر گھر میں داخل ہو گئے۔ المناک بات یہ تھی کہ جاوید شکور کی بیوی امید سے تھیں اور یہ ان کا آٹھواں مہینہ تھا جو بچے کے لیے بہت نازک ہوتا ہے ساتویں یا نویں مہینے میں بچہ چوٹ برداشت کر لیتا ہے۔ لیکن آٹھویں مہینے میں چوٹ لگنا بچے کے لیے خطرناک ہوتا ہے۔ لیکن پولیس کو اس سے کیا، اسے تو اپنے اختیارات آزمانے ہوتے ہیں۔ چنانچہ گھر میں گھستے ہی جاوید شکور سے کہا گیا کہ وہ تھانے چلیں۔ اس موقع پر جاوید شکور نے وارنٹ یا سمن دکھانے کا مطالبہ کیا تو پولیس والوں نے انہیں وہیں پیٹنا شروع کیا جب ان کی اہلیہ اپنے شوہر کو بچانے کو لیے آگے بڑھیں تو پولیس نے ان کی بھی بید سے تواضع کی اور جاوید شکور کو گھسیٹتے ہوئے گھر سے باہر لے آئے۔

بلوچستان میں جام ساقی کی روپوشی کا عرصہ مختصر رہا۔ بھٹو نے چند ماہ کے اندر اوائل ۱۹۷۳ء میں نیپ کی صوبائی حکومت کو برطرف کر دیا۔ اس پر خیبر پختونخوا کی حکومت بطور احتجاج خود ہی مستعفی ہو گئی۔ یہ واقعات جام ساقی کے لیے کسی بڑے صدمے سے کم نہ تھے۔ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہونے کے باوجود، وہ بھٹو کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ جب بھٹو نے بلوچستان میں فوج اتار دی تو یہ اس کی خوفناک سیاسی غلطی تھی۔ بقول جام ساقی:

''بعد میں اس نے فوج کو بلوچستان سے نکالنا چاہا لیکن جنرل ضیا ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت بھٹو کو چاہیے تھا کہ وہ عوام سے رجوع کرتے اور بتاتے کہ یہ باسٹرڈ عوام پر تشدد کر رہا ہے۔ حکومت عوام پر تشدد کے خلاف تھی لیکن فوج نے حکومت کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد صاف ظاہر تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔''

بلوچستان کا المیہ بھی جام کی روپوشی کے تمام عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ بنگلہ دیش کے المیے کے بعد بھٹو نے شکست خوردہ فوج کی بحالی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی لیکن فوج نے عوام کے ہاتھوں اپنی شکست سے کچھ سیکھنے کی بجائے اس بار بلوچ عوام پر حملہ کر دیا۔ بھٹو کی یہ تباہ کن سیاسی غلطی تھی۔ جام کے بقول، ''اگر بھٹو، بلوچستان اور خیبر پختونخوا کے خلاف اقدامات نہ کرتے تو انہیں کبھی پھانسی نہیں ہو سکتی تھی۔'' ۱۹۷۲ء میں جام کو بھی انہوں نے فوجی دباؤ کے تحت گرفتار کیا تھا۔ اس کا اعتراف بھٹو صاحب نے ۱۹۷۶ء میں قومی اسمبلی میں اپنی ایک تقریر کے دوران ان لفظوں میں کیا تھا:

''اس بہادر اور ہوشیار لڑکے جام ساقی کو، میں نے آپ لوگوں کی وجہ سے گرفتار کیا تھا۔''

اس بیان پر جماعت اسلامی کے ایک جریدے نے ایک ہفتے کے اندر اندر یہ سرخی جمائی تھی، ''غدارِ وطن کو وزیر اعظم کا قومی اسمبلی میں خراج تحسین۔''

ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ روپوشی کے اس طویل دور میں جام ساقی نے ڈاڑھی بڑھالی تھی اور تبلیغی جماعت والوں کا رنگ ڈھنگ اختیار کر لیا تھا۔ اگر چہ انہیں ۱۹۷۸ء سے پہلے گرفتار نہ کیا جا سکا لیکن کئی مرتبہ ان کا کمیونسٹ دل اور انسان دوستی کے جذبات انہیں گرفتاری کے قریب لے گئے تھے۔ اس عرصے میں راقم الحروف سے بھی ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اسی حلیے میں تھے لیکن انہوں نے ٹوٹے ہوئے چپل پہنے ہوئے تھے۔ میں نے مسکرا کر کہا تھا:

''کامریڈ! احتیاط کریں۔ تبلیغی جماعت والے ٹوٹے ہوئے جوتے نہیں پہنتے۔''

ہم نے خود جام ساقی کی زبانی ایسے کئی واقعات سنے۔ جنہیں یہاں دہرانے کو جی چاہتا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ کچھ یوں تھا:

''ایک دفعہ بس میں، میں نذیر عباسی کے ساتھ جا رہا تھا۔ میں نے ایک بوڑھے کوہلی کو تکلیف کی حالت میں کھڑا دیکھا۔ میں کھڑا ہو گیا اور اسے بیٹھنے کے لیے اپنی جگہ دے دی۔ وہ میری سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جب ہم ٹنڈو اللہ یار پہنچے تو نذیر عباسی بولا:

''کامریڈ! آپ کسی دن مروائیں گے۔ کوئی بھی اصلی مولوی، بوڑھے اور بیمار کوہلی کو اپنی جگہ نہیں دیتا۔ اگر بس میں سی آئی ڈی کا کوئی آدمی ہوتا تو فوراً سمجھ جاتا کہ آپ اصلی مولوی نہیں ہیں۔''

ایک روز کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک بار جام مسجد کے پاس سے گزر رہے تھے، کچھ لوگوں نے ان کو گھیر لیا۔

''مولوی صاحب جنازہ پڑھا دیں۔''

انہیں جنازہ پڑھانا تو آتا نہیں تھا (اس واقعہ کے بعد سیکھ لیا)۔ جام نے ان سے معذرت کی اور کہا کہ وہ بہت جلدی میں ہیں۔ انہیں ایک ضروری کام کے لیے کہیں پہنچنا ہے اس لیے جنازہ پڑھانے کا وقت نہیں ہے۔ یہ کہہ کر جام چل پڑے تو پیچھے سے آوازہ پڑا، ''یہ سالا کسی دعوت پر

جارہا ہوگا۔'' جام کوخوشی ہوئی کہ وہ پہچانے نہیں گئے اور یہ کہ گالی مولوی کو پڑی، انہیں نہیں۔

نواب شاہ کے قریب بروہی نام کے دو گاؤں ہیں ان کی آپس میں لڑائی تھی۔ ایک بار ان میں سے ایک گاؤں میں جام رہ رہے تھے۔ ان میں سے ایک گاؤں نے دوسرے گاؤں کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی تو فریادی گاؤں کے کچھ لوگ جام کے پاس گئے اور انہیں بتایا کہ وہاں کچھ دیر میں پولیس آنے والی ہے۔

''آپ ہماری امانت ہیں۔ جب تک دوسرے گاؤں میں پولیس کارروائی نہیں کر لیتی۔ آپ یہیں پر رکیں۔''

جام کو عطااللہ مینگل اور بلوچستان کے دیگر ساتھیوں نے اس گاؤں میں چھپنے کا مشورہ دیا تھا۔ گاؤں کے لوگ زیادہ باشعور نہیں تھے لیکن انہیں اس بات کی سمجھ تھی کہ بلوچستان کے سردار اور کامریڈ بھی اس شخص کی عزت کرتے ہیں۔

روپوشی کے ان برسوں میں، گاؤں میں اس بات پر کافی تشویش پائی جاتی تھی کہ اگر جام ریاستی اداروں کے ہاتھ لگ گیا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ بات سُکھاں کے لیے کافی پریشانی اور تناؤ کا باعث تھی۔ اس کے نزدیک جام کی گرفتاری کا مطلب تھا، جام کی موت۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اور سکھاں کی ذہنی حالت کے پیش نظر دوستوں کا خیال تھا کہ یا تو سُکھاں کو سیاست میں لایا جائے یا اس کے لیے کسی ملازمت کا بندوبست کیا جائے۔ بعض دوستوں کی یہ بھی رائے تھی کہ اس کا نام سُکھاں سے بدل کر شائستہ رکھ دیا جائے۔ یہ نام دو تین مرتبہ پمفلٹ وغیرہ میں بھی چھپ چکا تھا۔ اس دور کے مشہور سندھی رسالے ''سوہنی'' کے ایڈیٹر طارق اشرف نے جو جام کے قریبی دوست تھے، اپنے رسالے میں انجام کا خیال کیے بغیر یہ لکھ دیا کہ اب کامریڈز کو سندھی نام اچھے نہیں لگتے، اسی لیے سُکھاں کا نام شائستہ ہو گیا ہے۔ اس کا صاف صاف مطلب یہ تھا کہ حکومت مخالف پمفلٹ لکھنے والی شائستہ دراصل سُکھاں ہے۔

اس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی اور اس کے اداروں سے وابستہ خواتین کافی حوصلے اور جرأت سے حالات کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ انجمن جمہوریت پسند خواتین اس جدوجہد میں پیش پیش تھی۔ کراچی سے بیگم ممتاز نورانی اور لاہور سے بیگم طاہرہ مظہر علی اور بیگم نسیم شمیم اشرف سیاسی شعور

سے لیس تھیں۔ اندرون سندھ سے زبیدہ گھانگھرو، حمیدہ گھانگھرو، نسیم تھیبو اور سندھیانی تحریک سے وابستہ خواتین کافی فعال تھیں اور سیاسی ظلم و جبر کا مقابلہ بڑی بہادری اور حوصلہ سے کر رہی تھیں۔ سُکھاں بھی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھی لیکن جام کی محبت میں وہ اس سے محرومی کے خوف میں مبتلا ہوگئی تھی۔

جام کی روپوشی جاری رہی۔ ایک بار وہ اپنے دوست منصور عباسی کی معرفت بدین کے قریب ایک گاؤں میں آبپاشی گھر میں رہے۔ گاؤں کی آبادی زیادہ تر مچھلی کے کاروبار سے وابستہ تھی۔ جام کو بھی اکثر مچھلی ہی کھانے کو ملتی۔ منصور نے وہاں کام کرنے والوں کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ کسی کو جام کے یہاں ہونے کا شک یہاں کے رہنے والوں کو بھی نہ ہونے پائے، سختی سے دیئے گئے اس حکم نے ایک ملازم کو پریشان کر دیا۔ ایک دن وہ جام سے کہنے لگا۔

''کیا آپ نے قتل سے بھی کوئی بڑا جرم کیا ہے جو ہمارے صاحب اتنے پریشان ہیں؟''

جام کو لگا کہ اس سے سچی بات کرنی چاہیے۔ جام بولے، ''پاکستانی فوج اور انتہا پسندوں نے بنگلہ دیش میں لاکھوں لوگوں کا خون بہایا ہے۔ میں نے اس عمل کی مذمت کی ہے، اس لیے وہ میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔''

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ کہنے لگا، ''لیکن آپ نے تو صحیح بات کی ہے۔ پھر سرکار کیوں ناراض ہوتی ہے؟''

جام نے کہا، ''فوج کی سوچ ابھی آپ جتنی نہیں ہوئی۔''

اس پر راقم الحروف کو اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ احمد سلیم کو بھی ۱۹۷۱ء میں بنگالیوں کی حمایت میں گرفتار کیا گیا تھا۔ پولیس جب احمد سلیم کو پکڑ کر لے گئی تو اس کی تین چار سال کی بھانجی نے اپنی ماں سے پوچھا، ''ماموں کو کیوں لے گئے ہیں؟'' اس کی ماں نے جواب دیا، ''تمہارے ماموں نے یحییٰ کے خلاف ایک نظم لکھی ہے۔ اس لیے پولیس انہیں پکڑ کر لے گئی ہے۔''

وہ بچی، جو غالباً یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ یحییٰ کون ہے اور نظم کیا ہوتی ہے۔ معصومیت سے بولی، ''یحییٰ خان بھی ماموں کے خلاف نظم لکھ لے، وہ انہیں پکڑ کر کیوں لے گیا ہے۔''

بچی کی ماں بولی: ''بیٹا، اگر یحییٰ خان نظم لکھ سکتا تو اتنا خون خرابہ کیوں ہوتا؟''

آبپاشی گھر کے کس بنگلہ میں جام ساقی ٹھہرے ہوئے تھے، اسی بنگلہ میں دو افسران بھی آ کر ٹھہرے۔ ایک دن وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ جام ساقی بھی غدار نکلا۔ جام سے رہا نہ گیا۔ وہ ان کے قریب گئے اور پوچھنے لگے، ''وہ کیسے غدار نکلا؟''

ان میں سے ایک بولا، ''اس نے انڈیا میں بیٹھ کر پاکستان کے خلاف تقریر کی ہے۔''

جام پوچھنے لگے، ''آپ نے وہ تقریر خود سنی ہے؟''

''ہاں، میں نے خود آل انڈیا ریڈیو سے اسے پاک فوج کی مذمت کرتے ہوئے سنا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ جام کو گھورنے لگا۔

اس پر جام بولے: ''ایک بار میں نے بھی اسے دیکھا تھا۔''

وہ بولا، ''پھر؟''

''دیکھتے ہی وہ مجھے غدار لگا۔''

جام ساقی یہ واقعہ سنانے کے بعد کہنے لگے، ''خود کو غدار کہنے کا یہ ایک عجیب سا تجربہ تھا۔''

روپوشی ہی کے دوران کسی دوست نے جام سے کہا، ''مور شنکر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

جام کے بقول، ''وہ بابا کے پرانے دوست اور پرانے کانگرسی تھے۔''

اس لیے جام نے ان سے ملنا مناسب سمجھا۔ ملاقات پر وہ کہنے لگے: ''انڈیا سے آپ کے لیے پیغام آیا ہے کہ اگر آپ کو پیسے یا سامان وغیرہ کی ضرورت ہو تو ہمیں بتائیں؟''

جام نے ان سے کہا، ''انڈیا کے پیغام کو چھوڑیں یہ بتائیں، آپ پارٹی کے لیے سو پچاس روپے کا فنڈ دینا پسند کریں گے۔ اگر آپ ایسا کریں تو بڑی عنایت ہوگی۔''

جام کی بات سن کر وہ حیران رہ گئے اور پھر بولے: ''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

اس پر جام بولے: ''بابا! بیرون ملک سے پیسے اس وقت اچھے لگتے ہیں، جب آپ گوریلا جنگ کی حالت میں ہوں یا پھر آپ کا تعلق حکومت سے ہو۔ میں ایک سیاسی کارکن ہوں، کسی ملک کا جاسوس نہیں۔ یہ میرے منصب کے خلاف ہے۔''

گرفتاری سے پہلے، روپوشی کا آخری سال کافی ہنگامہ خیز تھا۔ سیاست میں فعال بھی رہنا

تھا، سیاست سے بھی بچنا تھا اور سماجی تعلقات بھی بنانے تھے۔ سب سے ہنگامہ خیز واقعات پٹ فیڈر کی تحریک سے جڑے ہوئے تھے۔ روپوشی کے باعث جام ساقی براہِ راست تحریک میں شامل نہیں تھے لیکن کمیونسٹ پارٹی اور جام ساقی کی پوری تائید وحمایت اس تحریک کو حاصل تھی۔ اس تحریک کے روحِ رواں کامریڈ محمد رمضان نے ''پٹ فیڈر کسان تحریک'' کے موضوع پر ایک تفصیلی کتاب لکھی ہے جس میں انہوں نے پٹ فیڈر سے آباد ہونے والی زمینوں، وہاں کے کسانوں کی کشمکش، ۱۹۷۲ء کی زرعی اصلاحات، پٹ فیڈر کسان تحریک کے سیاسی پس منظر، کسانوں کی دوسری اور تیسری کشمکش، پانچ کسانوں کی شہادت، کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی حکمت عملی، پٹ فیڈر جانے والے تین وفود، ان کی گرفتاریوں اور تحریک میں شامل ساتھیوں کے انٹرویوز اور اخباری تراشوں پر مشتمل تفصیلات شامل ہیں۔ کامریڈ رمضان کے لفظوں میں:

''کسان تحریک کو مقبول بنانے والے، کسانوں کے قاتلوں کی گرفتاریاں اور گرفتار شدہ رہنماؤں کی رہائی کے لیے آواز بلند کرنے والے ساتھی بہت اہم تھے، جن میں کامریڈ جام ساقی، ڈاکٹر اعزاز نذیر، چاچا مولا بخش، جاوید شکور، زبیر الرحمٰن، علی اصغر عیسیٰ خیلوی، عزیز الرحمٰن، شمیم واسطی، افراسیاب خٹک، ڈاکٹر محمد تاج اور کامریڈ نذیر عباسی جیسے مشہور رہنما تھے تو ساتھ ہی روپوش رہ کر کام کرنے والے حسن رفیق، محمد فصیح بھائی، پروفیسر جمال نقوی، تنویر شیخ اور کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری امام علی نازش جیسے ساتھی بھی تھے۔

پٹ فیڈر کسان تحریک میں مچھ جیل آنے والی دو لڑکیوں کی جدوجہد اور قربانی بہت اہم تھی مگر اس کے ساتھ وہ کردار بھی اہم تھے جنہوں نے ان کو قربانی کے اس سفر پر تیار کر کے روانہ کیا۔ ایک سال سے کم عرصے کی دلہن آصفہ رضوی کے شوہر فیصل آباد میں پیدا ہونے والے میرے ساتھی تنویر شیخ اور ایک ماہ سے بھی کم عرصے کی دلہن حمیدہ گھانگرو کے شوہر ٹنڈو اللہ یار میں پیدا ہونے والے شہید نذیر عباسی جن کی رہنمائی، مدد اور کردار کو سمجھے اور شمار کیے بغیر پٹ فیڈر کسان تحریک کی کامیابیاں سمجھ میں نہیں آسکیں گی۔ کامریڈ نذیر عباسی کو جنرل ضیاالحق کی فوجی آمریت میں ISI کے ٹارچر سیل میں تشدد کے ذریعے ۹ اگست ۱۹۸۰ء کے دن شہید کر دیا گیا۔ آج کے دور کی کسان تحریک میں ایسی قربانیاں دینے والے پُرعزم رہنما اور ساتھی کہاں سے آئیں گے۔ کیا ایسے رہنما اور سیاسی

کارکن اس دور کی کسان تحریک کو مل سکیں گے؟''

دل گرما دینے والی اس جدوجہد میں آصفہ اور حمیدہ کا کردار بطور خاص اہم تھا۔ جام انڈر گراؤنڈ رہ کر بھی پارٹی اور ساتھیوں کے مسائل سے لاتعلق نہیں تھے۔ ۱۹۷۸ء میں ڈیڑھ سال قید میں رہنے کے بعد نذیر حیدرآباد جیل سے رہا ہوا۔ حمیدہ کی محبت میں اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ حمیدہ اور نذیر کی باہمی پسندیدگی کا تعلق اس وقت استوار ہوا، جب وہ جیل سے رہا ہوا۔ جلد ہی دوبارہ اس کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ روپوشی کی حالت میں اپنی دمکتی آنکھوں کے ساتھ وہ اپنے روپوش رہنما جام ساقی سے ملا اور اس کے آگے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ جام کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ نذیر اور حمیدہ دونوں ہی ان کے جگر گوشے تھے۔ چند دنوں بعد کامریڈ جام ساقی، حمیدہ کے والد ہاشم گھانگھرو سے ملے۔ انہیں بھی کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ چنانچہ فروری ۱۹۷۸ء کے پہلے ہفتے میں ان کی شادی طے ہوگئی اور وہ شادی سے صرف ایک رات پہلے چھپتا چھپاتا محراب پور پہنچا۔ حمیدہ نے بعد میں اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھا کہ یہ شادی کم اور پارٹی کانفرنس زیادہ لگ رہی تھی۔ اسی روز دوسری بہن زبیدہ کی شادی بھی انجام پائی۔

یہ سندھ اور بلوچستان کے انتہائی ہنگامہ خیز دن تھے۔ پٹ فیڈر کے کسانوں پر ظلم وستم کا سلسلہ دراز ہوا تو حمیدہ اور پارٹی کے کئی ساتھی اس کے خلاف احتجاج میں پیش پیش تھے۔ شادی کے ایک ماہ بعد جامشورو میں ۴ مارچ طلباء تحریک کا دن بڑے جوش وخروش سے منایا گیا۔ سندھ این ایس ایف، پی ایس او اور جیئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن نے خطاب کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جلسے کی صدارت کامریڈ جام ساقی کی تصویر نے کی۔

کامریڈ رمضان کے مطابق اسی رات بارہ بجے آصفہ رضوی، حمیدہ اور تین دوسرے ساتھی بذریعہ خیبر میل، حیدرآباد سے پٹ فیڈر کے لیے روانہ ہوئے۔ ذوالفقار علی بھٹو جب سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے تو مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۷ کے تحت پٹ فیڈر کے کسانوں کو زمینیں الاٹ کی گئی تھیں۔ ضیا مارشل لاء نے اس حکم کو منسوخ کر دیا جسے بھٹو دور کی اسمبلی نے آئینی تحفظ دیا ہوا تھا۔ منسوخی کے بعد زمینداروں نے زمینیں ہتھیانے کے لیے کسانوں پر چڑھائی کر دی۔ وسط دسمبر ۱۹۷۷ء میں رئیس تاج محمد خان جمالی نے مسلح آدمیوں کے دو ٹرک اور ایک ٹریکٹر ٹرالی کے ساتھ

پہلے غیر بلوچ کسانوں پر یلغار کی تا کہ انہیں بھگانے کے بعد بلوچ کسانوں سے نمٹا جا سکے۔ مقصد یہ تھا کہ بلوچ اور غیر بلوچ کسان متحد نہ ہونے پائیں۔ کسانوں نے رات بھر مزاحمت کی اور وڈیرے کو پسپا ہونا پڑا۔ ۲۳ دسمبر کو مسلح زمینداروں نے پھر کسانوں پر حملہ کیا جس میں سات کسان شہید ہو گئے اسی پس منظر میں مارچ ۱۹۷۸ء میں حمیدہ سمیت پارٹی کے پانچ ساتھی ایک وفد کی صورت میں بلوچستان روانہ ہوئے۔ کامریڈ شمیم واسطی اور نذیر نے انہیں حیدرآباد سٹیشن سے رخصت کیا۔ شہید آباد میں یہ سب ساتھی بھوک ہڑتال پر بیٹھے لیکن جلد ہی انہیں گرفتار کر کے مچھ جیل منتقل کر دیا گیا۔ حمیدہ اور دوسرے ساتھی وہاں سے نکلے تو جیسے ایک اور یونیورسٹی گریجویٹ بن کے نکلے ہوں۔

لیکن یہ کہانی آصفہ اور حمیدہ سے کیوں نہ سنیں جسے کامریڈ رمضان نے اپنی کتاب میں شامل کر لیا تھا۔ آصفہ لکھتی ہیں:

''پارٹی نے فیصلہ کیا تھا کہ سندھ کے ساتھیوں کا پہلا گروپ گرفتار ہو چکا ہے اس لیے دوسرا وفد جا کر اس تحریک کو آگے بڑھائے گا اور ہاریوں کے لیے احتجاج کو جاری رکھے گا۔ میں کراچی سے الطاف الرحمٰن کے ساتھ نکلی۔ حیدرآباد سے حمیدہ گھانگرو، محمد سلیم اور شہاب الدین گاڑی کھاتہ آفس حیدرآباد میں ملے، وہاں نذیر، سہیل سانگی، امداد چانڈیو، سرفراز میمن، رفیق پٹیل، قلندر بخش مہر، صالح بلو، ایوب لغاری، زاہد مخدوم، حمیدہ کی بہنیں، اسرار اور چاچا مولا بخش موجود تھے، وہاں ہماری مختصر میٹنگ ہوئی۔ یہ لوگ ہمیں کوٹری سٹیشن تک چھوڑنے آئے، میری شادی ہو چکی تھی۔ حمیدہ کی شادی کو ابھی کچھ دن ہوئے تھے، ٹرین سے ہم جیکب آباد پہنچے ہم بغیر ٹکٹ کے سفر کر رہے تھے۔ .T.T سے لڑ جھگڑ کر ہم نے سفر کیا تھا، جیکب آباد پہنچ کر امداد اوڈھو کے گھر کھانا کھایا۔ پھر پٹ فیڈر پیر بخش سامت کے گھر گئے، وہاں سے اس جگہ گئے جہاں کسانوں پر تشدد ہوا تھا، پانچ کسان قتل ہو چکے تھے۔

لہڑیوں کے گاؤں میں ہم میر گل موسیانی کے گھر گئے، وہاں ہم نے عورتوں سے ملاقات کی انہوں نے ہمیں وہ جگہ بتائی جہاں کسانوں کا خون بہایا گیا تھا اور جہاں لاشیں گری تھیں۔ ہم وہاں پر بھی گئے جہاں لڑائی ہوئی تھی۔ میر گل موسیانی کے گاؤں میں حمیدہ اور مجھے گھوڑے پر بٹھا کر مختلف علاقوں کا دورہ کروایا گیا۔ ہم لہڑی شہیدوں کے گاؤں میں شہیدوں کے گھروں میں گئے۔

جب ہماری گرفتاری ہوئی تو BSO کے لوگوں نے احتجاج کیا۔ایک ہندو ڈاکٹر نے میٹنگ کا بندوبست کیا وہاں کے کسانوں سے شیر محمد مینگل نے صورتِ حال کے حوالے سے بات کی اور انہیں بتایا کہ یہ لوگ کراچی سے آئے ہیں۔ میں نے اور حمیدہ نے وہاں کی عورتوں سے بات کی، ہم نے تقریباً چار دن وہاں کا دورہ کیا۔کسانوں نے باجرے کی روٹی اور گڑ دیا مرچیں کوٹ کر روٹی سے بھی کھائیں، رات کو ایک جھونپڑی میں رہے پھر ہمیں ایک بیٹھک میں ٹھہرایا گیا، مکھن، کالے تل اور سفید تل ناشتے میں دیئے گئے، تل ہمیں سفر کے دوران کھانے کے لیے بھی دیئے گئے۔

دورے کے دوران ایک جلسہ کیا اور احتجاج کیا، کسانوں کے حق کے لیے مطالبہ کیا کہ اگر ہمارے ساتھیوں کو نہیں چھوڑا گیا اور ہاریوں کے مطالبات نہیں مانے گئے تو ہم بھوک ہڑتال کریں گے۔ہم اس دوران پیر بخش سامت کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔وہاں لیویز نے گھیراؤ کرنا شروع کیا۔ساتھیوں نے ہمیں وہاں سے نکالا۔اس کے بعد ہم نے ٹیمپل ڈیرہ کے بس سٹاپ پر چادر بچھا کر بھوک ہڑتال شروع کی۔ چاروں طرف لیویز کے سپاہی تھے۔

ہم نے تقریریں کیں اور نعرے لگائے ہمیں دھمکیاں دی گئیں کہ تم لوگ مارے جاؤ گے۔وڈیرے کی نجی جیلیں ہیں جہاں تم لوگوں کو غائب کر دیں گے۔تحصیلدار کے ساتھ ایک بندہ تھا جو ہمیں الگ سمجھاتا تھا اور انتظامیہ کو سارے پیغامات بھی پہنچاتا تھا۔

ہم نے صبح گیارہ بجے بھوک ہڑتال شروع کی۔ پانچ بجے ہمیں گرفتار کر لیا گیا، ہمیں جیپ میں بٹھایا اور ڈائریکٹ مچھ جیل لے گئے۔ مچھ جیل میں الطاف اور سلیم کو جوتے اتروا کر کونے میں منہ کر کے کھڑا ہونے کا حکم دیا اور ان پر تشدد کیا۔ میں نے بات کی کہ لڑکوں پر تشدد کیوں کیا جا رہا ہے۔میں غصہ میں چلائی اور کہا کہ ہم سیاسی لوگ ہیں، ہمارے ساتھ اس طرح کا سلوک کیوں کر رہے ہو؟ اتنے میں راجا صاحب آئے۔ ان کو بتایا تو انہوں نے ہمیں اندر بھجوایا۔ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ یعقوب بھی آئے۔

میں جیل سے تمام ساتھیوں کو خط لکھ کر لمحہ لمحہ کی خبریں دیتی تھی، ہمارے خط سنسر ہوتے تھے، مچھ جیل کے صوبیدار کا نام بہادر تھا جو ایک ہمدرد انسان تھا۔

کامریڈ رمضان نے پیغام بھجوایا تھا کہ یکم مئی کے بینر کے لیے سرخ کپڑا چاہیے۔اگر

آپ لوگوں کے پاس سرخ دوپٹہ ہو تو بھجوادیں۔ ہم نے سرخ کپڑے کا بندوبست کیا، میں نے اور حمیدہ نے سویاں پکائیں اور پلیٹ کو سرخ کپڑے میں ڈھک کر سپاہی سے کہا کہ ہمارے ساتھیوں کو لے جا کر دے دو۔

جیل میں ہمیں عورتوں کے وارڈ میں رکھا گیا۔ وہاں عورتیں بہت بری طرح رہ رہی تھیں، کم جگہ میں زیادہ عورتیں تھیں۔ اس میں طوائفیں بھی تھیں، ہمیں دوسری جگہ ان کے سامنے والی کوٹھڑی میں شفٹ کیا گیا، پہلے دن ہم سے بھی ڈبہ اٹھوا کر کیاری میں کام کروایا گیا۔ دوسرے دن B کلاس دی گئی۔ جب ہمیں تاریخ پر لے جایا جاتا تھا تو مردوں کو ہتھکڑی لگی ہوئی ہوتی تھی۔ ہمیں ریل گاڑی میں لے جایا جاتا تھا۔ عورتوں کو الگ بٹھاتے تھے۔ BSO کا ایک لڑکا ہر پیشی میں ہمارے ساتھ ہوتا تھا۔ اس کے پاس سرکاری جیپ تھی۔ ہماری تین پیشیاں ہوئی تھیں۔

ہمیں سرخ پرچم بھی ملتا تھا جو ہم ساتھیوں کو دیتے تھے۔ ہم نے جیل میں افغان انقلاب کا جشن منایا تھا۔ ہمارے پاس جیل میں کپڑے نہیں تھے۔ ہمیں بولان میڈیکل کالج کے لڑکوں نے کپڑے لا کر دیئے۔

مچھ جیل میں ایک میجر افضال ہمارے پاس آ کر سمجھاتا تھا کہ ہم معافی نامہ لکھ کر دیں۔ دو لڑکیاں بھی ہمارے پاس سمجھانے باہر سے آئی تھیں لیکن ہم ان کو منع کرتے تھے، لاک اپ میں مچھر موجود تھے۔ رات کو جب ہمیں مچھر تنگ کرتے تھے، میں اور حمیدہ بیٹھ کر گانے بھی گاتے تھے اور میں رات کو خط بھی لکھتی تھی۔ پیشی پر ہمیں مچھ جیل سے کورٹ لے جایا گیا اور وہاں سے ریلیز کر کے ہمیں کراچی روانہ کیا گیا۔ ہم دو مہینے دس دن جیل میں رہے۔

رہائی کے بعد اچانک کراچی آئے۔ گھر میں داخل ہوئے تو ابا (سید ظفر حسین رضوی جو خود بھی ایک ٹریڈ یونین رہنما رہ چکے تھے) نے پوچھا ہاتھ کٹوا کر تو نہیں آئی؟ یعنی معافی تو نہیں مانگی۔ رہائی کے بعد کورنگی میں رابطہ کمیٹی نے استقبالیہ دیا، اس میں مزدور یونینیں بھی شامل تھیں، علی اصغر عیسیٰ خیلوی، فضل الرحمٰن، اقبال بھائی، خالد وغیرہ شامل تھے، اس کے بعد صحافیوں کی تحریک میں گرفتار ہوئے۔ اس ساری جدوجہد کے تصور سے آج بھی تقویت ملتی ہے۔''

اب حمیدہ گھانگھرو کی کہانی سنتے ہیں۔ نذیر عباسی سے محض دو تین ہفتے قبل اس کی شادی

ہوئی تھی۔

''۴ مارچ ۱۹۷۸ء کو سندھ یونیورسٹی میں طلبہ تحریک کے حوالے سے پروگرام کرنے کے بعد ٹریڈ یونین آفس گاڑی کھاتہ حیدرآباد میں پہنچے جہاں جبار خٹک اور آصفہ رضوی بیٹھے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آصفہ اور حیدر کو دوسرے ساتھیوں کے ساتھ پٹ فیڈر بلوچستان بھوک ہڑتال کے لیے جانا ہوگا۔ میں نے اپنا کچھ سامان لیا اور ہم کوٹری سے ٹرین میں سوار ہو گئے۔ ہمارا پانچ ساتھیوں پر مشتمل وفد جیکب آباد پہنچا۔ اس کے بعد ہم بس میں پٹ فیڈر کے شہیدوں کے گاؤں گئے، وہاں لوگوں کی کیفیت بہت تکلیف دہ تھی۔ ہاریوں سے بات چیت کرتے ہوئے کافی رات ہوگئی، میں اور آصفہ ایک چارپائی پر سو گئے۔ صبح ناشتہ آیا جس میں تل بھی موجود تھے۔ آصفہ نے مجھ سے پوچھا کہ یہ تل کیوں لے کر آئے ہیں۔ ایک ہاری نے بتایا، یہ آپ کے راستے کے کھانے میں کام آئیں گے۔ رات ہماری نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ تنکوں کی جھونپڑی میں مسلسل سرسراہٹ کی آوازیں آرہی تھیں جس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ کوئی سانپ ان تنکوں میں موجود ہے۔ لیکن صبح ہمیں بتایا گیا کہ ہوا جھونپڑی سے ٹکرا رہی تھی اس کی وجہ سے یہ آواز آرہی تھی۔

یہ پورا علاقہ لڑائی کے دوران میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ ہم جب شہید ہونے والوں کے گھر میں گئے تو عورتوں نے بتایا ہم نے دو دن جمالیوں سے مقابلہ کیا ہے۔ ہم لوگ بھوکے پیاسے گھر میں بند تھے۔ ہمارے مرد باہر لڑائی لڑ رہے تھے۔ ایک عورت جس کی کیفیت بالکل پاگلوں جیسی تھی، اس کے گھر کے چار لوگ شہید ہوئے تھے۔ ہماری موجودگی میں عورتیں اپنے شہیدوں کو یاد کر کے رو رہی تھیں۔ بچوں میں بہت خوف تھا۔ وہ کسی بھی گاڑی کو آتا دیکھتے تو دوڑ کر اپنی جھونپڑیوں میں چھپ جاتے تھے۔ ایک عورت نے بتایا کہ ابھی تک کافی لوگ گرفتار ہیں۔ عورتیں جمالی جاگیرداروں کے ظلم کی مختلف داستانیں سناتی رہیں۔ ہم نے انہیں یقین دلایا کہ جب تک آپ لوگوں کو انصاف نہیں ملے گا ہماری جنگ جاری رہے گی، ہم لوگ شہیدوں کے گاؤں سے ٹمپل ڈیرو آئے۔ میں اور آصفہ رضوی پیر بخش سامت کے گھر رہے۔ ہماری کوشش تھی کہ ۱۲ مارچ کی بھوک ہڑتال کے پروگرام کو کامیاب بنائیں۔ ہم لوگوں نے اس کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ ایک بچہ کوئٹہ ہائی سکول میں پڑھتا تھا جو میرے پاس آیا اور کہا کہ بھوک ہڑتالیوں میں میرا نام بھی لکھیں۔ میں اس

بچے کو بڑے فخر سے دیکھنے لگی۔

کسانوں کے مقامی رہنما شیر محمد مینگل نے کہا، مجھے ڈی سی نے بلایا ہے کیا پتا مجھے گرفتار کرلیا جائے۔ ہم نے کہا، اس طرح گرفتاری ٹھیک نہیں ہے، ہم سب ساتھ ہیں بلوچ کسانوں اور عوام کی جدو جہد ہماری جدو جہد ہے اور ہماری جدو جہد طبقاتی جدوجہد ہے۔ وہ سب نظریاتی جدوجہد کررہے ہیں کسی لمحے بھی کمزور نہیں ہونا چاہیے۔

۱۲ مارچ ۱۹۷۸ء کی صبح ڈی سی نے شیر محمد مینگل کو بلایا، پورے شہر میں پولیس کا گشت تھا۔ ہم لوگ بھوک ہڑتالی کیمپ کی طرف جارہے تھے۔ تحصیلدار نے ہمیں آواز دی اور کہا، تم لوگ جو کررہے ہو، ہمیں پل پل کی خبر ہے۔ جو بھی کیمپ کی طرف جائے گا اس کے اوپر گولیاں چلائیں گے۔ پولیس نے لاٹھی چارج شروع کردیا۔ اس ساری صورت حال میں کوئی بھی نہیں گھبرایا۔ وہاں کے دکان داروں کو پولیس والوں نے ہراساں کیا اور ان سے کہا کہ دکان کے سامنے کسی کو کھڑا نہ ہونے دیں۔ سکول کے بچے ہمارے ساتھ کھڑے ہو کر نعرے لگانے لگے، ہمیں گرفتار کیا گیا اور ہمارے ساتھ مقامی لوگ بھی گرفتار ہوئے۔ انہیں ٹیمپل ڈیرو جیل بھیجا گیا اور ہمیں مچھ جیل روانہ کیا گیا، تقریباً رات دو بجے مچھ جیل پہنچے۔ منشی نے آفس میں بٹھایا اور جیلر اور صوبے دار کو گھر سے بلایا، نام نوٹ کر کے سب کی تلاشی لی گئی۔ شہاب اور سلیم پر جیلر نے تشدد کیا اور کہا، لڑکیاں اغوا کرتے ہو۔ میرے خیال میں بلوچستان جیل میں ہم پہلی سیاسی قیدی عورتیں تھیں۔ جیل والوں کو صرف کرمنل قیدی عورتوں کے حوالے سے معلومات تھیں اور انہوں نے اسی طرح کا رویہ ہمارے ساتھ رکھا۔ بہرحال میٹرن صاحبہ جب ہمیں زنانہ وارڈ میں لے گئی تو وہاں دس قیدی عورتیں اور ان کے ساتھ بچے بھی موجود تھے۔ میٹرن بھی وہیں سوتی تھی۔ سامنے والا کمرا خالی تھا۔

پہلی رات ہمیں ان عورتوں کے ساتھ رکھا گیا۔ مجھے سخت بخار تھا، ایک قیدی عورت نے ہمیں کھانا کھانے کے لیے کہا۔ آصفہ نے کہا، ہمیں بھوک نہیں ہے۔ صبح ہوئی تو ہمیں کہا گیا کہ چلو کام کرو۔ آصفہ نے کہا کہ ہمیں آئے ہوئے صرف تین چار گھنٹے ہوئے ہیں۔ ابھی ہم تمہارے مہمان ہیں، کچھ صبر کرو۔ عورتیں آپس میں باتیں کررہی تھیں کہ یہ دونوں بازار سے پکڑی ہوئی عورتیں ہیں، ہمیں یہ جھوٹ بتارہی ہیں کہ یہ طالب علم ہیں۔ کچھ دیر بعد ہمیں دوسرے وارڈ میں منتقل کیا گیا اور کہا

گیا کہ یہ بی کلاس ہے۔صو بیدار نے کہا اس وارڈ میں عطااللہ مینگل، خیر بخش مری، غوث بخش بزنجو، ولی خان بھی رہ کر گئے ہیں۔ہمیں ایک گلاس، پلیٹ، پانی کا گھڑا دیا گیا۔تھوڑی دیر بعد کھانا آیا، دال روٹی تانبے کی پلیٹ میں تھی۔ جب ہم نے کھانا کھایا تو الٹی آنی شروع ہوگئی۔ بہر حال کیا کر سکتے تھے۔تھوڑی دیر بعد صوبے دار نے ہمارے کاغذ اور پین لا کر دیئے۔ میں نے سب سے پہلے اماں اور بابا کو محراب پور خط لکھا۔ پھر حیدر آباد ساتھیوں کو خط لکھا۔ باہر آئے تو ایک درخت پر حیدر بخش کا نام لکھا ہوا تھا۔ پتا چلا کہ حیدر بخش جتوئی بھی اس جیل میں رہ چکے ہیں۔

مچھ جیل پہاڑی علاقے میں ہے، منظر بہت خوبصورت تھا۔ ہمارے سامنے زنانہ وارڈ سے عورتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔انہوں نے دور سے ہماری خیریت پوچھی۔جیلر نے آ کر ہم سے پوچھا آپ کو تکلیف ہو تو بتائیں ہم بھی ماں بہنوں والے ہیں۔جیلر نے کچھ کتابیں دیں۔ان میں کوئی انقلابی کتاب نہیں تھی۔ عام قسم کے ناول تھے۔ میٹرن نے آ کر ہم سے کہا میں ساری رات تم لوگوں کی فکر میں نہیں سو سکی۔ مجھے بار بار خیال آ رہا تھا کہ تم دونوں اکیلی ہو۔ کچھ دیر بعد ڈائریکٹر راجہ صاحب نے ہمیں بلایا اور کہا کہ آپ لوگوں کا کیس معمولی ہے، آپ کورٹ میں رٹ داخل کروا کر ضمانت کروا لیں۔ میں نے کہا کہ کیس معمولی ہو یا نہ ہو ہماری جدو جہد معمولی نہیں ہے۔ ہم اپنے مطالبے منوائے بغیر ضمانت نہیں کروائیں گے۔ راجہ صاحب کا رویہ بہت بہتر تھا۔ ہمیں واپس وارڈ میں بھیج دیا گیا۔

کچھ دنوں کے بعد ہم دونوں سے کہا گیا کہ آپ سے ملنے کوئی باہر آیا ہے۔ ماڑی پر گئے تو نذیر عباسی، فیض بھائی اور تنویر شیخ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم لوگ بہت خوش ہوئے۔ سپرنٹنڈنٹ نے مذاق میں نذیر سے کہا تم کو تو حمیدہ کے ساتھ ہنی مون پر جانا چاہیے تھا مگر آج تمہاری بیوی جیل میں ہے۔نذیر نے کہا ہم اپنے نظریے کے لیے تمام ذاتی رشتے قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔نذیر نے مجھے کچھ کتابیں دیں اور کھیلنے کے لیے لوڈو بھی دیا جس سے ہمارا دل بہلتا رہتا تھا۔ ہم لوگوں سے بی ایس او کے طالب علم اکثر ملنے آتے تھے۔اس کے علاوہ ایک سوشل ویلفیئر آفیسر انجم ضیا بھی ملنے آتی تھی۔اس کا کہنا تھا بلوچستان کی عورت بہت پسماندہ ہے۔تم لوگوں نے آ کر بلوچوں کے مسئلے پر آواز اٹھائی، تم لوگ بہت بہادر ہو۔ ہم نے کہا، ہم نظریاتی لوگ مخصوص علاقے کی لڑائی نہیں لڑتے،

ہمارے منشور میں ہے کہ ہم دنیا کے تمام محنت کش کسانوں، مزدوروں، طلباء اور ان کے مسائل، ان کی تحریکوں کو اپنی تحریکیں سمجھتے ہیں۔ ایک دن پھر صوبیدار نے مجھے آکر کہا کہ آپ کی ملاقات آئی ہے۔ آپ کا بھائی آپ سے ملاقات کرنے آیا ہے۔ میں نے جا کر دیکھا تو یہ ملاقاتی نرنجن کمار تھا جو میرے لیے جاگرتا رسالہ لے کر آیا تھا، جسے میں اور نرنجن حیدرآباد سے چھاپتے تھے۔

عورتوں کے وارڈ کے اندر میں اور آصفہ گھنٹوں مختلف موضوعات پر بحث کرتے رہتے تھے اور اپنے ساتھیوں کو بھی یاد کرتے تھے۔ ہمارے وارڈ کے سامنے دوسری قیدی عورتوں کا وارڈ تھا۔ وہاں سوشل ویلفیئر آفیسر باہر سے دستکاری کا سامان لے کر آتی تھی اور قیدی عورتوں سے بنواتی اور سکھاتی تھی۔ آصفہ باجی نے بھی شیشے لگانے سیکھے تھے۔

ہمیں ملاقات کا انتظار رہتا تھا کیوں کہ ہر سیاسی قیدی کو باہر چلنے والی تحریک کے بارے میں ایک جستجو رہتی ہے۔ ایک دن جیلر چنگیزی نے طنز سے کہا، بھٹو بھی تو عوام کے ہی نمائندے تھے۔ آصفہ نے جواب دیا ہمارے ساتھی تو بھٹو کے دور میں بھی جیل میں رہے ہیں۔ ساتھی حمیدہ بھی اس دور میں جیل برداشت کر چکی ہے۔ جیلر کے چہرے پر غصہ نمایاں تھا۔ جب نذیر کی ملاقات آئی تو اس نے ملاقات کے لیے آصفہ کا نام لیا لیکن جیلر نے ملاقات کروانے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا سبب وہ غصہ تھا یا خرچی نہ ملنے کا غم۔

ہم تمام ساتھیوں نے کوشش کی تھی کہ ہمیں ہر ہفتے ملنے کا موقع دیا جائے۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے کہا آپ لوگوں کے آنے سے پہلے کسی قیدی کی ہمت نہیں تھی کہ وہ بات کر سکے۔ آپ لوگوں کے آنے کے بعد دوسرے قیدی بھی بولنے لگے ہیں، اور رمضان نے کہا کہ ہم کوئی بھی ناخوشگوار بات نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب ڈیوٹی پر ہیں۔ ہمارے ہی طبقے کے یہ لوگ کل جب بے روزگار ہوں گے تو ان کو نوکریوں پر بحال کرانے کے لیے جدوجہد بھی ہمیں ہی کرنی پڑے گی۔ اس کے بعد پیر شہاب الدین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان پر پہلی رات تشدد کیا گیا تھا، تو سپرنٹنڈنٹ نے کہ ٹمپل ڈیرہ کے صوبیدار نے ہمیں درست خبر نہیں دی تھی۔ اسی وجہ سے ان پر تشدد کیا گیا تھا، اس بات پر ہم معافی مانگتے ہیں۔ اس کے بعد ہمیں کچھ سیاسی کتابیں دی گئیں جو بلوچ ساتھی حبیب جالب دے کر گئے تھے۔ میں نے اپنے لیے ''پاکستان کی تہذیب کا

ارتقا'' کی کتاب لی۔

یکم مئی کو جیل انتظامیہ نے اجازت دی کہ آپ تمام سیاسی قیدی ایک جگہ بیٹھ کر دن گزاریں، ہمیں اپنے ساتھیوں سے ملنے کی اجازت پر بے حد خوشی تھی۔ چوں کہ میں تمام ساتھیوں سے عمر میں چھوٹی تھی اس لیے ساتھیوں کا رویہ میرے ساتھ چھوٹی بہنوں جیسا تھا اور رمضان ہمیشہ کہتے تھے کہ یہ سب سے چھوٹی ہے لیکن اس کا حوصلہ بہت بلند ہے۔ مچھ جیل میں یکم مئی سیاسی سوچ رکھنے والی عورتوں اور مردوں نے مل کر منائی، بینر جو ساتھیوں نے بنایا تھا، لے کر وارڈ میں نعرے لگاتے ہوئے گھومتے رہے۔ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ یوم مئی شکاگو کے شہیدوں کی یاد میں پوری انسانیت کے لیے مشعل راہ ہے، جس میں رنگ و نسل، مذہب اور زبان سے بالاتر ہو کر صرف طبقاتی حقوق کے حصول کی جدوجہد کی جاتی ہے۔

یکم مئی کی سرگرمیوں کا سن کر ایک قیدی عورت نے اپنے بیٹے کو میرے سامنے کھڑا کیا اور کہا، اس کو میں تمہیں دیتی ہوں، اس کو تم لوگ اپنا ساتھی بناؤ۔ وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ قربانی کبھی بھی رائیگاں نہیں جاتی۔ سچ کی لڑائی ہمیشہ تبدیلی لاتی ہے۔ پوری بات کرنے کے بعد کہنے لگی کہ آپ لوگ جو انقلاب کر رہے ہو جب وہ انقلاب آئے گا تب یہ جیلیں ہوں گی؟ آصفہ نے کہا ہم سب سے پہلے جیل کی دیواریں توڑیں گے۔ پٹھانی قیدی خوش ہو کر کہنے لگی تو پھر جلدی انقلاب لے کر آؤ تا کہ میں آزاد ہو جاؤں۔ اس کا ایمان انقلاب پر اتنا پختہ ہو گیا کہ اس کی رہائی جس میں ابھی سات سال باقی تھے، اسے بہت طویل لگنے لگے۔

ایک صبح صوبیدار کہنے لگا کہ آج آپ لوگوں کی ٹمپل ڈیرہ میں پیشی ہے۔ ہم تیار ہو کر ماڑی میں جیلر کے آفس میں گئے جہاں پیر شہاب الدین، الطاف الرحمٰن اور سلیم پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے، جب ہم پیشی پر پہنچے تو تحصیلدار نے کہا، تم لوگوں نے مارشل لاء کی خلاف ورزی کی ہے، تم لوگ صرف اتنا لکھ کر دے دو کہ ہم مارشل لاء کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ ہم نے جواب دیا کہ ہمارے مطالبے جائز ہیں اور انہیں حکومت کو پورا کرنا چاہیے۔ چاہے حکومت فوجی ہو یا سویلین۔

تقریباً تین بجے تک بحث کا سلسلہ جاری رہا۔ ہم میں سے ہر ایک کو الگ الگ بلا کر بیان ریکارڈ کروایا گیا۔ شام کو ہمیں دوبارہ مچھ جیل بھیج دیا گیا۔ جیل انتظامیہ حیران ہوئی اور کہا کہ آپ

آزاد نہیں ہوئے؟ ڈائریکٹر راجہ صاحب بڑی ہمدردی سے پوچھ رہے تھے۔ بہرحال ہم واپس جیل کے وارڈ میں چلے گئے۔ قیدی عورتیں جو پہلے سے ہی پریشان تھیں کہنے لگیں کہ سامنے والے کمرے کو خالی دیکھ کر ہم اداس ہو گئے تھے۔ لیکن آپ لوگوں کو دیکھ کر اور زیادہ اداسی ہونے لگی ہے کہ آپ لوگ آزاد کیوں نہیں ہوئے۔

بہرحال کچھ دن بعد دوسری پیشی پر ہم لوگوں کو آزاد کر کے کراچی روانہ کر دیا گیا۔ ہم جیل کے دروازے سے باہر نکلے۔ باہر کی دنیا بھی عجیب ہوتی ہے۔ جب جیل کے دروازے کے اندر قدم رکھا تو ظلم کے خلاف نفرت و بغاوت اور اپنے مقصد کی لڑائی کا وعدہ اپنے آپ سے کیا اور جب گیٹ سے باہر قدم رکھا تو فاتح کارکن کی طرح ضمیر کی عدالت میں اپنے آپ کو ہلکا محسوس کیا۔ ہم تقریباً دو مہینے کچھ دن مچھ جیل میں رہے۔ اس کے باوجود کوئی مایوسی نہیں رہی بلکہ ہمارے حوصلوں میں اضافہ ہوا۔ ہمیں مچھ اسٹیشن پر کوئٹہ ایکسپریس میں سوار کروایا گیا۔ جیکب آباد تک سول ڈریس میں ہمارے ساتھ پولیس والے موجود تھے۔''

اس تمام عرصے میں جام ساقی روپوش رہے لیکن اب ضیا حکومت انہیں پکڑنے کے لیے بہت بے چین نظر آنے لگی۔ انہیں گرفتار کرنے کے لیے پورے ملک میں جاسوسی کے جال بچھائے گئے۔ درجنوں مخبر بھرتی کیے گئے۔ حکمرانوں کی راتوں کی نیند حرام ہوگئی تھی۔ آخر جام کو پکڑنا فوجی جنتا کے لیے اتنا ضروری کیوں تھا؟ اس سوال پر ''سرخ پرچم'' میں بحث کی گئی۔ دراصل ان دنوں سپریم کورٹ میں بھٹو صاحب کی اپیل کی شنوائی ہو رہی تھی۔ فوجی آمریت، اسلام کے نام پر فاشی سزائیں دی گئیں۔ معاشی بحران سنگین تر ہو رہا تھا۔ عوام دشمن سیاسی پارٹیوں کی حالت ابتر تھی اور 'سرخ پرچم' کے لفظوں میں کثیر الطبقاتی پیپلز پارٹی پر مفاد پرست بزدل وڈیروں اور پیٹی بورژوا موقع پرستوں کا قبضہ ہو چکا تھا، اور وہ عوام کو سڑکوں پر آنے سے روک رہے تھے۔ اخبارات پر ان گنت پابندیاں تھیں۔ ایسی صورتِ حال میں صرف اور صرف کمیونسٹ پارٹی ہی واحد متحرک قوت تھی اور عوام کو صحیح سوچ اور انقلابی قیادت مہیا کرنے اور انہیں منظم کرنے میں کوشاں تھی۔ پارٹی اپنی مسلسل جدوجہد، درست سوچ، خصوصاً قومی اتحاد کی عوام دشمن اور سامراجی تحریک کو بے نقاب کرنے کے باعث تیزی سے مقبول ہو رہی تھی۔ ''سرخ پرچم'' اور پارٹی کا دیگر انقلابی لٹریچر پابندی سے عوام تک پہنچ رہا تھا

اور روپوش جام ساقی سمیت، کئی روپوش رہنما اور کارکن اسے عام لوگوں تک پھیلا رہے تھے۔ اسی لیے پارٹی کے اس اہم رہنما کو گرفتار کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جا رہی تھی۔ ان کی گرفتاری کے لیے خصوصی کمیٹیاں اور سیل بنائے گئے اور یوں بالآخر حکومت جام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ انہیں گرفتار کرنے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بین الاقوامی صورتِ حال بھی حکمرانوں کے لیے خطرناک ہوتی جا رہی تھی۔ جنوبی ایشیا میں سامراج کے سب سے بڑے اڈے میں شگاف پڑ رہے تھے۔ افغانستان کا انقلاب آگے بڑھ رہا تھا اور سامراجی قوتیں پاکستان کو اس پر حملہ کرنے کے لیے تیار کر رہی تھیں۔ امریکی پٹھو شاہ ایران کے خلاف تحریک کامیابی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ''سرخ پرچم'' کے مطابق کٹھ مُلائیت کے علمبردار سیاسی رہنما چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ کمیونزم پاکستان کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ امریکہ اس خطے کے حوالے سے اپنی پالیسی میں تبدیلی لا رہا تھا۔ پاکستان کے رجعتی فوجی اور سول حکمرانوں کو اپنا اقتدار شدید خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ پنجاب کے جمہوری عوام اور محنت کش فوجی حکمرانوں سے دست و گریباں تھے۔ اسی وجہ سے روپوش جام ساقی حکمرانوں کے لیے سنگین خطرہ بنے ہوئے تھے۔

۱۰ دسمبر ۱۹۷۸ء کو جام ساقی حیدر آباد میں اپنے دوست اقبال میمن کے گھر میں سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے۔ ابھی وہ اترے ہی تھے کہ سادہ لباس میں ایک شخص نے اچانک ان کے بیگ میں ہاتھ ڈال دیا۔ جیسے ہی اس نے کاغذوں کا پلندہ باہر نکالا، ان میں ''سرخ پرچم'' دیکھ کر وہ چلایا:

"He is the man"۔

ایجنسی والے جام ساقی اور اقبال میمن کو پنجاب یونٹ ۱۷ میں لے گئے۔ انہیں گرفتار کرنے کے لیے چار پولیس موبائیل اور دو فوجی ٹرک آئے تھے۔

اس یونٹ میں جام ساقی رات بھر ٹارچر سہتے رہے۔ اس وقت اذیت رسانی کی حد ہو گئی جب ان کی فولادی گھڑی تک ٹوٹ گئی۔ تین اہلکار رات بھر تشدد کرتے کرتے صبح تک تھک کر چُور ہو گئے۔ صبح میجر نے کہا کہ انہیں ہیڈ کوارٹر چھوڑ کر آؤ، جس پر اقبال میمن نے کہا:

''میں اس لیے کچھ نہیں بتاؤں گا کہ میں کمیونسٹ نہیں ہوں اور کچھ نہیں جانتا اور جام اس لیے کچھ نہیں بتائے گا کہ وہ کمیونسٹ ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔''

وہاں سے انہیں 'ایف آئی یو' موجودہ آئی ایس آئی، کراچی کیمپ منتقل کر دیا گیا، جہاں ان پر ہونے والی سختی کا یہ عالم تھا کہ سپاہیوں کو ہدایت جاری کی گئی

''یہ شخص پاگل اور بھارت کا ایجنٹ ہے۔ اسے باتھ روم بھی، آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جاؤ۔''

یہاں سے انہیں لاہور کے شاہی قلعہ میں منتقل کر دیا گیا۔ چوں کہ ان کی گرفتاری کہیں پر ظاہر نہیں کی گئی تھی، اس لیے کوئی نہیں جانتا تھا کہ جام ساقی کہاں ہیں۔ لیکن انہیں شاہی قلعہ منتقل کرنے کی افواہیں عام تھیں۔ انہیں وہاں منتقل کرنے سے پہلے دیگر قیدیوں کو فارغ کر دیا گیا۔ جس کے بعد یہ شک یقین میں بدل گیا کہ انہیں شاہی قلعہ منتقل کر دیا گیا ہے۔ یہاں تشدد اور ایذا رسانی کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

جام ساقی کو لاہور قلعے سمیت مختلف مقامات پر اذیتیں دی جا رہی تھیں۔ کئی بار یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ انہیں کہاں رکھا گیا ہے۔ جام ساقی کی رہائی کے لیے ملک بھر خصوصاً سندھ میں تحریک شدت پکڑ رہی تھی۔ پارٹی کی طرف سے دوسرے ساتھیوں سمیت حمیدہ اس تحریک میں پیش پیش تھی۔ کراچی کے ریگل چوک میں جام ساقی کی رہائی کے لیے بہت بڑا مظاہرہ ہوا۔ جس میں حمیدہ نے بھی شرکت کی اور دوبارہ گرفتاری کے بعد سکھر جیل بھیج دی گئی۔ دو ماہ بعد اسے دوبارہ کراچی لایا گیا اور عدالت نے اسے رہا کر دیا۔ نذیر بدستور روپوش تھا۔

جب جام ساقی کی گرفتاری کی خبریں ایذا رسانی کے مراکز سے باہر پہنچیں تو انہیں مار دیئے جانے کی افواہیں بھی پھیل گئیں جو یقیناً سکھاں تک بھی پہنچیں۔ اس کے نتیجے میں وہ حادثہ پیش آیا، جو جام کے لیے ہر طرح کی اذیت سے بھی بڑھ کر تھا۔ جام نے ہمیں بتایا:

''میری کامریڈ اور بیوی سکھاں مجھ سے بے حد محبت کرتی تھی۔ گرفتاری کے بعد مجھے عدالت میں پیش نہیں کیا گیا تھا، اس لیے اخباروں میں یہ اطلاعات چھپیں کہ مجھے مار دیا گیا ہے۔ تو اس نے مایوسی کے عالم میں کنویں میں چھلانگ لگا کر جان دے دی۔ چند دنوں بعد مجھے اس بات کی اطلاع ایک فوجی کیمپ میں ملی۔ میرے دل پر جو قیامت گزری، اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ سکھاں سے میرے دو بچے ہیں، بختاور اور سجاد ظہیر...''

جام کو جب لاہور کے شاہی قلعہ میں لے جایا جا رہا تھا تو راستے میں ڈی ایس پی نے جام سے کہا:

''سر! آپ نے اپنی زوجہ کے بارے میں جو بات سنی ہوگی، وہ غلط ہے۔''

جام نے گھبرا کر پوچھا ''کون سی بات؟''

ڈی ایس پی بولا، ''یہ کہ انہوں نے خودکشی نہیں کی۔ ان کی قدرتی موت تھی۔''

جام سمجھ گئے کہ سکھاں اب اس دنیا میں نہیں رہی اور ان کی محبت پر قربان ہوگئی ہے۔ سکھاں کے انتقال کی خبر، صرف جام ساقی کے لیے ہی نہیں بلکہ اس ملک کے ہر حساس فرد کے لیے بھی تکلیف دہ اور اذیت ناک تھی۔ ۸ فروری ۱۹۷۹ء کو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے سیکریٹری جنرل کامریڈ امام علی نازش نے بھی اس واقعہ پر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔ اپنے اخباری بیان میں انہوں نے لکھا:

''بیگم جام ساقی کی بے وقت اور غیر طبعی موت ایک ایسے وقت میں ہوئی ہے جبکہ کامریڈ جام ساقی نامعلوم فوجی کیمپ مں شدید جسمانی اور ذہنی تشدد سے دوچار ہیں اور اس غمناک خبر سے ان کی اذیتوں میں یقیناً دوچند اضافہ ہوگا۔ لیکن کامریڈ جام ساقی مزدور طبقے کے سپوت اور اس کی پارٹی کے رہنما ہیں۔ جس طبقے اور پارٹی کی روایت ہی تشدد، اذیتوں اور آزمائشوں کو جان کی پرواہ تک کیے بغیر حکمرانوں کی انکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنس کر سہنا ہے۔ ہمیں یقین ہے کامریڈ ساقی اس صدمے کو اپنی جوان ہمتی اور دلیری سے برداشت کریں گے۔''

کامریڈ امام علی نازش نے بیگم جام ساقی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے اپنی ازدواجی زندگی کے آغاز سے ہی بے پناہ مصائب محض پاکستان کے محنت کش عوام کے حقوق کے حصول کے لیے برداشت کیے ہیں۔ حکمرانوں نے ملک میں ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں جس کی وجہ سے کامریڈ ساقی کو متعدد مرتبہ جیل کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اور کافی عرصہ سے روپوش رہ کر محنت کش عوام کی جدوجہد کو منظم کرنے کا کٹھن کام جاری رکھنا پڑا۔ اور اب جب کہ مارشل لاء حکام نے انہیں ۱۰ دسمبر سے گرفتار کر رکھا ہے اور انہیں نہ تو کسی عدالت میں پیش کیا گیا ہے اور نہ ہی ان کے کسی عزیز حتیٰ کہ بیوی بچوں تک کو ان سے نہ صرف ملنے نہیں دیا گیا بلکہ انہیں یہ تک نہیں بتایا گیا

کہ وہ کہاں اور کس حالت میں ہیں جس کی وجہ سے ان کی زندگی کے بارے میں تشویش اور غیر یقینی کیفیت نے بیگم جام ساقی کی جان لے لی۔

جام ساقی کی گرفتاری کے پیچھے ۹۲ ماہ کی روپوشی تھی۔ روپوشی کا دور جام کی بھرپور سرگرمیوں کا دور بھی تھا۔ اس دوران انہوں نے نہ صرف اخبارات کو بیانات جاری کیے بلکہ مارننگ نیوز کراچی کو تو عدالتی چارہ جوئی کرنے کے سلسلے میں نوٹس بھی بھیجا۔ وہ سندھ ہاری کمیٹی کے نام سے اندرون سندھ کمیونسٹ پارٹی کے لیے کام کرتے رہے۔ ایک طرف جام کی زیرِ زمین سرگرمیوں کا تسلسل تھا دوسری طرف خفیہ ایجنسیاں انہیں گرفتار کرنے میں مسلسل ناکامی کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہوگئی تھیں کہ جام ساقی، بھارت فرار ہو گئے ہیں۔ تیسری جانب انہیں بھٹو دور میں حیدرآباد سازش مقدمے میں مفرور قرار دیا جا چکا تھا۔ اگرچہ انہوں نے عدالت کو اپنا بیان بھیج دیا تھا۔ گرفتاری کے بعد بھی نامعلوم وجوہات کی بنا پر انتظامیہ کا محکمۂ اطلاعات ان کی گرفتاری کو چھپائے رکھنے پر مصر تھا تاہم انتظامیہ جام کی گرفتاری کا راز صرف دو دن چھپا پائی اور راز، راز نہ رہا۔ ان کی گرفتاری کے بارے میں متضاد اطلاعات سامنے آرہی تھیں۔ یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ گرفتاری کے وقت ان کے قبضے سے ''قابل اعتراض'' مواد برآمد ہوا تھا۔ البتہ ''قابل اعتراض'' کی اصطلاح گرفتاری کے بعد بھی وضاحت طلب رہی۔ یہ اطلاعات بھی تھیں کہ گرفتاری کے بعد انہیں کوئٹہ کے قُلی کیمپ میں رکھا گیا تھا۔ قُلی کیمپ بلوچستان میں اذیت رانی کا بہت بڑا مرکز تھا۔ لاہور کا شاہی قلعہ تو ان کے لیے نیا مہمان خانہ نہیں تھا۔ شاہی قلعے میں انہیں مسلسل قیدِ تنہائی میں رکھا گیا۔ بیچ پتر ااور مسلسل جگائے رکھنا بھی اذیت رسانی میں شامل تھے۔ اہلکار جام کو اکثر دھمکی آمیز الفاظ میں بتایا کرتے کہ اگر انہوں نے حسن ناصر کو اسی قلعے میں مار دیا تھا تو کسی نے ان کا کیا بگاڑ لیا۔ جام ان کی دھمکی میں نہ آتے اور حوصلے سے کہتے کہ حسن ناصر کا دور اور تھا اب لوگ بیدار ہو چکے ہیں۔

جام ساقی کو لاہور ہائی کورٹ کے حکم پر عدالت میں پیش کیا گیا، اس سے پہلے سندھ ہائی کورٹ کے حکم کے باوجود انہیں عدالت میں نہیں لایا گیا تھا جس سے یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ جام ساقی کو مار دیا گیا ہے۔

فیض صاحب نے بھی، مختصر وقت کے لیے سہی لیکن لاہور قلعے کی سیر کی تھی۔ جام کو بڑی

حیرت ہوتی تھی کہ تشدد کرنے والے فوجی اہلکاروں کو فیض کے اشعار زبانی یاد تھے جنہیں وہ اکثر دہرایا کرتے۔ وہ یہ تاثر بھی دینے کی کوشش کرتے کہ فیض صاحب نے بھی تھک کر ان سے ہاتھ ملا لیا تھا، تم بھی ایک دن تھک کر ان سے ہاتھ ملا لو گے۔ حالاں کہ فیض صاحب کے بارے میں اس فوجی میجر کا یہ تاثر سراسر گمراہ کن تھا۔ ایک بار وہ میجر جام سے پوچھ تاچھ کے لیے آیا ہوا تھا۔ تو جام نے تفتیش کے دوران اس سے صاف کہہ دیا:

''میرا خیال تھا کہ ان تمام جانوروں میں سے شاید تم انسان نکلو گے لیکن تم بھی ان جیسے ہی نکلے۔''

وہ جام سے اکثر عجیب وغریب سوال کرتے، مثلاً ''فوج میں آپ کا کوئی گروپ ہے؟'' یا ''آپ کے ساتھ کون کون ہیں، کہاں کہاں ہیں؟'' یا پھر ''کن کن ملکوں سے آپ کے رابطے ہیں اور کہاں کہاں سے فنڈز آتے ہیں؟'' سب سے مضحکہ خیز سوال یہ تھا کہ ''آپ پنجابی کیوں سیکھ رہے ہیں؟'' پھر خود ہی جواب دینے لگے، ''اس کا واحد مقصد فوج میں بغاوت پھیلانا ہے۔''

۲ جولائی ۱۹۷۹ء کو جب انہیں لاہور ہائی کورٹ میں پیش کیا گیا تو فوجی انہیں کسی سے ملنے نہیں دے رہے تھے۔ وہاں باقی لوگوں کے علاوہ طاہرہ مظہر علی خان بھی آئی ہوئی تھیں جن کو وہ جام سے ملنے نہیں دے رہے تھے۔ طاہرہ نے ایک سپاہی کو دھکا دیا اور پنجابی میں چلّا کر بولیں: ''پراں ہٹ۔'' اور یہ کہتے ہوئے وہ جام کے قریب آ گئیں۔ کورٹ سے واپسی پر جب قلعہ واپس پہنچے تو ایک میجر نے جام سے کہا، ''وہ عورت روسی ایجنٹ تھی۔''

جام نے کہا، ''اگر وہ روسی ایجنٹ ہے تو اسے پکڑ کر اس پر مقدمہ کیوں نہیں چلاتے؟'' اس پر میجر کہنے لگا، ''اگر وہ سچ مچ روسی ایجنٹ نکلیں تو ہمارے لیے بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔''

ایک اور موقع پر سوال جواب کرتے ہوئے ایک اہلکار کہنے لگا، ''ہمیں تم سے ڈر بھی لگتا ہے اور شرم بھی محسوس ہوتی ہے۔ ڈر اس لیے کہ اگر تمہارا انقلاب سچ مچ کامیاب ہو گیا تو ہماری خیر نہیں ہوگی اور شرم اس بات پر آتی ہے کہ ہمیں اپنے ذرائع سے معلوم ہے کہ آپ نے کئی بار انڈیا کے پیسے ٹھکرائے ہیں۔''

دوسری جیلوں کے مقابلے میں قلعے میں صبح جلدی ہو جاتی تھی۔ ۴ اپریل کی صبح ایک سپاہی

دوڑا ہوا جام کے پاس آیا اور بولا:

''بھٹو کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ اسلام آباد سے فون آیا ہے کہ آج آپ غصے میں ہوں گے۔ اس لیے آپ سے پوچھ تاچھ کی جائے۔'' جام نے سوچ لیا کہ آج ان کے ہر سوال کا جواب گالیوں کی صورت میں دیا جائے۔ آخر بھٹو کی پھانسی کوئی چھوٹا سا واقعہ تو نہ تھا۔ جب سوال شروع ہوئے تو جام ہر سوال پر جرنیلوں کے خلاف گالیوں کی بوچھاڑ کرتے رہے۔ عجیب بات ہے کہ وہ گالیوں کا برا منانے کی بجائے بار بار یہ کہتے:

''ہم آپ کے جذبات کو سمجھتے ہیں۔ مگر اس کا ملک پر کیا اثر پڑے گا؟''

قیدِ تنہائی میں جام کو ٹارچر کے لمحات بھی غنیمت معلوم ہوتے تھے۔ آخر انسانوں سے بات چیت کا موقع تو مل جاتا تھا۔ سپاہیوں سے جام کا دوستی کا ایک عجیب سا رشتہ استوار ہو گیا تھا۔ وہ ٹارچر بھی کرتے تو جام کو لگتا کہ ہاتھ تو ان کے ہیں لیکن انہیں استعمال فوجی حکمران کر رہے ہیں۔ عجیب بات تھی کہ ان سپاہیوں سے دوری، جام کے لیے کئی بار تکلیف دہ ثابت ہوتی۔ ''سپاہی میرے لیے کیلے کی طرح تھے اوپر سے سخت، اندر سے نرم۔'' جام نے کہا۔

۱۵ جولائی ۱۹۷۹ء کو ڈی ایس پی غلام نبی نے جام کو ایک خط دکھایا جس کے مطابق انہیں یہاں سے حیدر آباد لے جایا جانا تھا۔ جام نے درخواست کی کہ انہیں عام مسافر جہاز سے لے جایا جائے کہ لوگوں کو دیکھے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔

خط کی تفصیل کے مطابق جام کو جہاز کے ذریعے کراچی لے جایا جانا تھا۔ پھر وہاں سے حیدر آباد منتقل کیا جاتا۔ جب جہاز کراچی ایئرپورٹ پہنچا تو ڈی ایس پی نے ایک موبائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ انہیں حیدر آباد لے جائے گی۔ ابھی اتنی ہی بات ہوئی تھی کہ فوج کی دو گاڑیاں تیزی سے موبائل کے قریب آ کر رکیں۔ انہیں دیکھتے ہی ڈی ایس پی کہنے لگے، ''سائیں! اب میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آپ کو کہاں لے جائیں گے۔''

جام نے کہا، ''آپ نے تو مجھے سیدھا حیدر آباد جیل لے جانے کا وعدہ کیا تھا''

وہ بولا، ''فوج کے آگے میرے کون سے وعدے چلیں گے؟''

آرمی والوں نے پولیس سے جام کی ہتھکڑی تھامی اور انہیں حیدر آباد

[illegible] لے گئے۔ وہاں ان سے ملاقات پر پابندی تھی اور مقدمہ بھی نہیں چلایا جا رہا تھا۔ اس پر جام ساقی نے بھوک ہڑتال کردی جو دس بارہ روز چلی۔ اس کے بعد انہیں سکھر جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ پانچ سال کی روپوشی اور تین سال کی قید تنہائی کے بعد دس سال کی قیدِ بامشقت۔

وہ سکھر جیل میں نظر بند تھے، جہاں سے ایک دوسرے مقدمے کی سماعت کے سلسلے میں کراچی لائے گئے۔ وہیں حیدرآباد سندھ کی خصوصی فوجی عدالت لگائی گئی جس میں دلیل اور وکیل کے بغیر پہلے سے لکھی ہوئی سزا پڑھ کر سنادی گئی۔ پانچ سال کی روپوشی اور تین سال کی قید تنہائی کے بعد دس سال کی قیدِ بامشقت۔ اس فیصلے سے حکمران کافی رسوا ہوئے۔ وہ جام ساقی کی تین سالہ قید تنہائی سے، پہلے ہی بہت رسوا ہو چکے تھے مہینوں بلکہ برسوں انہیں ملک کی مختلف فوجی اذیت گاہوں میں امریکہ اور اسرائیل سے تربیت یافتہ فوجی درندوں نے جبر و تشدد کا نشانہ بنائے رکھا تھا۔ ''سرخ پرچم'' نے تجزیہ کرتے ہوئے لکھا:

''کامریڈ ساقی کی گرفتاری کے نتائج یقیناً حکمرانوں کے مذموم عزائم کے برعکس نکلے۔ کامریڈ ساقی کو کوئی ٹارچر جھکا نہ سکا۔ ان کی گرفتاری سے پارٹی کمزور ہونے کی بجائے اس کی صفوں میں اضافہ ہونے لگا۔ پارٹی کا کام معمول کے مطابق جاری رہا اور بھٹو کی شہادت، قومی اتحاد کے جنازہ نکلنے اور اسلامی نظام کی ناکامی کی وجہ سے پارٹی پہلے سے بھی مضبوط ہوگئی۔ ملک کے اندر ہر حصے سے کامریڈ ساقی کی رہائی کے مطالبے ہوئے۔ بیرونی دنیا میں کامریڈ کی رہائی کے لیے مظاہرے ہوئے۔ برادر کمیونسٹ پارٹیوں اور بین الاقوامی جمہوری تنظیموں نے مہم چلائی۔ مشرقی جرمنی، شام، لبنان، ہندوستان اور ایشیاء و یورپ کے کئی ممالک کی پارٹیوں نے مضامین شائع کیے اور کامریڈ ساقی کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ اس طرح عالمی برادری کے سامنے بھی فوجی حکمران مزید خوار ہوئے۔ جہاں تک قانونی پہلو ہے تو ان قانون شکن حکمرانوں کو آج تک ایسی کوئی شہادت نہیں ملی جس کے جواز پر کامریڈ کے خلاف اپنے مذموم عزائم پورے کرسکیں۔ پاکستان کے محنت کشوں کے اس عظیم فرزند کو سوویت یونین اور ہندوستان کا ایجنٹ ثابت کرنے کے لیے منصوبے گھڑے گئے۔ ان پر تشدد کیا گیا۔ لیکن وہ کامریڈ سے تشدد کے ذریعے اپنی مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی نہ اگلوا سکے۔ کامریڈ پر مقدمہ بنانے کے لیے متعدد لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ تشدد کیا گیا لیکن اس میں بھی

انہیں ناکامی ہوئی۔ اس کے باوجود بھی حکمران شکست نہیں مان رہے۔ حالاں کہ شکست ان کا بہت قریب سے پیچھا کر رہی ہے۔ حکمران اب کامریڈ ساقی پر آرمی ایکٹ کے تحت فیلڈ کورٹ مارشل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن کامریڈ ساقی کی جان کے درپے رجعتی حکمران یاد رکھیں کہ وہ کامریڈ ساقی کو، ان کی پارٹی کو جھکا نہیں سکتے۔ وہ کامریڈ ساقی کو ختم کرنا چاہتے ہیں لیکن اس خطے میں ان کے حلیفوں اور آقاؤں کی مسلسل شکست ان حکمرانوں کی اپنی زندگی کے دن گن رہی ہے۔ پاکستان کی سرزمین کامریڈ ساقی کو تنگ کھولی میں بند کرنے والوں کے لیے تنگ ہو رہی ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب پاکستان کے عوام ان رجعتی حکمرانوں اور ان کے آقاؤں کو اٹھا کر بحرِ ہند میں پھینک دیں گے اور اپنا اقتدار اعلیٰ بحال کرائیں گے۔ کامریڈ ساقی اور تمام جمہوری اور محنت کش کارکنوں اور رہنماؤں کو رِہا کرائیں گے۔''

اس سے قبل فروری ۱۹۷۹ء میں ان کی شریک حیات سکھاں کی المناک موت موضوعِ بحث بنی رہی تھی۔ اس سارے معاملے کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ تشدد کے دوران جام ساقی کے سامنے سکھاں پر بہت غلیظ قسم کی بہتان طرازی کی گئی، جس کا جام ساقی نے خصوصی فوجی عدالت حیدرآباد کے سامنے اپنے بیان میں بھرپور جواب دیا۔ جام نے کہا:

''مجھے بتایا گیا کہ میری بیوی طوائف ہے۔ لیکن میں نے پیری ڈیز کی کتاب ''میتھڈ'' پڑھ رکھی ہے، اس لیے میں آسانی سے سمجھ سکتا تھا کہ اس قسم کے الزامات ہر رجعتی حکمران کا آزمودہ نسخہ ہیں۔ اس کے علاوہ میں اپنی بیوی کی پاک بازی کے بارے میں اچھی طرح واقف تھا۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ میری بیوی نے اپنی زندگی مجھ پر قربان کر دی کیوں کہ وہ سمجھتی تھی کہ یہ سامراجی رجعتی حکمران مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ بدقسمتی سے حکمرانوں کے کردار سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس نے عوام کی قوت کو کم کر کے دیکھا، ورنہ وہ نہ صرف پرامید ہوتی بلکہ پراعتماد بھی ہوتی کہ جلد یا بدیر میں باہر آؤں گا اور عوام اور میں اس کے ساتھ ہوں گے۔ تاہم جب گیارہ ستمبر ۱۹۷۹ء کو مجھے میرے والد سے ملاقات کی اجازت دی گئی تو مجھے اس افسوس ناک موت کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ مجھے یہ جان کر انتہائی دکھ ہوا کہ نظامِ مصطفیٰ کے دعوے دار اور نظریہ پاکستان کے ترجمان میری وفا شعار بیوی کی کردار کشی کر رہے تھے۔ جب کہ ان کو یقینی علم تھا کہ وہ پہلے ہی فوت

ہو چکی ہے اور اپنی قبر میں ابدی نیند سو رہی ہے۔''

اس بیان میں جام ساقی نے اور بھی بہت کچھ کہا۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۸ء سے جون ۱۹۸۰ء کے پہلے ہفتے تک اپنے اوپر ہونے والے تشدد کی تفصیلات بیان کیں اور اس نام نہاد عدالت کی عدالتی حیثیت کو بُری طرح بے نقاب کیا۔ انہوں نے کہا کہ ''فوجی عدالتیں، فوجی زیادہ اور عدالت کم ہوتی ہیں۔ ان کے فیصلے پہلے اوپر سے تیار ہوتے ہیں اور بعد میں سنائے جاتے ہیں۔''

اس تاریخی بیان میں جام ساقی نے تشدد اور ایذا رسانی کی جو تفصیلات بیان کیں، انہیں مختصر لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

''مجھے ۱۰ دسمبر ۱۹۷۸ء کو داؤد مینشن حیدر آباد کی سیڑھیوں سے گرفتار کیا گیا۔ میری گرفتاری کے لیے پولیس کی چار گاڑیاں اور فوج کی دو گاڑیاں لائی گئی تھیں جو پنجاب رجمنٹ کی ۱۷ویں بٹالین سے متعلق تھیں۔ ۱۷ویں پنجاب کے ضرورت سے زیادہ پُر جوش کمانڈنگ افسر نہ صرف اس آپریشن کے چیف تھے بلکہ بہ نفسِ نفیس گرفتاری کے لیے موجود تھے۔ وہ پولیس حکام پر اعتبار کرنے کو تیار نہ تھے کیوں کہ یہ خبر گرم تھی کہ کوئی سندھی افسر مجھے گرفتار کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ بعد ازاں اس میں یہ اضافہ بھی کیا گیا تھا کہ کوئی سول افسر بھی ایسا کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ اس طرح کرنل نہ صرف موقع پر موجود تھا بلکہ جوں ہی میری گرفتاری عمل میں آئی وہ مجھے سٹی پولیس تھانے لے گیا اور ایک گھنٹہ بعد اس نے سٹی پولیس تھانے کے ایس ایچ او خلیل باجوہ کو نہ صرف مجھے ۱۷ویں پنجاب کے کوارٹر گارڈ پہنچانے کا حکم دیا بلکہ میرے ساتھ اس کے شریفانہ برتاؤ پر سرزنش بھی کی۔ میں اس کے پاس بیٹھا تھا اور ٹیلی فون پر اس کے جوابات اور معذرت خواہانہ انداز سے یہ سمجھ رہا تھا۔ مسٹر باجوہ کے الفاظ تھے، ''نہیں جناب! میں اسے اپنے کوارٹر نہیں لے گیا بلکہ وہ تو مسلسل یہیں میرے دفتر میں میرے سامنے بیٹھا ہے۔'' تاہم میری گرفتاری کے ایک گھنٹہ کے اندر مجھے آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر ۱۷ویں پنجاب کے کوارٹر گارڈ پہنچا دیا گیا۔

تقریباً ساڑھے دس بجے یا ساڑھے گیارہ بجے مجھے کوارٹر گارڈ سے اے سی دفتر لے جایا گیا، جہاں تین افراد میرے منتظر تھے۔ کرنل رحمان اور میجر ظہیر نے ڈی ایس پی حیدر آباد ہونے اور تیسرے نے خفیہ سے متعلق ہونے کا سوانگ رچایا۔ یہاں مجھے بتایا گیا کہ اگر میں سیاست سے کنارہ

کش ہو جاؤں تو مجھے رِہا کیا جا سکتا ہے۔ فطری طور پر میں نے انکار کیا جس پر کرنل رحمان نے دوسری پیشکش کی کہ اگر میں این ڈی پی (نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی) میں شامل ہو جاؤں تو حکومت نہ صرف مجھے رہا کر دے گی بلکہ نفع بخش کاروبار، زمین یا نقد رقم بھی مہیا کرے گی تا کہ میں پر آسائش زندگی گزار سکوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے جھکانے کی ایسی کوششیں ناکام رہیں گی کیوں کہ میں نے اپنی زندگی سوشلزم کے لیے وقف کر رکھی ہے اور میں نے اس وقت تک جدو جہد جاری رکھنے کا مصمم عزم کر رکھا ہے جب تک قومی اور شخصی استحصال کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اس پر جھنجھلاتے ہوئے کرنل رحمان کا ردِعمل انتہائی تشدد دانہ تھا۔ اس نے فوراً ایک فوجی کو بید لانے کا حکم دیا۔ تقریباً ایک بجے رات کو بید بازی شروع ہوگئی جو گالم گلوچ اور چیخ و پکار کے ساتھ اس وقت تک جاری رہی جب تک ہماری فوج کے ''سجیلے'' جوان ہانپ نہیں گئے، میرا خون بہہ رہا تھا اور صبح ہو رہی تھی۔

۲۰ دسمبر کو مجھے آنکھیں باندھ کر کراچی لے جایا گیا اور ایف آئی یو ایف آئی سی ۱۵ ۷ کے اذیت کیمپ کے حوالے کر دیا گیا جہاں مجھے چند دن تک اندھیری کھولی میں رکھا گیا جس کی چھت کو اوپر سے اور کھو کھلے فرش کو نیچے سے زور زور سے پیٹا جاتا تھا۔ اس قدر تاریکی تھی کہ میں قطعی کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ حتیٰ کہ مجھے پانی کے مگ اور کھانے کے برتن کو بھی ٹٹول کر ڈھونڈنا پڑتا تھا چند دنوں کے بعد مجھے اس کھولی سے نکالا گیا اور ایک دوسری کھولی میں چار دن تک جگائے رکھا گیا۔

بے آرامی اور اذیت رسانی کو گالیوں اور بید زنی سے دو آتشہ بنایا گیا۔ ہماری پولیس برطانوی راج سے ہی گالیوں کے لیے بدنام ہے لیکن میں نے یہاں دیکھا کہ چند اداروں اور بعض افراد کو گالیوں میں خصوصی مہارت دلائی گئی ہے اور وہ اس فن میں پولیس سے کہیں زیادہ تربیت یافتہ ہیں کیوں کہ وہ موقع پر ہی نئی گالیاں ایجاد کر سکتے ہیں۔ چار دن کے بعد انہوں نے اذیت رسانی کو سوالات سے بدل دیا۔ انہوں نے میری عینک، ٹوتھ برش اور کنگھی وغیرہ ۲۰ دسمبر کو ہی مجھ سے چھین لی تھی جو مجھے فروری ۷۹ء کے پہلے ہفتے میں لوٹائی گئی۔

بعض اوقات جب وہ مجھے بے خواب رکھتے تھے تو مجھ پر دسمبر جنوری کی سرد راتوں میں یخ بستہ پانی ڈالا جاتا تھا۔ گالیوں کی بوچھاڑ کی جاتی تھی اور چلایا جاتا تھا، ''تم کو نیند آ رہی ہے تم بڑے ۔۔۔(عدالت خالی جگہ خود پر کر سکتی ہے) اکثر اوقات وہ میرے سر، ہاتھوں اور مونچھوں کے بال

نوچتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں اذیت اور تشدد سے مر بھی جاؤں، جیسا کہ حسن ناصر مر گیا تھا۔ یا ذہنی طور پر ابنارمل ہو جاؤں جیسا کہ ایران کے ڈاکٹر مصدق ہو گئے تھے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ مجھے انجکشنوں سے نامرد بنایا جا سکتا ہے۔ مجھے اتفاق ہے کہ یہ دھمکی ایسے رجعتی حکمرانوں کے لیے عین فطری ہے جو بانجھ استحصالی طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بانجھ پن کے علاوہ یہ نظام اور پیش بھی کیا کر سکتا ہے۔

لیکن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا جس نے شدید اذیت دی۔ مثال کے طور پر بے آرامی کی طویل راتوں میں جب مجھے جگائے رکھا جاتا تھا تو وہ مسلسل یہ بکواس کرتے تھے کہ زرعی اصلاحات اسلام کے خلاف ہیں، اس لیے زمین کسانوں میں تقسیم نہیں کی جانی چاہیے۔ صرف جاگیردار ہی زمین کے مالک ہونے چاہئیں۔ وہ جانتے تھے اور میں نے بھی انہیں بتایا تھا کہ یہ میرے ایمان کا جزو ہے کہ زمین کو پہلے کاشتکار اور پھر امداد باہمی کے فارموں کی ملکیت ہونا چاہیے لیکن وہ ساری ساری رات بکواس کرتے رہتے تھے۔ کچھ دیگر راتوں کے دوران بعض ''ماہرین'' میرے پاس آئے اور مجھ سے سامراجی سرمائے کی وکالت کرتے رہے ان کے بیہودہ دلائل کئی راتوں تک جاری رہے۔ ایک پاکستانی شہری کی حیثیت سے اور اس طرح کم از کم نظری طور پر اگرچہ ابھی عملی طور پر نہیں، ملک کے آقا ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ معلوم کرنے کا حق حاصل ہے کہ وہ کون تھے؟ مجھے یہ تسلیم کر کے انتہائی دکھ ہوتا ہے ''یہ حضرات'' مسلح افواج کے متعلق تھے اگر ایسا نہیں تھا تو سامراجی سرمائے اور فرسودہ جاگیرداری نظام کے ان کھوکھلے دلالوں کو اس اذیت گاہ تک کس طرح رسائی حاصل ہو سکی جس کی نگرانی فوج کر رہی تھی اور جہاں مجھے کھلی آنکھوں سے سیل کے باہر چلنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ بعض افسران کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے اس بیان سے انتہائی غضبناک تھے جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ جنرل نصیری کو ناپسندیدہ شخص قرار دیا جائے اور اسے واپس ایران بھیجا جائے تا کہ وہ رضا شاہ پہلوی کے دور میں کیے گئے انسانیت سوز قتلوں کے مقدمات بھگت سکے کیوں کہ وہ بدنام زمانہ ''ساواک'' کا بانی اور سربراہ تھا۔ پاکستانی فوج کے افسران کو ساواک کے سربراہ کو ملک سے نکالنے کے مطالبے پر اتنی پریشانی نہیں ہونی چاہیے جب تک کہ اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ نہ ہو۔ اگر حکومت کے پاس مستقبل کو جاننے کے لیے اتنی سی عقل بھی نہیں تو پھر وہ ہمارے

بیان سے ہی کچھ سیکھ سکتی تھی۔ مصائب، آزمائش اور کٹھن جدو جہد کے ان دنوں میں ایک عام آدمی بھی سمجھ سکتا تھا کہ یہ کٹھن اور شدید صورت حال عظیم ایرانی عوام کو فرسودہ بادشاہت جو سامراجی مفادات کے نگراں کی حیثیت سے سرگرم تھی کے جوئے سے نجات دلا کر رہے گی۔ اگر حکومت نے ہمارا مطالبہ مان لیا ہوتا تو ایران کی موجودہ حکومت سے ہمارے سرکاری تعلقات انتہائی قریبی اور دوستانہ ہوتے اور وہ ہمیں ایک کروڑ ڈالر کی امداد دینے سے انکار نہ کرتی جس کے لیے حکومت کو چاول کی اگلی فصل رہن رکھنی پڑی۔

گالیاں روز کا معمول تھیں لیکن ایک صوبیدار کو خصوصی طور پر گالیاں دینے اور بال وغیرہ نوچنے کا کام سونپا گیا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ نظر بندوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے یہ ان کا مجموعی طریقہ کار تھا یا وہ شخص اذیت پسند تھا۔ لیکن میرے معاملے میں انہوں نے حکومت کے لیے کوئی ساکھ قائم نہیں کی۔ فروری ۷۹ء کے پہلے ہفتے میں یہ زائد تشدد ختم ہو گیا۔ مجھے میرا چشمہ، ٹوتھ برش اور کنگھی وغیرہ دے دیئے گئے لیکن انہوں نے اخبار اور سگریٹ دینا قبول نہیں کیا۔ مجھے مسلسل ۹ ماہ تک ۲۴ گھنٹے ہتھکڑی لگا کر رکھا جاتا۔ جب تک میں ایف آئی یو کی اذیت گاہ میں رہا۔''

جام ساقی کے ۵۶ صفحات کے طویل بیان کے چند اقتباسات سے ہی صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اپنا بیان ختم کرتے ہوئے انہوں نے اس لا حاصل امید کا اظہار کیا کہ ان کے بیان کو حکومت کی نئی مذموم لغت کی روشنی میں نہیں پڑھا جائے گا بلکہ اسے سیاسی طور پر سمجھا جائے گا۔ ظاہر ہے جام کی یہ امید پوری نہ ہوئی اور انہیں پہلے سے لکھی ہوئی ۱۰ سال قیدِ بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔

باب 4

نذیر عباسی شہید

جام ساقی مقدمہ پاکستان کی تاریخ میں ایک اہم مقدمہ تھا۔ راولپنڈی کمیونسٹ سازش مقدمہ ۱۹۵۱ء کے بعد یہ اس نوعیت کا دوسرا اہم مقدمہ تھا۔ دونوں مقدموں میں سازش کا ملبہ پاکستان کمیونسٹ پارٹی پر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ راولپنڈی سازش مقدمہ میں بالواسطہ یا بلا واسطہ فوج ملوث تھی جبکہ جام ساقی کیس میں خود فوجی حکومت جام ساقی سمیت کمیونسٹ پارٹی پر ملبہ ڈال رہی تھی۔ جام ساقی کو ۱۰ دسمبر ۱۹۷۸ء کو پہلے ہی گرفتار کر کے فوجی عدالت سے دس سال قید بامشقت دی جا چکی تھی۔ لیکن یہ کافی نہیں سمجھا گیا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں فوجی حکومت نے ایک ''کمیونسٹ سازش'' پکڑی۔ پارٹی کی اعلیٰ قیادت کو مختلف مقامات سے مختلف وقتوں میں گرفتار کیا گیا اور پہلے سے گرفتار اور سزایافتہ جام ساقی کو اس سازش کا سرغنہ بتا کر اسے باقاعدہ سازش مقدمہ بنا دیا گیا۔ جام ساقی کو جو ۱۰ دسمبر ۱۹۷۸ء سے گرفتار تھے ۲۷ فروری ۱۹۸۰ء کو جوڈیشل حراست میں لے لیا گیا۔

پروفیسر جمال نقوی اور نذیر عباسی کراچی میں پارٹی مرکز سے ۳۰ جولائی ۱۹۸۰ء کو اکٹھے گرفتار کیے گئے۔ نذیر عباسی ۱۰ روز کے اندر اندر ۹ اگست ۱۹۸۰ء کو شہید کر دیئے گئے، جبکہ پروفیسر جمال نقوی کو گرفتاری کے بعد متعدد سہولتوں اور مراعات سے نوازا گیا۔ جمال نقوی اپنی کتاب میں خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ گرفتاری کے بعد تفتیشی افسروں خصوصاً بریگیڈیر امتیاز نے دوران تفتیش انہیں متعدد سہولتیں بہم پہنچائیں تھیں۔ ڈاکٹر مصدق حسین اپنی کتاب ''بائیں بازو کے منحرفین اور مارکسی نظریات'' میں بجا طور پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ کمیونسٹ

پارٹی کے اکٹھے گرفتار ہونے والے لیڈروں میں سے ایک کو وحشیانہ تشدد کر کے مار دیا جاتا ہے اور دوسرے کو سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ نذیر عباسی کی شہادت پر واضح قسم کے شکوک وشبہات کا اظہار کیا گیا تھا۔ جن کا تسلی بخش جواب اب تک نہیں دیا جا سکا بقول ڈاکٹر مصدق کتاب کے صفحہ نمبر ۱۱۴ پر پروفیسر نقوی بریگیڈیئر امتیاز کے کمیونسٹ پارٹی کو تباہ کرنے کے دعوے کا ذکر کرتے ہوئے اس کے اس اقدام کو درست قرار دیتے ہیں۔ اس سارے معاملے کو مزید وضاحت کی ضرورت ہے جسے ہم آئندہ صفحات میں تفصیل سے بیان کریں گے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو پروفیسر جمال نقوی کا نام ملزمان کی فہرست سے نکال دیا گیا تھا۔ شبیر شر اور کمال وارثی ۲۹ جولائی، سہیل سانگی ۳۱ جولائی اور امر لال ۲۱ ستمبر ۱۹۸۰ء کو گرفتار کیے گئے۔ اسی اثناء میں بدر ابڑو بھی گرفتار ہو گئے۔ نذیر عباسی کی شہادت کے بعد کل سات افراد پر چلایا جانے والا مقدمہ جام ساقی کیس کے نام سے مشہور ہوا۔

جام ساقی اور دیگر چھے ملزمان پر مختلف مارشل لاء ریگولیشنوں اور تعزیراتِ پاکستان ۱۲۴۔ الف کے تحت مندرجہ ذیل الزامات لگائے گئے۔

۱۔ مختلف طبقوں اور مذہبی فرقوں کے درمیان نفرت پھیلانا

۲۔ عوام میں مسلح افواج کے خلاف منافرت پھیلانا

۳۔ نظریہء پاکستان اور وہ مقاصد، جن کے لیے مارشل لاء لگایا گیا، کے خلاف کام کرنا

۴۔ ان کاموں میں مدد دینا، پشت پناہی کرنا

۵۔ سازش اور بغاوت

تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۲۴۔ الف کے تحت آخری الزام وہی ہے جو انگریزی دور میں مجاہدین آزادی پر وقتاً فوقتاً لگایا جاتا رہا۔ جام ساقی نے خصوصی فوجی عدالت کراچی کے سامنے ایک طویل بیان میں ضیا مارشل لاء کو اچھی طرح بے نقاب کیا۔ جام ساقی کے باقی چھے ساتھیوں نے بھی اپنے بیانات میں مارشل لاء کی طرف سے عائد الزامات کو رد کرتے ہوئے اپنا بخوبی دفاع کیا۔ ان بیانات کا تجزیہ کرنے سے پہلے ہم شہید نذیر عباسی کی بات کریں گے۔ جام سے جب بھی ہماری نذیر

کے بارے میں بات ہوئی وہ ہمیشہ اس کی تحسین کرتے نظر آئے۔ نذیر سے پہلی ملاقات کے حوالے سے جام نے ایک بار بتایا:

''نذیر کو پارٹی میں آنے کے لیے سب سے پہلے کامریڈ اعزاز نذیر نے آمادہ کیا۔ تب وہ ایک طلباء تنظیم ''سندھ ماروڑا آزاد سٹوڈنٹس فیڈریشن'' سے وابستہ تھے۔ ان سے پہلی ملاقات میں ہی ہم گہرے اور قریبی ساتھی بن گئے۔ کامریڈ نذیر بات کرنے کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ جب میں جیل میں تھا تو پارٹی کی تمام ذمہ داریاں نذیر پر آ گئی تھیں۔ پارٹی فنڈ کے لیے جام اکثر خود ہی جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جی ایم سید نے فنڈ دیتے ہوئے ان سے کہا:

''اگر پارٹی فنڈ لینے تم نہ آسکو تو نذیر کو بھیج دیا کرو۔''

نذیر روپوشی کی زندگی میں سیاسی حکمت عملی کو خوب سمجھتے تھے۔ شاید ہم ذکر کر چکے ہیں کہ روپوشی کے دنوں میں جام ایک بار بس میں حیدرآباد سے ٹنڈو اللہ یار جا رہے تھے۔ نذیر بھی ساتھ تھے۔ اتنے میں ایک بیمار بوڑھا بھیل بس میں سوار ہوا۔ خالی سیٹ نہیں تھی۔ اس لیے وہ جام کی سیٹ کے برابر کھڑا ہو گیا۔ جام جو مولویوں کے حلیے میں تھے اٹھ کھڑے ہوئے اور بوڑھے بھیل کو اپنی سیٹ دے دی۔ بس سے اترے تو نذیر نے جام سے کہا:

''کامریڈ، اپنے جذبے کو قابو میں رکھیں ورنہ بے نقاب ہو جائیں گے کیوں کہ کوئی مولوی کسی بیمار بھیل کے لیے اپنی سیٹ خالی نہیں کرتا۔''

جام ساقی نے نذیر کے کہنے پر ہی ''سندھ کی طلباء جدوجہد'' نامی کتاب لکھی تھی۔ جام کو اندازہ تھا کہ اگر نذیر اس بات پر زور دے رہا ہے تو سندھ کے طلباء کے لیے اس کی ضرور اہمیت ہوگی۔ جام کی بڑائی یہ ہے کہ وہ نذیر کے سیاسی شعور کی گہرائی کو خوب سمجھتے تھے۔ جب جام، کوئٹہ جیل سے آزاد ہوئے تو نذیر بھی کوئٹہ پہنچ گئے اور کہا: ''چاہے مجھے پولیس لے جائے یا میں بھوکا مر جاؤں، آپ سے طلباء تحریک کی یادیں لکھوا کر ہی رہوں گا۔'' جام کو یہ کام کرنا پڑا۔ اور آج اس کتابچے کی صورت میں ہمارے پاس سندھ کے طلباء کی جدوجہد کا شاندار ریکارڈ موجود ہے۔

جام اور نذیر کے گہرے رشتے کے درجنوں واقعات ہیں۔ مثلاً نذیر نے ایک بار جام سے شرماتے ہوئے درخواست کی کہ وہ ہاشم گھانگھرو سے حمیدہ کے رشتے کے لیے بات کریں۔ یہ

تفصیل ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔ شادی کیا تھی ایک سیاسی جلسہ تھا۔ حمیدہ ان دنوں پارٹی کا سندھی سائیکلوسٹائل رسالہ 'جاگرتا' نذیر کے ساتھ مل کر نکال رہی تھی۔ اس دلی تعلق کے باعث جام کے لیے نذیر کی شہادت ناقابلِ برداشت تھی نہ صرف جام کے لیے بلکہ اس کے پیاروں، اس کے ساتھیوں کے لیے بھی۔ ساتھی جبار خٹک کے لفظوں میں، ''اس کے پاس دوستوں، ساتھیوں، رشتہ داروں، بیٹی، بیوی، ماں، بہن سب کے لیے دُکھ درد بانٹنے کا اور سلجھانے کا بہترین سلیقہ تھا۔ نذیر کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے مگر اس کی شہادت بہت حوصلہ دیتی ہے۔

نذیر کے سینئر ساتھی انور پیرزادو نے نذیر کی چھبیسویں برسی گزرنے پر چند اہم سوالات اٹھائے تھے جن کی مزید دس سال گزر جانے کے بعد بھی اتنی ہی اہمیت ہے۔

☆ نذیر عباسی کیسے گرفتار ہوا؟ کتنے دن اور کتنی راتیں اس پر کیسا تشدد کیا گیا؟ اس سے کیا کچھ پوچھا گیا؟ اس نے کون سے سوالوں کے جواب دیئے؟ یا بالکل چپ تھا؟ اس پر ٹارچر کرنے والے عملدار نے خود فیصلہ کیا یا اسے اوپر سے کسی اعلیٰ عملدار کا حکم دیا گیا کہ نذیر عباسی پر تھرڈ ڈگری کا ٹارچر کیا جائے، اس سب کے متعلق کوئی معلومات نہیں۔

☆ اس بہادر سندھی کمیونسٹ نے موت کے سامنے کیسے Behave کیا۔ موت جو انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے، اس کا اس نے کس طرح مقابلہ کیا؟ اس کے آخری الفاظ کیا تھے؟ اس کی آنکھوں کی چمک، اس کی پیشانی کی چینٹ، اس کا حوصلہ اور اس یقین کے باوجود کہ اب وہ اپنی ماں، نوجوان بیوی، معصوم سی لاڈلی بیٹی اور پارٹی اور اس پارٹی کے کامریڈ جن کے لیے وہ سر قربان کر رہا تھا، ان سب کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہا ہے۔ پھر بھی اس کا کیا کہنا تھا؟ یہ معلومات ان لوگوں کو اب ۲۶ سالوں کے بعد عام کر دینی چاہئیں جنہوں نے اس کو شہید کیا تھا۔

امریکی سی آئی اے تیس سالوں کے بعد اپنی مخفی دستاویزات عام کرتی ہے۔ حکومتی نظام چلانے والوں اور جنگ لڑنے والوں کی غیر انسانی ترجیحات ہوسکتی ہیں جو جنگ کے آخری مرحلے اور حکومت کے پورے ہونے کے سبب اپنی حساسیت کھو بیٹھتی ہیں اس لیے کام ہونے کے بعد حقیقتوں سے پردہ اٹھایا جائے تو تاریخ کا ریکارڈ درست رہے گا۔''

اس سناٹے میں اس کی بیٹی 'زرقا' کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے جس نے اپنے بابا کو

صرف ایک تصویر میں دیکھا ہے۔

''امی کہتی ہیں، جب وہ گھر آتا تھا تو تم سے بہت پیار کرتا، تم سے کھیلتا تھا، کاش میں اس ناسمجھ عمر کی یادگار سمیٹ سکتی...

جب نذیر بابا کنڈیارو لاک اپ میں تھا، اس وقت میری امی مچھ جیل بلوچستان میں تھیں۔جس کے بعد بابا کو قلی کیمپ لے جا کر ٹارچر کیا گیا..میرا اس وقت وجود تک نہ تھا کیوں کہ امی اور بابا شادی کے فوراً بعد گرفتار ہو چکے تھے۔امی کے ہنی مون کے دن مچھ جیل اور بابا کے قلی کیمپ میں گزرے تھے۔''

اور اس کی محبوب بیوی، حمیدہ گھانگھرو نے اس مٹی کو اپنا سیندور بنالیا، جس مٹی میں نذیر کا لہو شامل تھا اور یہ کیسی موت ہے جسے ایک انقلابی اپنے گلے کا خوبصورت ہار سمجھ کر فخر سے کہے:

''میری زندگی ایک گیت ہے اور میری موت جدوجہد کی علامت۔''

نذیر زندگی سے بھرپور ہنسی ہنس سکتا تھا، حمیدہ اس ہنسی کی سب سے بڑی گواہ ہے۔

''ایک دن میٹنگ میں جلدی جانا تھا۔صفت رند اور انعام رند بیٹھے تھے۔میں نے گرم چائے ایک پیالی سے دوسری پیالی میں انڈیل دی تا کہ ٹھنڈی ہو جائے۔اس پر نذیر نے مذاق میں ساتھیوں سے کہا، دیکھو، حمیدہ مجھے سقراط کی طرح زہر کا جام پلانے کا تجربہ کروا رہی ہے۔میں تھوڑی ناراض ہوئی تو ایک دم بہت ہی پیار سے کہنے لگا، ''ایک عام عورت اور تنظیمی ساتھی میں یہی فرق ہے کہ اسے ذہنی طور پر ہر بات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔اس لیے کہ انقلابی کسی بھی وقت اذیتوں اور مشکلات سے گزر سکتا ہے...'' وہ ساتھی زندہ ہنسی ہنس سکتا تھا، ساتھیوں سے کہہ سکتا تھا ''دیکھو، حمیدہ اور میں ہنی مون بلوچستان کے خوبصورت پہاڑوں میں گزار کر آئے ہیں۔''

لیاقت عزیز کے بقول ۱۰ دسمبر ۱۹۷۸ء کو جام ساقی گرفتار ہوئے تو نذیر عباسی پر بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑا جنہیں اس نے اپنی شہادت تک پوری خوش اسلوبی سے نبھایا۔غالباً اسی لیے چوہدری منظور کو کہنا پڑا کہ تاریخ میں کچھ لوگ پیدا ہوتے ہیں مرا نہیں کرتے۔

بلھے شاہ، اساں مرنا ناہیں، گور پیا کوئی ہور

کامریڈ رمضان کا پٹ فیڈر کی کسان تحریک سے تعلق تھا۔اس کا تفصیلی ذکر گزشتہ ابواب

میں ہو چکا ہے۔کراچی میں جہاں کامریڈ رمضان کا گھر تھا،اس کے قریب ہی کمیونسٹ پارٹی نے احمد کمال وارثی کے نام سے اپنا ہیڈ کوارٹر بنانے کے لیے ایک گھر کرائے پر لیا تھا۔جب کامریڈ رمضان پٹ فیڈر تحریک کے سلسلے میں ایک سال تک مچھ جیل میں قید تھے تو کراچی میں ان کے بیوی بچوں کی نگہداشت کی ذمہ داری پارٹی کی تھی۔

اپنی دوبارہ گرفتاری، جام ساقی کی گرفتاری اور ان پر ہونے والے تشدد کے خلاف احتجاج، پارٹی اور پارٹی کے ساتھیوں کی گرفتاری کو کامریڈ رمضان نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے جسے یہاں دہرانے کی ضرورت ہے۔

''جام ساقی پر تشدد بند کرانے اور اسے شاہی قلعے سے باہر لانے والی مہم شروع کرنے پر صدر ریگل چوک سے مظاہرہ کرنے کے جرم میں پانچ کوڑے اور ایک سال کی سزا کاٹنے کی وجہ سے میں ریاستی اداروں کی نظر میں آ گیا تھا۔میں خفیہ ایجنسیوں کی پوچھ گچھ کے دوران انہیں یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ جام ساقی کسان رہنما ہے اور میں مزدور کارکن،اس لیے اس کی جان بچانے کے لیے مظاہرہ کیا۔پوچھ گچھ کے دوران ان کا کہنا تھا کہ میں کمیونسٹ پارٹی کی خفیہ سرگرمیوں سے تعلق رکھتا ہوں۔ایسے حالات میں میرا کراچی میں رہنا اور پارٹی کے لیے کام کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

بلوچستان جانے کے بعد میرے گھر والوں اور بچوں کی ذمہ داری پارٹی نے نذیر کو سونپی تھی۔وہ پارٹی کے مرکز (جہاں سرخ پرچم چھپتا تھا) سے ہو کر میرے گھر آتا تھا۔میرے بچوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور میری بیوی شاہینہ کی ٹی بی کی دوائیں بھی لاتا تھا۔اس کی بیٹی زرقا پیدا ہوئی تھی مگر پارٹی کی خفیہ تنظیمی سرگرمیوں میں مصروف ہونے کی وجہ سے وہ اپنی بیوی اور بیٹی زرقا سے بہت کم ملتا تھا۔

نذیر میرے بچوں کے ساتھ کھیل کر زرقا کے پیار کا اظہار کرتا تھا۔حمیدہ اور زرقا سے خفیہ ملنے کے پروگرام وہ خود طے کرتا تھا۔اگست ۱۹۸۰ء میں پہلی یا دو تاریخ کو کوئٹہ میں ''امن'' اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر پڑھی جس میں لکھا گیا تھا کہ نارتھ ناظم آباد پیپلز کالونی سے کچھ لوگوں کو حکومت کے خلاف مواد، جعلی پاسپورٹ اور دستاویز چھاپنے کے خفیہ مرکز سے گرفتار کیا گیا ہے۔مجھے محسوس ہوا کہ یہ چھاپا پارٹی کے مرکز پر پڑا ہے، جس کی خبر میرے سوا کسی کو نہ تھی۔میں نے بلوچستان کے

ساتھیوں کو خطرہ سے آگاہ کیا اور خود بغیر اجازت کراچی آ گیا۔ میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ ہماری پارٹی کے اہم ساتھی گرفتار ہو چکے تھے۔

میں نے شاہینہ سے رابطہ کیا تو اس نے بتایا کہ دو دن پہلے رات کو اطلاع ملی کہ ہماری کالونی سے کچھ لوگوں کو حکومت کے خلاف سازش اور بغاوت کرنے اور ملک دشمنی کے جرم میں گرفتار کر کے سادہ لباس میں ایجنسیوں کے لوگ سفید چادروں میں لپیٹ کر لے گئے ہیں۔ ایسا تھا کہ اس گھر تک گاڑی نہیں جا سکتی تھی۔ اس لیے ایجنسی والے محلے کے لوگوں کو گھروں میں بند کر کے نذیر عباسی اور اس کے ساتھیوں کو گاڑی تک لے جانے کے لیے چادروں میں لپیٹ کر لے گئے۔

ان میں پروفیسر جمال الدین، کمال وارثی اور کامریڈ شبیر شر بھی شامل تھا۔ ایک اور چادر میں چھپائی کا سامان وغیرہ اٹھایا گیا۔ دوسرے دن شاہینہ، کامریڈ جاوید شکور کے گھر یہ بتانے کے لیے گئی کہ شاید ہماری کالونی میں پارٹی مرکز پہ چھاپا پڑا ہے اور ساتھی گرفتار ہوئے ہیں۔ شاہینہ اور جاوید شکور ابھی بات کر ہی رہے تھے کہ حمیدہ گھانگھرو پریشانی کی حالت میں جاوید شکور کے گھر پہنچی اور بتایا کہ گزری ہوئی رات نذیر عباسی کو مجھ سے ملنا تھا۔ آج تک کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ نذیر ٹائم دے اور ملنے نہ آئے۔ اس سے پوری طرح یقین ہوا کہ ساتھی گرفتار ہوئے ہیں۔ مگر پھر بھی تصدیق کرنا ضروری تھی۔

حمیدہ گھانگھرو کو پاکستان کوارٹر کے گھر کا پتا تھا جہاں شبیر شر، کمال وارثی رہ کر پارٹی کا کام کرتے تھے۔ حمیدہ کو خدشہ ہوا کہ کہیں وہاں پر بھی چھاپا نہ پڑا ہو۔ چوں کہ اس گھر کا پتا صرف حمیدہ کو تھا، اس لیے حمیدہ نے جاوید شکور اور شاہینہ کو کہا کہ میں ایک اور جگہ ساتھیوں کو محتاط کر کے آؤں۔ خود حمیدہ کو بھی پتا نہ تھا کہ اس پر بھی چھاپا پڑ چکا تھا۔ حمیدہ جب وہاں پہنچی تو ایجنسی والوں نے گھر کے اندر ایسا قبضہ کیا ہوا تھا جیسے گھر کے اندر داخل ہونے والے شخص کو معلوم بھی نہ ہو سکے۔ اندر جاتے ہی کامریڈ نذیر عباسی کی بیوی حمیدہ گھانگھرو نے صورتِ حال کو سمجھنے میں دیر نہ کی اور خود کو شبیر شر کے گاؤں کی سیدزادی بتایا جو اسے باپ کی بیماری کی اطلاع دینے آئی تھی۔

حمیدہ کی واپسی کے بعد اس حقیقت کی تصدیق ہوگئی کہ کامریڈ نذیر عباسی اور اس کے ساتھی گرفتار ہو گئے ہیں۔ بعد میں پروفیسر جمال نقوی، کمال وارثی اور محلے والوں سے بھی یہ

معلومات ملیں۔ کمال وارثی نے بتایا کہ اس گھر میں چند روز پہلے کچھ لوگ کود کر آئے تھے، انہوں نے محلے والوں سے معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے بتایا کہ ٹیلیفون کی تار صحیح کرنے اور کچھ لوگ پتنگ اتارنے اندر آئے تھے۔ کمال وارثی اور شبیر شر نے پروفیسر جمال نقوی کو بتایا کہ خطرہ محسوس ہو رہا ہے، اس لیے گھر تبدیل کرنے کا فیصلہ ہوا۔

مگر مسئلہ یہ تھا کہ جنرل ضیا کے سخت مارشل لاء دور میں اتنا سامان کہاں اور کیسے لے جایا جائے؟ ساتھیوں نے دوسرا گھر خریدنے کے لیے گھر بیچنے کا فیصلہ کیا اور گھر کے دروازے پر لکھا گیا مکان برائے فروخت۔ جمال نقوی نے بتایا کہ ایجنسی کے لوگوں نے گھر کو اس طرح گھیر لیا تھا کہ کوئی اور اندر نہ جا سکے۔ پروفیسر کے اندر جانے سے پہلے شبیر شر اور کمال وارثی ان کے قبضے میں آ چکے تھے۔ آخر میں کامریڈ نذیر عباسی گیا اور دروازے پر دستک دی اور روز کی طرح احتیاط کے طور پر دروازے کے سوراخوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ نذیر نے محسوس کیا کہ اندر کوئی اجنبی شخص ہے۔

کامریڈ نذیر فوری طور پر فرار ہونے لگا۔ اجنبی شخص نے دروازے سے نذیر کی صرف آنکھ دیکھی تھی جس کی وجہ سے پہچان نہ سکا اور گلی میں کھیلنے والے بچوں کو پیسے دے کر پوچھا کہ دروازہ کون سے شخص نے کھٹکھٹایا۔ بچوں نے کہا کہ کوئی ڈاڑھی والا تھا۔ اتنے میں ایجنسی کے کچھ اور لوگ بھی باہر نکل آئے۔ ایجنسی کے لوگ جلدی سے ظفر ہاؤس کے بس سٹاپ پر پہنچے وہاں بس نمبر K2 کے دروازے کی آخری سیٹ پر نذیر کو دیکھا۔ دوڑنے کی وجہ سے نذیر کی سانس چڑھی ہوئی تھی، انہوں نے اندازہ لگایا کہ یہی شخص ہوگا۔

کامریڈ نذیر عباسی روپوشی کے دوران مشتاق کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ اس کے پاس ایسا کارڈ بھی تھا۔ بعد میں بس سٹاپ کے دکان داروں سے معلوم ہوا کہ اس شخص کی جیب سے کچھ سٹیکر نکلے جس پر کسی شخص کی تصویر اور آزادی کا مطالبہ تھا۔ ان دنوں ہم کامریڈ جام ساقی کی آزادی کے لیے ملک گیر مہم چلا رہے تھے اس مہم کے لیے سٹیکر چھپوائے تھے، جو مختلف مظاہروں کے دوران ساتھی اپنے سینے پر لگاتے تھے۔ میرا خیال ہے کامریڈ نذیر عباسی کی جیب سے وہی سٹیکر نکلے ہوں گے۔ پارٹی کی مرکزی قیادت کی گرفتاری کے بعد کمیونسٹ پارٹی کا پورا تنظیمی ڈھانچا تباہ ہو چکا تھا۔

کوئٹہ سے واپس آنے کے بعد کامریڈ جاوید شکور کی رہنمائی میں ساتھیوں کے ساتھ مل کر

کامریڈ نذیر عباسی اور دوسرے ساتھیوں کی جان بچانے کی مہم شروع کی گئی۔ اخبارات پر مکمل سینسر شپ تھی۔ صرف چاکنگ کے ذریعے عوام کو بتایا جا سکتا تھا کہ پیپلز کالونی سے گرفتار ملک دشمن نہیں بلکہ محنت کش عوام اور جمہوری جدوجہد کے ہیرو ہیں جنہیں عوام دشمن خفیہ ایجنسیاں قتل کر کے عوام سے الگ کرنا چاہتی ہیں۔ وال چاکنگ اور ہاتھ سے لکھے پوسٹرز اور پمفلیٹس کے ذریعے اس مہم کو تیز کیا گیا۔

اس دور میں کوئی بھی پریس حکومت مخالف خفیہ مواد کو چھاپنے کے لیے تیار نہ تھی۔ میں خود کورنگی کے ایک گھر میں روپوشی کے دوران پوسٹر اور پمفلیٹ اپنے ہاتھوں سے لکھ کر ساتھیوں تک پہنچاتا تھا۔ ۹ اگست ۱۹۸۰ء کے دن دوپہر کو تقریباً ۲ بجے کھڈا مارکیٹ لیاری میں ساتھی یوسف سیف سومرو کو پوسٹر دینے گیا تو اس نے پوسٹر دیکھ کر اور حیران ہو کر کہا، ''کامریڈ اتنی جلدی پوسٹر تیار ہو گیا۔'' میں نے کہا کہ یار شرمندہ نہ کرو۔ یہ وقت تنقید کا نہیں بلکہ ساتھیوں کی جان بچانے کی مہم کو تیز کرنے کا ہے۔ نو دن گزر گئے، آج رات یہ پوسٹر آپ کو ہر علاقے میں لگانے ہیں۔ ساتھیوں کی جان کو خطرہ ہے۔ میں بھی دکھی تھا مگر ساتھی یوسف کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کامریڈ نذیر عباسی شہید ہو چکا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ آج ڈاؤ میڈیکل کالج میں کامریڈ نذیر عباسی کی شہادت پر ہڑتال ہو گی اور سندھ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے دوستوں نے احتجاجی اور تعزیتی اجلاس بلایا ہے۔

عوامی حلقوں میں کامریڈ نذیر عباسی کی شہادت کی خبر پہنچنے کی وجہ سول ہسپتال کراچی کے مردہ خانے کے ڈاکٹر تھے جنہوں نے ایجنسیوں کے دباؤ میں پوسٹ مارٹم رپورٹ جیسی بھی دی ہو مگر انہی ڈاکٹروں میں سے کچھ ڈاکٹرز اور طلبہ نے یہ بات عام کر دی کہ سندھ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے مرکزی صدر اور پاکستان فیڈرل یونین آف سٹوڈنٹس کے وائس چیئرمین کامریڈ نذیر عباسی کو تشدد کے ذریعے شہید کیا گیا ہے۔ ایجنسیوں نے نذیر کی لاش کی تصدیق اس کے بہنوئی کے بھائی سے کروائی اور لاش اسے دینے کی بجائے خود ہی سخی حسن قبرستان میں دفنا دی۔ کامریڈ نذیر عباسی کی شہادت کے بعد جو احتجاج کی لہر اٹھی، اس نے باقی کامریڈوں کی جان بچائی۔ کتنے جونیئر ساتھیوں کی ضد تھی کہ کچھ پولیس آفیسرز کو قتل کر کے کامریڈ نذیر عباسی کی شہادت کا بدلہ لیں اور باقی ساتھیوں کی جان بچانے کا انتظام بھی کریں جبکہ ہم اکثر دوست اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ ایجنسیاں خود ان

سے اس قسم کی توقع رکھتی تھیں جس کے نتیجے میں ہمارے اور بھی کتنے ساتھی دہشت گردی کے الزام میں گرفتار ہوتے اور ایجنسیاں ہمیں بھی الذوالفقار والے راستے پر دھکیلنے میں کامیاب ہو جاتیں۔

ایجنسیوں کی ایسی امکانی سازش کو ناکام بنانے کے لیے ہم نے نعرہ دیا کہ کامریڈ نذیر عباسی کے خون کا بدلہ عوام لیں گے۔ افغان انقلاب سے خوفزدہ جنرل ضیاالحق کی تنگ نظر مذہبی جنونیت کی آڑ میں جرائم پیشہ لوگوں کی سرپرست حکومت ایک چھوٹی سی جماعت کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے اس لیے بھی خوف زدہ تھی کہ یہ چھوٹی سی جماعت ذوالفقار بھٹو کی شہادت کے بعد دہشت گردی کی بجائے سیاسی طریقے سے جمہوری قوتوں کی جدوجہد کو آگے بڑھا رہی تھی۔۔ کامریڈ نذیر کی شہادت کے بعد ہمارے ساتھی زیادہ کھل کر اچانک احتجاجی مظاہرے کرنے لگے۔

کامریڈ نذیر عباسی کی شہادت کے تین دن بعد عید آئی۔ نشتر پارک کے عید کی نماز والے اجتماع کی پہلی صف میں دس پندرہ کامریڈ موجود تھے۔ نماز کے بعد نشتر پارک میں نعرے گونج اٹھے کہ کامریڈ نذیر عباسی کے قاتلوں کو پھانسی دو! حیران اور پریشان نمازی اس وقت تک بی بی سی اور ہمارے متعلق جان چکے تھے۔ اس لیے سینکڑوں نمازی پولیس کے پہنچنے سے پہلے سولجر بازار تک ہمارے ساتھ جلوس میں شامل رہے۔ حمیدہ گھانگھرو کی ہائی کورٹ میں رٹ پٹیشن کے جواب میں چیف جسٹس کے سامنے جب سرکاری وکیل نے یہ جھوٹا بیان دیا کہ کامریڈ نذیر کی موت بیماری کی وجہ سے ہوئی تو لوگوں نے چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ کی عدالت میں نعرے لگائے جسے دیکھتے ہی عدالت میں موجود ملک کی مشہور شاعرہ فہمیدہ ریاض نے اپنی مقبول عام نظم ''ایوانِ عدالت'' تخلیق کی۔ آج بھی ہم یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ نذیر عباسی کے قاتلوں کو گرفتار کر کے پھانسی دینی چاہیے۔''

جام ساقی کیس کے ایک ملزم اور معروف صحافی سہیل سانگی اس مقدمے اور نذیر عباسی کی شہادت کے حوالے سے کئی نئی تفصیلات سامنے لائے ہیں جن پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

''کسنجر نے بھٹو کے لیے کہا تھا میں تمہیں عبرتناک مثال بناؤں گا ویسے ہی ایشیائی ڈکٹیٹر ضیاالحق نے اپنی آمریت کی بھرپور جوانی میں کہا تھا کہ میں کمیونسٹوں کی گردنیں اڑا دوں گا! جو مارشل لاء کی مخالف اور جمہوری تحریک کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ پھر ہوا ایسا کہ دونوں نے اپنے قول کو ثابت کیا۔ جولائی ۱۹۸۰ء کے آخری ہفتے میں نذیر عباسی کو گرفتار کیا گیا، نذیر عباسی شہید پروفیسر جمال

نقوی، شبیر شر اور کمال وارثی جو جام ساقی کیس کے اہم جوابدہ تھے ان میں سندھ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر اور نوجوان رہنما نذیر عباسی انٹیروگیشن کے دوران تشدد میں شہید ہو گئے ۔ کچھ دنوں میں سہیل سانگی، امرلال اور بدر ابڑو کو بھی گرفتار کر کے اس قافلے میں شامل کیا گیا۔ سرکار نے ان پر غداری اور بغاوت، مارشل لاء کی مخالفت اور مارشل لاء حکومت کا تختہ الٹنے کے کیس دائر کیے اور ان پر کرنل عتیق کی فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ اس کیس میں دو سال پہلے گرفتار کیے گئے کمیونسٹ رہنما جام ساقی کو بھی شامل کیا گیا۔ مگر نذیر عباسی کو فوجی عدالت میں پیش نہیں کیا اس لیے کہ اسے پہلے سے تشدد کر کے مار دیا گیا تھا جام ساقی کیس جو پاکستان کی تاریخ میں کمیونسٹ کیس کے طور پر مشہور ہوا اس میں دفاع کے گواہوں کے طور پر محترمہ بے نظیر بھٹو سے لے کر ولی خاں، غوث بخش بزنجو، مولانا امروٹی، شیخ عدیل محمد اور مختلف شخصیتیں آئیں۔ اس کے سیاسی اور تاریخی تناظر کی اہمیت یہی ہے کہ یہ لوگ مارشل لاء کی مزاحمت کر رہے تھے۔ وہ بھی منظم مزاحمت۔ جب سیاسی پارٹیوں اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی تھی اخباروں پر بدترین سنسر شپ تھی تب مارشل لاء کی مخالفت میں کوئی اِکا دُکا واقعہ بھی بہت بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ انہوں نے تو منظم طریقے سے غیر قانونی رسالے اور پرچے چھپوائے تھے۔ نتیجے میں کمیونسٹ پارٹی کے جھنڈے تلے اور جام ساقی کی قیادت میں یہ گروہ نیک نامی اور اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے لوگوں میں مقبولیت حاصل کر رہا تھا اور لوگوں کو ان کے جواب میں حوصلہ مل رہا تھا۔ مارشل لاء انتظامیہ جو خفیہ ایجنسیوں کے اس وقت کے عملداروں کی رپورٹس اور صالح مشورے پر عمل کر رہی تھی، اس نے جب کمیونسٹ پارٹی کی جھوپڑ پٹی میں واقع ہیڈ کوارٹر پر چھاپا مارا تو وہاں سے ان کو دو ٹائپ رائٹر، سرخ پرچم اور ہلچل نام کی سائیکلوسٹائل پرچوں کی کاپیاں ملیں۔ یہ ضرور تھا کہ یہ رسالے مارشل لاء لگنے کے بعد بھی باقاعدہ چھپتے رہے اور سندھ میں بڑے پیمانے پر تقسیم ہوتے تھے۔ دفاع کے گواہ کے طور پر اس سامان کے متعلق بات کرتے ہوئے فوجی عدالت کے سربراہ کرنل عتیق اور میجر افتخار کو میر غوث بخش بزنجو نے کہا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ اتنے اور ایسے سامان سے ملک ٹوٹ سکتا ہے یا پھر افغانستان جیسا انقلاب آ سکتا ہے۔

گرفتار رہنماؤں میں بہت رنگینی تھی۔ نذیر سندھ یونیورسٹی کا طالب علم تھا جو نوخیز سیاستدان کے طور پر ابھر کر آیا۔ جمال نقوی پروفیسر، سہیل سانگی صحافی، بدر ابڑو ادیب، شبیر شر ٹی وی

آرٹسٹ گرفتاری کے بعد انہیں پر اسرار اور خفیہ طور پر چھپا کر فوجی کیمپس میں تشدد کیا گیا۔ اسی دوران ۱۹ اگست ۱۹۸۰ء کو نذیر عباسی شہید ہو گئے۔ اس کی لاش کے پوسٹ مارٹم سے پتا چلا کہ بہت گہرے گھاؤ تھے۔ مرنے کے بعد رات کے اندھیرے میں سخی حسن قبرستان میں دفنایا گیا۔ اس ساری کارروائی میں آپریشن کے لیے کرنل امتیاز جو بریگیڈیئر امتیاز کے طور پر مشہور ہوا اور کرنل سعید ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں۔ ان گرفتاریوں، اذیتوں اور نذیر عباسی کے قتل کی محکماتی تحقیقات خفیہ اداروں نے بھی کی مگر چوں کہ ان کی ہی تحویل میں موت واقع ہوئی اس لیے یہ بات کھل کر منظر عام پر نہ آسکی۔

حمیدہ گھانگھرو نے رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے فریاد داخل کرانے کے لیے ڈیفنس تھانے اور ناظم آباد تھانے کو درخواستیں بھیجیں مگر اس کی بھی کوئی داد فریاد نہ ہوئی نہ نذیر کے قتل کا کوئی پتا چلا اور نہ ہی فوجی عدالت میں کیس کے دوران نارتھ ناظم آباد تھانے کے ایس ایچ او صفدر اور اس وقت کے ایس پی ممتاز برنی کو انوسٹی گیشن آفیسر کے طور پر دکھایا گیا تھا۔ ان پولیس اہلکاروں نے صرف خانہ پوری کی تھی۔ درحقیقت شروع میں پانچ لوگ نذیر عباسی، جمال نقوی، کمال وارثی، شبیر اور سہیل سانگی گرفتار ہوئے تھے۔ ان کی نظر بندی کے خلاف نذیر عباسی کی بیوی حمیدہ گھانگھرو نے سندھ ہائی کورٹ میں حبس بے جا کی آئینی درخواست گرفتاری کے بعد تین دن کے اندر داخل کروائی تھی۔ اس آئینی درخواست کی پیروی معزز وکیل بیرسٹر ایس اے وودود اور اختر حسین ایڈووکیٹ کر رہے تھے۔

اس درخواست کی شنوائی کے دوران ہائی کورٹ کو بتایا گیا کہ پوچھ گچھ کے دوران نذیر عباسی کی موت تشدد اور ٹارچر کی وجہ سے ہوئی ہے۔ عدالت میں سرکار کی طرف سے اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کو چیلنج کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ اس پر سپلیمنٹری رپورٹ لکھی ہوئی ہے۔ اس لیے سپلیمنٹری رپورٹ پیش کرنے پر وکیلوں اور پٹیشنر حمیدہ گھانگھرو کے اس موقف کو سہارا ملا کہ واقعی نذیر کو تشدد کے ذریعے مارا گیا تھا۔ وکیلوں نے عدالت کو درخواست دی کہ لاش کے پوسٹ مارٹم کا دوبارہ حکم دیا جائے مگر ہائی کورٹ نے بتایا کہ لاش نکال کر دوبارہ پوسٹ مارٹم کا اختیار ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ہے۔ سندھ ہائی کورٹ کے اسی ریمارکس پر اختر حسین ایڈووکیٹ نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں ۱۸ اگست ۱۹۸۰ء کو درخواست دی۔ جس میں گزارش کی گئی تھی کہ ان کو خدشہ ہے کہ

نذیر عباسی کی موت ماڑی پور ٹارچر سیل میں تشدد کے ذریعے ہوئی ہے۔ اس لیے اس کی لاش کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کرنے کا حکم دیا جائے۔ مگر اس وقت کے ڈپٹی کمشنر ساؤتھ شفیق احمد خان کیس کی نازک نوعیت کے باوجود ڈھائی مہینوں تک فیصلہ نہ دے سکے۔ آخر ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو سرکاری وکیل اور ایس ایچ او ڈیفنس کے بیان قلمبند کرنے کے بعد درخواست کو خارج کر دیا گیا۔ کہا گیا کہ ماڑی پور ضلع ایسٹ میں ہے اور وہاں پر درخواست دی جائے۔ یہ پٹیشنر اور وکیلوں کی دلیل تھی کہ یہ واقعہ ماڑی پور سیل میں ہوا جس کا ذکر وہ درخواست میں کر چکے تھے۔ مگر ڈھائی مہینے گزر جانے کے بعد لاش کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کروانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اسی درخواست اور شنوائی کے دوران پولیس کی طرف سے جو بیان دیئے گئے وہ نذیر عباسی کی موت کی وجہ اور ذمہ داروں کے حوالے بہت اہم ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس پورے کیس کا ریکارڈ موجود ہے، جو فوری طور پر ذمہ داروں کو تلاش کرنا چاہیے۔

ڈیفنس تھانے کے اس وقت کے ایس ایچ او نے لکھت میں یہ بیان دیا اور قبول کیا کہ نذیر عباسی کی بیوی حمیدہ گھانگھرو کی ایک درخواست آئی ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ اس کے شوہر نذیر عباسی کو ماڑی پور سیل میں قتل کیا گیا ہے یہ فریاد داخل کی جائے اور ایف آئی آر کاٹی جائے مگر اس نے عدالت کو یہ نہیں بتایا کہ اس درخواست کے ملنے کے بعد کون سی کارروائی کی گئی۔ پولیس آفیسر نے عدالت کو یہ نہ بتایا کہ نذیر عباسی کی لاش پی این ایس شفاء (نیول ہاسپٹل) میں لائی گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ ایس پی نے فون کر کے پوچھا کہ کس کی پی این ایس شفا میں لاش آئی ہے۔ جب وہ پی این ایس شفا پہنچا تو وہاں پر ایف آئی سی کا ایک حوالدار ملا جو لاش لے کر آیا تھا۔ مگر وہ لاش کے متعلق میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ ہم نے وہاں سے لاش لے کر سول ہسپتال سے پوسٹ مارٹم کروایا اور اسے سخی حسن قبرستان میں دفنا دیا۔ قانونی ماہرین کا کہنا ہے کہ تحویل میں موت جس کے اسباب واضح ہوں اور عام لوگوں میں شک وشبہات ہوں تو اس معاملے کی عدالت کی طرف سے تحقیقات کروائی جاتی ہے۔ انہوں نے نذیر حسین کی موت کی عدالتی تحقیقات بھی نہیں کروائی۔''

اس ضمن میں خود اختر حسین ایڈووکیٹ کی بیان کردہ تفصیلات اور ان سے کیے گئے سوالوں کے جواب اس معاملے پر مزید روشنی ڈالتے ہیں:

''اختر حسین نامور وکیل ہیں مگر سندھ کے لوگوں نے ان کا نام وکیل کے طور پر کم اور ترقی پسند سیاستدان کے طور پر زیادہ سنا ہے۔ نیشنل عوامی پارٹی، پاکستان سوشلسٹ پارٹی، ورکرز پارٹی اور دوسری ترقی پسند جماعتوں کے سرگرم رہنما رہے ہیں۔ ملک میں انسانی حقوق کے خلاف ہونے والی قانونی جنگ میں ان کا بھی کردار ہے۔ ملک میں ترقی پسند پارٹیوں کے خلاف جو سازشیں ہوئیں ان کو منظر عام پر لانے اور ترقی پسند سیاسی رہنماؤں کی قانونی مدد کرنے تک اختر حسین ایڈووکیٹ کا کردار قابل تعریف رہا ہے۔ بدترین آمریتی دور میں ان کا امر کردار تاریخ میں ہمیشہ یادگار کے طور پر پہچانا جائے گا۔ جام ساقی کیس میں بیرسٹر عبدالودود اور اختر حسین ایڈووکیٹ وکیل تھے۔ ۹ اگست ۱۹۸۰ء کو نذیر عباسی کے شہید ہونے کے بعد عبدالودود اور اختر حسین نے ہائی کورٹ میں نذیر کی بیوی حمیدہ گھانگھرو کی طرف سے پٹیشن داخل کی تھی، نذیر عباسی کی شہادت اور کیس کے متعلق کی گئی بات چیت یہ تھی:

سوال: آپ نذیر عباسی اور اس کے ساتھیوں کے وکیل تھے؟ آمریتی اور مارشل لاء دور میں وکیل ہونے کے وقت کیا محسوس کیا اور آپ کو کون سی مشکلات پیش آئیں؟

جواب: اصل میں اس کیس کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ ہے کہ جنرل ضیا نے یہ کیس ترقی پسندوں اور کمیونسٹوں کے خلاف بنایا تھا اور ہم جمہوریت پسند ہونے کے ناتے اس کیس کو رد کر رہے تھے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کیس کو ہم انسانی اور جمہوری حقوق کے خلاف سازش سمجھ رہے تھے۔ بطور وکیل اپنا فرض سمجھتے ہوئے اسے لڑا کیوں کہ ضیا کے پورے دور میں جو بھی انسان ملٹری کے رول کی مخالفت کرتا تھا اسے ملک دشمن کہا جاتا تھا۔ اس وقت ملک کی حالت یہ تھی کہ ملک میں جمہوری ادارہ نہ ہونے کی وجہ سے فوج کا سیاست میں عمل دخل بڑھ گیا تھا۔ اس وقت جو لوگ کہتے تھے سیاست میں فوج کی مخالفت غلط ہے آج اتنے سال گزرنے کے بعد یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ وہ لوگ جو جمہوری اداروں کی بحالی اور فوج کی مخالفت کرتے تھے وہ صحیح تھے۔ دوسری بات ہے ڈیموکریٹک سٹینڈ کی۔ اس کے اداروں کی زیادہ مخالفت نہ صرف عوام کے لیے بلکہ ملک کے لیے بھی خطرناک ہے اور آج اس کا ثبوت بھی مل گیا ہے اور آج یہ سب کچھ ثابت ہو رہا ہے کہ آئی ایس آئی اور دوسری ایجنسیاں کیسے سیاست میں ملوث تھیں۔ میں کہتا رہا ہوں کہ آئی ایس آئی کا باقاعدہ سیاسی

رول ۱۹۷۳ء سے شروع ہوا، نیپ کے دور میں انٹر سروسز ایجنسی ''آئی ایس آئی'' نے بنیادی سیاسی کام شروع کیا۔ خود اسلم بیگ نے یہ بات کہی ہے کہ ہمیں سیاسی ذمہ داریاں ۷۳ء کے بعد دی گئیں۔ اس حوالے سے ہم سمجھ رہے تھے کہ مارکسٹ کارکنوں یا ترقی پسندوں کے خلاف جو کیس ہوئے وہ سب بے بنیاد تھے۔ اس لیے کہ آگے چل کر کیس کرنے والے خود ان کیسوں سے دستبردار ہو جائیں گے۔ ایسے سارے کیس نیپ کے خلاف مقدمہ سازش کیس یا کیمونسٹوں کے خلاف ہوئے وہ سب کیس اب جھوٹے ثابت ہو چکے ہیں۔ اس لیے ہم نے ان کیسوں کے خلاف جو قانونی جنگ لڑی تھی وہ جنگ صحیح تھی۔

سوال: نذیر عباسی کا کیس کچھ منفرد بن گیا یعنی نذیر کے شہید ہونے کے بعد اس کیس کو منظر عام پر لانے کے لیے آپ کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ ایک وکیل کے طور پر آپ نے اس وقت اس کیس کو کیسے محسوس کیا؟

جواب: خود میرا ذاتی طور پر اس وقت ایسے لوگوں سے واسطہ تھا جو اس مقصد کے لیے لڑ رہے تھے جس مقصد کے لیے نذیر عباسی جدوجہد کر رہا تھا، دوسرا یہ کہ ایک جمہوری حق کے لیے لڑنا وکیل کی ڈیوٹی میں شامل ہے اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے خلاف آواز اٹھانا وکیل کے پروفیشن ازم کا حصہ ہے اس لیے میں نے سب کچھ محسوس کرتے ہوئے یعنی آرمی سمیت مختلف اداروں کی مخالفت تو کی مگر اس کے باوجود نذیر عباسی کا کیس میں نے بطور ایک وکیل کے لڑا۔

سوال: اس وقت آپ کے لیے کوئی رکاوٹیں پیدا ہوئیں؟

جواب: عدالت تک پہنچنے والے مرحلے تک تو کوئی رکاوٹیں نہیں تھیں سوائے پروفیشنل کیریئر میں رسک اٹھانے والی بات، جو میں نے آپ کو بتائی ہے۔ باقی نذیر عباسی یا جام ساقی کیس کی نسبت نیپ والے کیس میں عدالت تک پہنچنے میں بھی رکاوٹیں کھڑی کی گئی تھیں۔ اس لیے کیس جیل کے اندر چلتے تھے۔ ہم مختلف وکیل کیس لڑنے کے لیے حیدرآباد جاتے تھے اس وقت بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جیل والے کہتے تھے کہ ہم آپ کے بریف کیس چیک کریں گے مگر ہم انہیں کہتے تھے کہ ہم اپنے کیس کی دستاویز آپ کو کیسے دیں؟ اس پر اکثر جھگڑا ہوتا تھا۔ دوسرا یہ کہ کورٹ کی طرف سے حکم تھا کہ حکومت ہمارے رہنے کے لیے اچھے ہوٹل کا بندوبست کرے، مگر بااختیار عملداروں کی

طرف سے اس کے الٹ کیا جاتا تھا اور ہمیں کسی بھی ہوٹل میں کمرہ نہیں ملتا تھا اور کبھی کبھی مجبور ہو کر ہم وکیلوں کو چھوٹے فٹ پاتھی ہوٹلوں میں رہنا پڑتا تھا جب کہ اس وقت سرکاری وکیلوں کو سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا جاتا تھا۔

سوال: اتنے سال گزر جانے کے بعد قانونی نقطہء نگاہ سے اس وقت نذیر عباسی کے کیس کو دوبارہ کھولنے پر آپ کیا کہیں گے؟

جواب: نذیر عباسی کے کیس کے بارے میں میرا خیال یہی ہے کہ اس کیس کے جواب داروں کے خلاف تحقیقات ہونی چاہیے کیوں کہ قانونی طور پر ایک ایف آئی آر داخل ہے۔ قتل کی ایف آئی آر داخل ہونے کے بعد اس کی انوسٹی گیشن ہونا قانونی فرض ہے۔ آج تک نذیر عباسی کے دوست اور ساتھی مطالبہ کرتے آئے ہیں کہ اس کیس کی تحقیقات ہونی چاہیے۔ یہ مطالبہ بالکل قانونی اور اصولی اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ آج میں ایک وکیل کے طور پر کہہ رہا ہوں کہ انصاف کے تقاضے پورے ہونے چاہئیں کیوں کہ نذیر عباسی کے کیس میں خود سرکاری اہلکاروں نے یہ بات مانی ہے کہ نذیر عباسی کی موت اداروں کی تحویل میں ہوئی ہے اور اس کے ہمارے پاس دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔ تو پھر سرکار کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس کیس کی پوری پوری تحقیقات کروائے اور کیس میں ملوث لوگوں کو بے نقاب کرے۔''

یہ موضوع اب تک زیر بحث ہے اور جام ساقی مقدمے کے بعض ملزم اب تک اس مقدمے میں تحقیقات کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ خاص طور پر جب اس مقدمے کے بعض ملزم نذیر عباسی کے قاتل کو پہچاننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس مقدمے کے ایک ملزم شبیر شر نے اس معاملے کو زیر بحث لاتے ہوئے بتایا ہے کہ اگر تفتیشی پریڈ کروائی جائے تو سینکڑوں لوگ امتیاز (بلا) کو پہچان لیں گے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ نذیر عباسی قتل کی نئے سرے سے تحقیقات کروائی جائے۔ یہ کیس شہید ذوالفقار علی بھٹو، شہید ناصر بلوچ، شہید ایاز سموں، ادریس طوطی اور رزاق جھرنا کے کیس سے بالکل مختلف ہے اس لیے کہ ان پر جھوٹے الزامات ہی سہی مگر مقدمے عدالتوں میں چلائے گئے۔

نذیر عباسی پر نہ کسی کورٹ میں کیس چلایا گیا اور نہ کسی قتل، ڈاکے یا لوٹ مار کا کوئی الزام تھا اگر اس پر الزامات ہوتے تو عدالت میں کیس چلا کر اس کی تحقیقات کروانے میں مشکلات

ہوتیں۔ مگر اسے ایک معمولی پمفلیٹ کیس میں گرفتار کیا گیا تھا، اس وقت جو آئی ایس آئی کا سربراہ لیفٹیننٹ کرنل امتیاز جو ریٹائر ہونے کے بعد بریگیڈیئر امتیاز (بلا) کے نام سے مشہور ہوا، نے ایشیا کے ماڈل ڈکٹیٹر ضیاالحق کے پاس نمبر بنانے کے لیے چار کمیونسٹوں کو گرفتار کر کے ڈرامہ رچایا، کہ اس نے بڑی سازش پکڑی ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے پاکستان کی بنیاد کو گرانے والے خطرناک مجرم گرفتار کیے ہیں جب کہ ان الزامات میں سے ایک بھی الزام ثابت کرنے سے پہلے ۹ اگست کو نذیر عباسی، کمال وارثی، سہیل سانگی اور مجھ پر مسلسل تشدد کیا گیا۔ ہمیں ایک کھولی میں مکمل قید تنہائی میں رکھا گیا۔ موت کے سزا یافتہ قیدیوں کو بھی ایک گھنٹہ چہل قدمی کے لیے باہر نکالا جاتا ہے، مگر ہمیں چوبیس گھنٹے بند رکھا گیا۔

امتیاز (بلا) نے الزام لگایا کہ ہم نے ملک سے غداری، کے جی بی سے پیسے لے کر سوویت یونین کے مفادات کے لیے کام کیا حالاں کہ ان میں سے ایک الزام بھی ثابت نہیں ہوا۔ افسوس کی بات یہ کہ نذیر عباسی شہید کے کیس کو ۱۴ دن بعد زیر بحث لایا گیا۔ اس وقت پارٹی ختم ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھی بڑے سرکاری عہدے لے کر بیٹھے تھے۔ کوئی بھی اس کا ساتھی یہ درخواست کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ نذیر عباسی کے قاتلوں پر کیس چلایا جائے اور سب کو ڈر تھا کہ ان کی نوکری نہ چلی جائے! نذیر عباسی کے سارے رشتہ دار سب غیر سیاسی اور خوفزدہ تھے کہ ایک تو مر گیا، دوسرا بھی نہ چلا جائے۔ نذیر عباسی کی بیٹی موتیا بہت معصوم اور چھوٹی تھی، اسے ان ساری باتوں کا علم نہیں تھا۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ شہید نذیر عباسی کے کیس میں خاموش رہنے والے اس کے ساتھی اس کے ساتھ کیے ہوئے وچن اور وعدوں سے غداری کر رہے تھے۔ اور میں بھی ان میں شامل ہوں۔ میں بھی آج تک اپنے آپ سے لڑتا رہا ہوں؟ کیوں آگے بڑھوں؟ میرے بچے چھوٹے ہیں، میں نے ان کے لیے کیا کیا؟؟؟ موتیا کے لیے کوئی بھی نہیں ہے؟؟ جہاں تک بریگیڈیئر امتیاز کا تعلق ہے اس کے ثبوت موجود ہیں، جب اس کی تصویریں اخبار میں چھپیں تو میں نے اسے پہچان لیا کہ یہ وہ شخص ہے جس کی قیادت میں آئی ایس آئی کی ٹیم نے ۲۹ جولائی ۱۹۸۰ء کو پیپلز کالونی سے ہمیں گرفتار کیا تھا۔ ہمیں گرفتار کر کے ایم پی اے ہاسٹل لے آئے۔ ایم پی اے ہاسٹل میں اس وقت فوجی عدالتیں اور ایس ایم ایل کا ہیڈ کوارٹر قائم کیا تھا۔ کوئی کمرا خالی کروانے کے لیے ہمیں آدھا گھنٹا جیپ

میں بیٹھنا پڑا وہاں پر چار پانچ میجر ہمیں دیکھنے کے لیے آئے، ایک میجر کے پوچھنے پر ایک سادہ کپڑوں والے نے بتایا کہ یہ کرنل امتیاز کے مہمان ہیں۔ اور اس کے بعد اس نے ٹارچر کیمپ میں خود کھڑے ہو کر ہم پر تشدد کروایا۔ وہی وحشی درندہ نذیر عباسی کا قاتل ہے۔ اس پر کھلی عدالت میں کیس چلایا جائے۔ ہم بھی گواہی دیں گے۔ میں اپنے لیے تو یقین سے کہہ رہا ہوں باقیوں کے لیے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ نذیر عباسی کیس کی تحقیقات غیر جانبدارانہ بنیادوں پر کرائی جائے، یہ تحقیقات ہائی کورٹ کے سینئیر ججز سے کرائی جائے۔''

شبیر شر کے برعکس نذیر عباسی کے پرانے ساتھی میر تھیبو کا موقف قطعی مختلف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شہید شخصیتوں یا گزرے ہوئے ساتھیوں کے ساتھ ہم عظمت کی من گھڑت کہانیاں جوڑ دیتے ہیں یا ایسی باتیں منسوب کر دیتے ہیں جو انہوں نے کبھی نہیں کہی ہوں گی۔ ظاہر ہے مرا ہوا انسان کسی بات کی تصدیق یا تردید نہیں کر سکتا۔ حیدر بخش جتوئی کو بہت زیادہ بین الاقوامی شخصیت بنا دیں گے یا پھر شہید نذیر عباسی کو سندھ کی قومی جدوجہد کا ہیرو بنا کر پیش کریں گے حالاں کہ نذیر کمیونسٹ پارٹی کے اندر قوم پرستی کے معمولی رجحانات کے خلاف بھی بہت بڑی نظریاتی جنگ چھیڑ دیا کرتا تھا۔ افسوس ناک بات یہ بھی ہے کہ کچھ دوست تو ٹارچر سیل کے متعلق بھی من گھڑت کہانیاں لکھ دیتے ہیں۔ یہ کہ نذیر نے ٹارچر کرنے والوں سے کہا تھا کہ ''مجھ سے میرا نام اگلوا کر دکھاؤ جبکہ میرا نام تم لوگ جانتے بھی ہو۔'' یا یہ کہ اس ٹارچر سیل میں نذیر کے خون سے اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ حالاں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے کہ جو لوگ بھی نذیر کے ساتھ گرفتار ہوئے تھے، ان میں سے کوئی بھی یہ نہ جانتا تھا کہ وہ لوگ اسے کہاں لے جا رہے ہیں، ہر ایک کو الگ الگ سیل میں رکھا گیا تھا۔ کیوں کہ نذیر کو جیسے ہی وہاں سے لے گئے تو پھر اسے واپس نہیں لایا گیا۔ نذیر سے کیا پوچھا گیا۔ اس نے کیا جواب دیئے۔ اسے کیسے ٹارچر کر کے مارا گیا۔ یہ کسی کو کچھ پتا ہی نہیں۔ یہ بات صرف ٹارچر کرنے والے ظالم ہی جانتے تھے۔ یہاں تک کہ شہید کی لاش بھی کسی نے نہیں دیکھی بلکہ ایدھی کے زیرنگرانی دفنا دی گئی۔ فیض گھانگھرو نے قبرستان کے چوکیدار سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ واقعی کچھ لوگ آئے تھے جو ایک آدمی کو دفنا کر گئے۔ کس کی میت تھی، یہ مجھے پتا نہیں۔ اس دن سے آج تک پارٹی سیکریٹری سے لے کر ممبر تک کسی کو پتا نہیں کہ نذیر پر کیا گزری۔ بے نظیر کے دورِ حکومت میں میں

نے اسماعیل اوڈھیجو کو کہا کہ آپ نذیر کا کیس اوپن کرنے میں ہماری مدد کریں تو ان کا کہنا تھا کہ ہم اپنے شہید کا کیس اوپن نہیں کر سکتے۔ تو نذیر کا کیس کیسے اوپن کر سکتے ہیں۔ نذیر کی شہادت کا قصہ تب ہی پتا چل سکتا ہے جب کوئی ایسی جمہوری حکومت آئے جس پر خفیہ ایجنسی حکمرانی نہ کر رہی ہو۔ ایسی جمہوری حکومت جو مجبور نہ ہو۔

میر تھیبو نے تفصیل سے نذیر عباسی کی یادیں لکھی ہیں۔ پہلی ملاقات سے آخری ملاقاتوں تک۔ یحیٰی خان کے دور میں میر تھیبو حیدرآباد جیل سے منتقل ہو کر کراچی لائے گئے۔ جہاں نذیر سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی۔ ان دنوں نذیر فرسٹ ائیر کا طالب علم تھا اور آزاد مارو ڑ سٹوڈنٹس کی طرف سے گرفتار ہو کر جیل میں آیا تھا۔ بیس سال کا ایک خوبرو نوجوان، جو میر تھیبو، ڈاکٹر رشید حسن خان، ڈاکٹر اعزاز نذیر اور ڈاکٹر ارباب کے درمیان ہونے والی تند و تیز بحثوں کو بڑی دلچسپی سے سنتا۔ وہ مذاق بھی بہت کرتا۔ برصغیر کے نوجوانوں کی طرح عاشقانہ اور دکھی گانے بھی گاتا تھا۔

جیل میں نذیر کو کبھی میں نے بیزار یا خفا ہوتے نہیں دیکھا۔ آخر میں کراچی جیل میں میرے اور نذیر کے علاوہ سب طالب علموں نے معافی نامے لکھ کر دیئے اور آزاد ہو گئے۔ اس وقت آزاد ہونے والے ہمارے ساتھی جاتے ہوئے یہ بھی کہتے تھے کہ تمہیں کیا ہے تم لوگ پڑھو گے نہیں تمہیں تو صرف سیاست کرنی ہے، آپ جیسے یہاں ویسے ہی باہر، دونوں جگہ آپ کے لیے کوئی فرق نہیں۔ ہمیں ڈاکٹر انجینئر بننا ہے۔ کچھ سچی بات کرتے کہ بھائی کیا کریں مجبوری ہے۔ نذیر کے مارو ئڑا فیڈریشن والے ساتھی بھی معافی نامہ لکھ کر آزاد ہو گئے تھے حالاں کہ نذیر اس وقت مارکس وادی بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کی اپنی ذات سے سچائی اور اپنے ضمیر اور مقصد کے ساتھ کمٹمنٹ تھی۔ ظلم کے آگے جھکنے کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ کراچی جیل کا ہی ایک واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک دن سکیورٹی پرنٹنگ پریس کے مزدور لیڈر محمد یامین نے مجھ سے کہا کہ میرے ساتھ چلو ذرا جیل سپرنٹنڈنٹ کو آنکھیں دکھائیں کہ وہ ہمیں سہولیات کیوں نہیں دیتا؟ سپرنٹنڈنٹ بھی ایک ٹیڑھے مزاج کا آدمی تھا۔ منظور پنہور جانا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے سوچا کہ انکار کروں گا تو یہ مجھے بزدل سمجھے گا۔ میں معمولی جھگڑوں میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ خیر ہم سپرنٹنڈنٹ کے سامنے پہنچے وہ بھی پہلے سے غصے میں تھا، اس نے ایسا ڈانٹا کہ یامین آفس میں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے سپاہیوں

کو حکم دیا اسے ہسپتال لے جایا جائے اور میرے لیے حکم دیا کہ مجھے بند وارڈ میں بند کر دیا جائے۔ اس پر عمل ہوا تو نذیر نے احتجاجاً بھوک ہڑتال کر دی۔ نذیر نے بھوک ہڑتال کے ساتھ ساتھ پانی پینا بھی چھوڑ دیا۔ شام تک نذیر کی طبیعت خراب ہوگئی۔ خشکی کی وجہ سے اس کا گلا بند ہو گیا۔ اس کی وجہ سے سپرنٹنڈنٹ ڈر گیا کہ لڑکے کو کچھ ہو ہی نہ جائے، لہٰذا مجھے مجبوراً بند وارڈ سے نکالا گیا۔ تب جا کر نذیر نے پانی پیا۔ حالاں کہ ہم تو بھوک ہڑتال بھی اچھی طرح نہیں کر سکتے۔ فرض کے لیے اور کسی بھی بڑے آدرش کے لیے جان دینا تو بڑی بات ہوتی ہے۔ لیکن وہ ایک دوسری تنظیم کے قیدی ساتھی کی معمولی سی تکلیف ختم کرنے کے لیے جان دینے کے لیے تیار تھا۔ نذیر کو دیکھنے سے یوں لگتا تھا کہ اس نے مختصر زندگی میں بہت بڑے دکھ دیکھے ہیں۔ مگر اس کا اظہار کبھی نہیں کرتا تھا۔ اس نے بہت زیادہ غربت کے دن دیکھے ہوئے تھے۔ لیکن وہ اس کے باوجود ایک صحت مند خودداری کا مالک تھا۔ اسے جیل میں یہ فکر نہیں ہوتی تھی کہ کوئی ملاقات کے لیے آتا ہے یا نہیں۔ میں ۱۹۷۲ء میں سیاست چھوڑ کر گاؤں چلا گیا تھا۔ نذیر بھٹو کے دور میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوا۔ سندھ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن (SNSF) میں کام کرتا تھا۔ ایک دفعہ میرے گاؤں آیا۔ تاج جویو بھی جی ایم سید کی ہدایت پر کسی سروے کے لیے آیا تھا۔ رات کو بحث ہوگئی۔ مجھے موضوع اچھی طرح یاد نہیں لیکن کچھ کمیونسٹ اور قوم پرستوں کے جھگڑوں کے بارے میں تھا۔ میری رائے تھی کہ کمیونسٹ اور قوم پرستوں کے جھگڑے بہت نقصان دہ ہیں۔ یہ کمیونسٹ پارٹی کی ڈیوٹی ہے کہ وہ قوم پرستوں کو اپنے ساتھ ملائے رہے۔ ماضی میں جی ایم سید کمیونسٹ اتحادی رہے تھے۔ نذیر نے کوئی خاص رائے نہیں دی کیوں کہ وہ ابھی حال ہی میں کمیونسٹوں کا اتحادی بنا تھا۔ وہ صرف بحث سن رہا تھا۔ مجھے اس وقت یہ احساس نہیں ہوا کہ نذیر آگے چل کر Hard Liner بنے گا۔ کیوں کہ وہ دیکھنے میں نرم مزاج لگتا تھا۔ کسی بھی شخص کے بارے میں سرسری رائے نہیں دیتا تھا۔ نہ ہی الزام تراشی کرتا تھا۔ کچھ لوگوں نے نذیر کو کہا کہ میر سید کا ساتھی بن گیا ہے۔ یہ بات اس نے نہیں مانی۔ میری نذیر سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی تھی۔ حیدرآباد میں روزی کارنر میں میں آتا تھا۔ اس کی میرے مرحوم بھائی مختار سے بحث ہوا کرتی تھی۔ میں بالکل نہیں کرتا تھا۔ میرا اس وقت مجموعی طور پر زندگی کی طرف رویہ Withdrawl کی طرح کا ہوتا تھا۔ ۱۹۷۸ء میں ایک دل دکھانے والا واقعہ مجھے یاد ہے۔ انٹرنیشنل ہاسٹل کے میدان میں جیسے

سندھ کے فنکشن میں نذیر کے بال نوچے گئے اور پٹائی بھی کی گئی۔ جس کے بعد مجھے وہ سندھ یونیورسٹی کیمپس میں ملا تھا۔ مجھے اس نے خود نہیں بتایا SNSF کے ایک طالب علم نے بتایا۔ میں نے اس سے اس بات کی تصدیق کی تو اس نے کہا، ''ہاں۔'' میں نے اس کے چہرے کو افسوس اور دکھ سے دیکھا، لیکن اس کے چہرے پر افسوس تھا نہ ڈر نہ کوئی بے عزتی کا احساس تھا۔ بلکہ ایک قسم کا ایسا تاثر دے رہا تھا کہ انقلابیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے اکثر اس کے منہ سے یہ بات سنی کہ ''دنیا کی کوئی بھی طاقت یہاں پر کامریڈوں کو پٹنے سے نہیں روک سکتی۔'' یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگتا تھا۔

میں ۱۹۷۹ء میں پھر سے پارٹی میں شامل ہو گیا۔ مگر چوں کہ اس وقت پارٹی میں زیادہ ڈسپلن تھا اور جمال نقوی کی ہی زیادہ تر چلتی تھی۔ نذیر اگر پارٹی میں سے سب سے زیادہ متاثر تھا تو وہ جمال نقوی سے ہی متاثر تھا۔ اس لیے مجھے نذیر نے بتایا کہ پارٹی نے طے کیا ہے کہ کیوں کہ تم پارٹی چھوڑ کر پھر سے دوبارہ آئے ہو، اس لیے تمھیں گروپ میں بٹھاتے ہیں اور تمہارا گروپ صالح بلو سے بناتے ہیں کیوں کہ تم دونوں ایک ہی سیاسی محاذ پر کام کر رہے ہو۔ اس کا انچارج نذیر خود بنا، اس وقت نذیر مرکزی کمیٹی کا ممبر اور سندھ صوبائی کمیٹی کا سیکریٹری تھا۔ مجھے پہلے اس کا احساس نہیں تھا کہ نذیر اتنی جلدی اوپر تک پہنچ گیا ہوگا۔ وہ انچارج ہوتے ہوئے بھی خود پر ڈسپلن لاگو کرتا تھا۔ اور دوسروں پر بھی اس کے لیے سختی برتتا تھا۔ جبکہ دوسرے انچارج صرف دوسروں پر ڈسپلن لاگو کرواتے تھے۔ نذیر پارٹی نظریے اور انقلاب کو اپنے گھر اور بچوں سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ ایک تو اس کی چھوٹی بیٹی (جو اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی) زرقا بہت بیمار ہو گئی کیوں کہ پیسے نہیں تھے حالاں کہ پارٹی کے پیسے اس کے پاس تھے۔ لیکن اس نے اپنی ذاتی ضرورت کے باوجود پارٹی کے پیسے استعمال نہیں کیے۔ اپنی ذات اور بچوں کی بجائے پارٹی کا کام بھی بہت زیادہ کرتا تھا۔ دونوں صورتوں میں وہ زرقا کا علاج نہیں کروا سکا۔ میٹنگ میں کبھی بھی دیر سے نہیں آتا تھا نہ ہی غیر حاضر رہتا۔ سچ کتنا بھی کڑوا ہو بول دیتا تھا، پھر کسی کو اچھا لگے یا برا۔ پارٹی لیڈر ہونے کے باوجود دکھاوا نہیں کرتا تھا۔ نہ ہی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا۔ دانشور تو نہیں تھا لیکن مارکس اور لینن کا بہت مطالعہ رکھتا تھا جو اس کی گفتگو اور بحث سے چھلکتا تھا۔

ایک دن سی ایس ایس آفیسر نے مذاق ہی مذاق میں نذیر سے پوچھا کہ Matter in

Motion کو فلسفے کی روشنی میں سمجھاؤ۔ نذیر ایک ہونہار طالب علم کی طرح سمجھاتا گیا۔ نذیر کارکنان کی نظریاتی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ دیتا تھا۔ انقلابیوں کی تدریسی پڑھائی کو غیر اہم سمجھتا تھا۔ ضلعی کمیٹی میں امداد چانڈیو سے بحث ہوگئی۔ اس وقت مجھے بھی جلدی پروموشن دے کر حیدرآباد ضلعی کمیٹی میں لایا گیا تھا۔ امداد چانڈیو پر وارنٹ تھے اس لیے نذیر نے کہا کہ تم کلاس اٹینڈ کرنے مت جاؤ۔ اس پر امداد نے کہا کہ طالب علم کو پڑھنا بھی چاہیے آخرکار ڈگری بھی تو لینی ہے۔ اس پر نذیر نے ٹوک کر کہا کہ انقلاب کے بعد یہ ڈگریاں کام آئیں گی کیا؟ بہرحال امداد کا خیال تھا کہ گرفتار ہونا ہو تو ہو جاؤں مگر کلاس ضرور اٹینڈ کروں گا۔ نذیر میں کسی قسم کا کوئی Complex نہیں تھا۔ مڈل کلاس سے اس کی بالکل نہیں بنتی تھی۔ اس کلاس کے ہمدردوں اور چندہ دینے والوں کے پاس مجھے بھیجتا تھا۔ کہتا تھا کہ ان کو تم جانو۔ اس کے دور میں مڈل کلاس کے بہت کم لوگ ہوتے تھے۔ پارٹی اور ذیلی تنظیم کو ہمیشہ فعال رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ بہت بااخلاق اور اعلیٰ اقدار کا مالک شخص تھا۔ ورکر کے دکھ سکھ کا بہت خیال رکھتا تھا۔ لیکن خوش مزاج ہونے کی وجہ سے گالیاں دیتا، جس کی وجہ سے کامریڈ گھنشام پرکاش نے اوپر تک شکایت کردی۔ نذیر کہتا تھا کہ زندگی اتنی خشک ہے کہ مذاق اور گالی برائے مذاق بھی نہیں دیتے تو پھر دم گھٹنے لگتا ہے۔ رُوپوش زندگی کے اصولوں پر سختی سے عمل کرتا تھا۔ روپوش تو ہم میں سے اکثر رہتے لیکن وہ بغیر پیسوں کے بھی گزارا کر لیتا تھا۔ نذیر کو سینما میں فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ روپوشی کے دنوں میں بھی فلمیں دیکھنے جایا کرتا تھا۔ اپنی بیوی اور بیٹی سے بہت پیار کرتا تھا مگر اس کا اظہار کبھی نہیں کرتا تھا۔ زرقا فلم اسے بہت پسند تھی اور اس نے یہ فلم کئی مرتبہ دیکھی۔

فلم میں زرقا کردار سے متاثر ہوکر اپنی بیٹی کا نام زرقا رکھا۔ لیڈرشپ میں وہ واحد انسان تھا جس کے جذبے اور باتوں سے لگتا تھا کہ یہ انسان انقلاب لائے گا یا راہ میں مارا جائے گا۔ کئی ایسے مواقع آئے کہ ہمیں ڈر لگتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں کبھی ڈر نہیں دیکھا حالاں کہ قلی کیمپ میں بقول اس کے کہ آخری وارننگ دی گئی تھی کہ اگر پھر پکڑے گئے تو جان سے ماردیں گے اور ان کی وارننگ کو نذیر سچ جانتے ہوئے بھی کام کرتا رہا۔ کچھ ماہ بعد مجھے صوبائی کمیٹی کے لیے چنا گیا۔ پارٹی میں ہر کامریڈ کو اس وقت پارٹی انچارج اور اوپری کمیٹی کی سفارش پر چنا اور سلیکٹ کیا جاتا تھا۔ الیکشن نہیں ہوتے تھے بلکہ سلیکشن ہوتی تھی۔ صوبائی کمیٹی میں اس وقت چار ممبران تھے، ایک
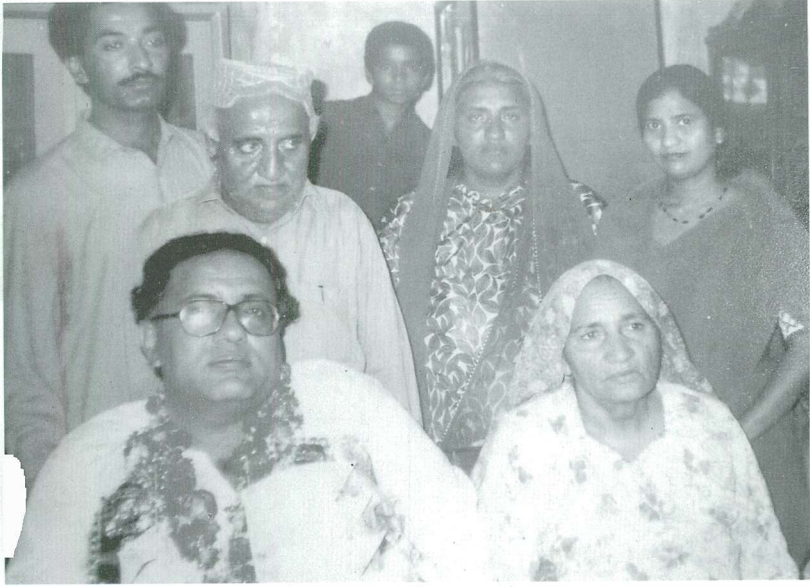
والد مہمند سچل، والدہ میھی بائی، بہن ماروی اور بھائی سلطان کے ہمراہ
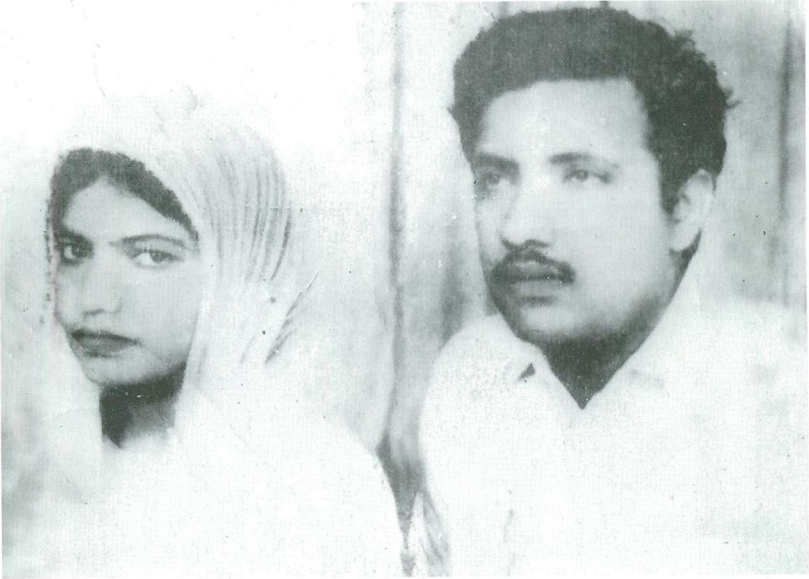
پہلی بیوی سکھاں کے ہمراہ

جام ساقی، دوسری بیگم اختر سلطانہ کے ہمراہ

احمد فراز اور دیگر کے ساتھ
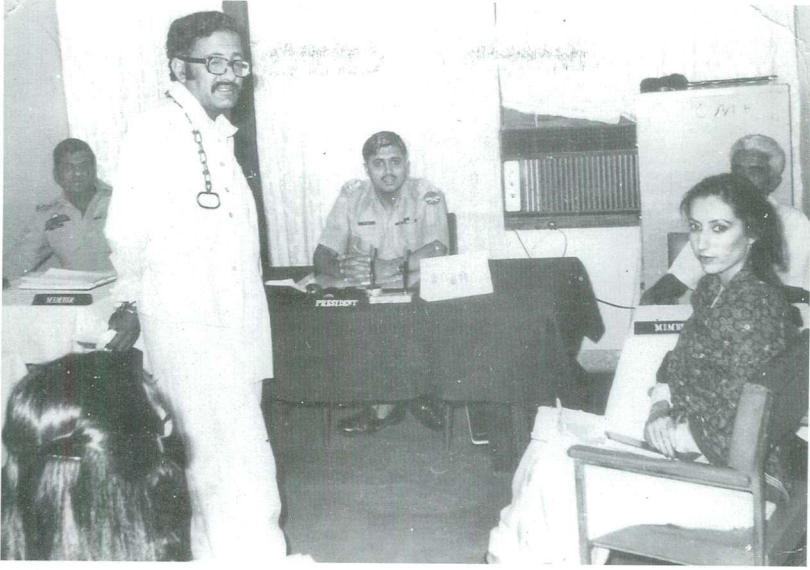
جنرل ضیا کی آمریت میں محترمہ بے نظیر بھٹو فوجی عدالت میں جام ساقی کے حق میں پیش۔

جام ساقی لاہور کی ایک تقریب میں، فرخ سہیل گوئندی خطاب فرماتے ہوئے

ولی خان، بدر ابڑو اور دیگر کے ساتھ

محترمہ نصرت بھٹو کے ہمراہ
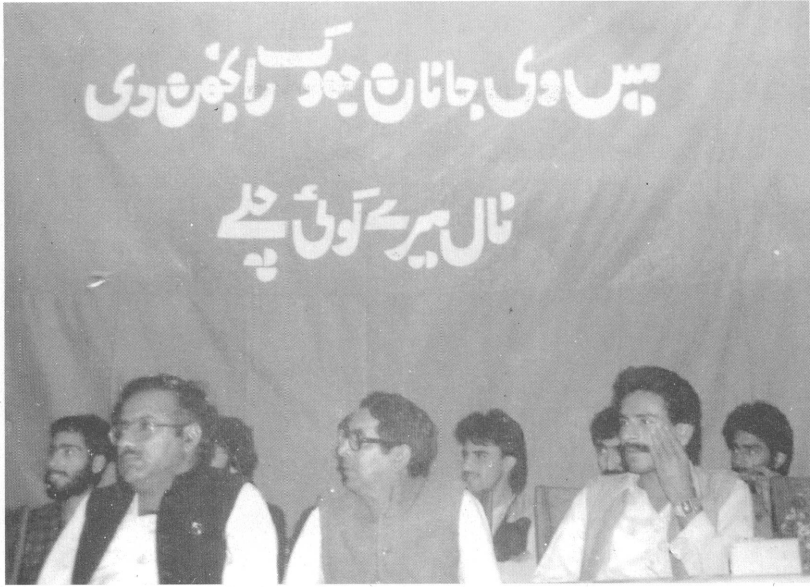
(دائیں سے) امداد چانڈیو، جمال نقوی، جام ساقی

دورۂ پنجاب، انقلابی شاعر حبیب جالب کے ہمراہ

امن مارچ 92-1991ء

بزرگ سیاست دان جی ایم سید کے ساتھ

جیل سے رہائی کے بعد پنجاب کا دورہ

کامریڈ حیدر بخش جتوئی کے ہمراہ

جام ساقی 1986ء جیل میں۔ دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے

جام ساقی، لندن میں کارل مارکس کی قبر پر

جاوید شکور، دوسرے چاچا مولا بخش، تیسرے رمضان میمن اور چوتھا میں ۔ نذیر اس کمیٹی کا سیکریٹری تھا۔ پورے سندھ کی پارٹی کے کل ممبر ۵۰ تھے۔ ویسے بھی پارٹی کا سارا کام نذیر کیا کرتا تھا۔ نذیر عام زندگی میں جتنا نرم دل تھا اتنا ہی پارٹی معاملات میں سخت ہوا کرتا تھا کہ پارٹی کے لحاظ سے اپنی بیوی بچوں کے ساتھ بھی رعایت نہیں کرتا تھا۔ نذیر اپنی سوچ میں کبھی بھی الجھا ہوا نہیں تھا، وہ نیشنل ازم کا سخت مخالف تھا۔ کہتا تھا کہ میں قوم پرستی کی وجہ سے پارٹی میں شامل نہیں ہوا بلکہ طبقاتی فکر کی وجہ سے پارٹی میں آیا ہوں۔ پنجاب میں نذیر کی پروگریسو جیسے سندھ سے قومی مسئلے پر بحث ہوئی۔ پروگریسو کے نمائندگان نے سندھ میں آ کر کہا کہ نذیر عباسی تو قوموں کو مانتا ہی نہیں۔ نذیر نے کہا کہ میں تو بابائے پاکستان کے بعد پیدا ہوا ہوں، اس لیے میں پاکستانی ہوں۔ نذیر اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ہر مسئلے کو مزدور طبقے کے نقطہء نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ بالا دست قوم کا پرولتاری کبھی مظلوم قوم کے پرولتاری کا استحصال نہیں کرتا۔ یہ پرولتاریہ کی پارٹی ہے، مزدوروں کو قوموں میں تقسیم نہیں کرنا چاہیے۔ ایک موقعے پر ایس این ایس ایف کے طلباء نے فیصلہ کیا کہ جیئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن کی مخالفت کے باوجود سندھ یونیورسٹی آڈیٹوریم میں کامریڈ حیدر بخش جتوئی ڈے کا انعقاد کیا جائے۔ اس موقعے پر کراچی سے جاوید شکور بھی پروگرام میں شرکت کی غرض سے وہاں پر آئے اور آ کر بتایا کہ پارٹی کا یہ فیصلہ ہے کہ میں یہاں پر تقریر کروں جس پر نرنجن کمار اور امداد چانڈیو نے مخالفت کی کہ یہاں کا ماحول قوم پرستی کا ہے۔ ہم کسی مہاجر کو تقریر کرنے نہیں دیں گے۔ جیئے سندھ والے ہنگامہ کر دیں گے۔ کچھ دن بعد نذیر اوپر سے کمیٹی کا فیصلہ لے کر آیا کہ پارٹی آپ سے جواب طلب کرتی ہے اور سخت تنقید کرتی ہے کہ قوم پرستی کے سیلابی بہاؤ میں بہہ گئے ہو۔ امداد خاموش ہو گیا اور الٹا اس بات پر ڈٹ گیا کہ ہم نے کون سا غلط کام کیا ہے۔ ہم درست ہیں۔

کامریڈ نذیر کا خیال تھا کہ کمیونسٹ اور قوم پرست ایک ہی ہیں۔ ان میں کون سا فرق ہے، اس دور میں پارٹی میں قوم پرستوں پر سخت تنقید ہوتی تھی، اس لیے پارٹی میں قوم پرستی کے معمولی رجحان کو بھی برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم پہلے کمیونسٹ تھے پھر سندھی۔ نذیر ماسکو لائن کا حامی تھا مگر کہتا تھا کہ اپنے ملک میں کام بڑھاؤ تو ماسکو بھی آپ کو تسلیم کرے گا اور دنیا بھی۔ نذیر ماسکو ریڈیو پر غیر معیاری پراپیگنڈا پر بھی تنقید کرتا تھا اور کبھی کبھی ماسکو والوں پر بھی تنقید کرتا تھا۔ وہ

سوویت یونین کبھی نہیں گیا اگر جاتا تو ان کے دیمک زدہ اندرونی معاملات پر اچھی خاصی تنقید بھی کرتا۔ اپنی پارٹی کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ اس نے انقلاب آنے کی تاریخ کبھی نہیں دی۔ پارٹی کی اندرونی خامیوں سے اچھی طرح واقف تھا لوگوں کو پارٹی میں لانے کے لیے کبھی کسی کو خوش فہمی میں مبتلا نہیں کرتا تھا۔ پارٹی کے مخالفین کا دشمن ہوتا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کی زندگی میں ہی دوسری پارٹیوں کے لوگ اس کے جذبے، کام خلوص اور سنجیدگی سے متاثر تھے۔ پارٹی سے بہت پیار کرتا تھا۔ نذیر کی اس وقت جو بھی سوچ تھی اس کے ساتھ سچائی سے پرخلوص تھا۔ آج بھی نذیر کی شخصیت ہم سب سے اوپر اعلیٰ مقام پر کھڑی ہے۔ ہم اس کے سامنے چھوٹے ہیں۔ شہید کو کسی گروہ بندی میں نہیں بانٹا جاتا۔ نذیر ظلم کے خلاف لڑنے والے سب مظلوموں کا شہید اور ہیرو تھا۔

نذیر عباسی پر جام ساقی مقدمہ نہیں چلا اور وہ اس سے پہلے ہی شہید کر دیے گئے لیکن ان کی شہادت نہ صرف اس مقدمے کا عنوان بن گئی بلکہ اس کا سایہ پورے مقدمے پر مسلسل منڈلاتا رہا۔

باب 5

جام ساقی مقدمہ

۲۱ اگست ۱۹۸۰ء تک گرفتاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ لیکن ایک سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد مقدمہ کی کارروائی ۳۱ دسمبر ۱۹۸۱ء کو شروع ہوئی۔ ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو پروفیسر جمال نقوی کا نام ملزموں کی فہرست سے نکال دیا گیا۔ یہ مقدمہ سپیشل ملٹری کورٹ نمبر ۵ کراچی میں چلا۔ عدالت کے صدر کرنل عتیق تھے جبکہ افتخار جلیس اور سی ایم حبیب اللہ بھٹو ممبران تھے۔۔ انور شیر اور امداد علی قاضی سرکاری وکلاء تھے جبکہ دفاع کے وکلاء میں بیرسٹر ایس اے ودود، علی محمد ایڈووکیٹ، اختر علی اور شفیع محمدی جیسے ممتاز نام تھے۔

مقدمے کا آغاز کرتے ہوئے سرکاری وکیل نے اپنے بیان میں کہا کہ ''یہ لوگ، افغان، سوویت نقطہء نظر کی تبلیغ کرتے ہیں اور کم تنخواہ والے ملازمین کو بھڑکاتے ہیں۔'' کمیونسٹ پارٹی نے اس مقدمے سے بھرپور سیاسی فائدہ اٹھایا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ حکومت نے اس مقدمے کو چلا کر دراصل گھاٹے کا سودا کیا ہے۔ ملزمان کی فہرست میں اگرچہ مرکزی حیثیت جام ساقی کو حاصل تھی لیکن دوسرے ملزمان بھی کم حیثیت کے نہ تھے اور ان میں سے ہر ایک نے میڈیا اور عوام کی توجہ حاصل کی۔ مقدمے کی سماعت کے مطبوعہ تراشوں پر ایک نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں سیاسی اعتبار سے یہ مقدمہ کتنا اہم تھا، خصوصاً تین سو سے زائد مطبوعہ بیانات کمیونسٹ پارٹی کے کام اور نام کو آگے بڑھا رہے تھے۔

جام ساقی نے ۱۰ اور ۱۱ جنوری ۱۹۸۳ء کو عدالت میں اپنا بیان دیا اور اپنے خلاف چلائے

جانے والے مقدمے کو ایک سیاسی مقدمہ قرار دیا اور کہا کہ فوجی عدالتیں اپنے اعلیٰ حکام کے احکامات کو مانتے ہوئے سزائیں ہی دیتی ہیں۔ اس لیے ان کو کسی بھی طور پر عدلیہ سے کوئی مشابہت اور ہم آہنگی قرار نہیں دی جاسکتی۔ اس سے قبل امر لال نے ۸ جنوری اور سہیل سانگی نے ۹ جنوری کو اپنا بیان دیا۔ اس سے بھی قبل یکم جنوری کو کمال وارثی اپنا بیان دے چکے تھے۔

بدر ابڑو نے اپنا بیان ان لفظوں سے شروع کیا: ''انصاف عبادت کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ کسی نتھو اور خیرو کو عدالت کی کرسی پر بٹھا دیجئے، میں اس کا احترام کروں گا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ اس عدالت کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ نتھو اور خیرو ہیں۔''

سہیل سانگی نے کہا، ''یہ محض اتفاق تھا کہ میں روزگار کی تلاش میں کراچی آیا اور گرفتار ہو گیا۔''

احمد کمال وارثی بولے: ''میری گرفتاری کے سولہ ماہ بعد آپ کی حکومت اس پوزیشن میں آسکی ہے کہ وہ میرے اور میرے ساتھیوں کے خلاف یہ مقدمہ صرف اور صرف ملٹری کورٹ میں پیش کر سکے۔ اس موقع پر ملک کے ایک قانون دان جسٹس کیانی کا ایک قول یاد آرہا ہے، ''اگر کسی کے خلاف کوئی الزام نہ ہو تو اس کا فوجی عدالت میں چالان کر دو۔''

شبیر شر نے کہا: ''یہ ۲۹ جولائی ۱۹۸۰ء کا دن تھا جب میں نے اپنے آپ کو پہلی بار اتنا اہم سمجھا، اتنا اہم کہ میں خود حیران رہ گیا تھا۔ اس قدر شاندار استقبال کسی عام آدمی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ کامریڈ جام ساقی سچ کہتا ہے کہ ہم اتنے ہی اہم ہیں جتنا حکومت ہمیں سمجھتی ہے۔''

امر لال بولے: ''آج ۸ جنوری ہے۔ ۸ جنوری جو پاکستان کی طلباء تحریک کا تاریخی اور یادگار دن ہے۔ ۸ جنوری نہ صرف جنوری ۱۹۵۳ء کی طلباء تحریک کے شہیدوں کا دن ہے بلکہ ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن (DSF) کا جنم دن بھی ہے۔''

لیکن جام ساقی مقدمے کے جوابداروں کے بیانات سے پہلے اس پیش منظر کو واضح کرنا ضروری ہے جس کی بنیاد پر یہ مقدمہ برسوں تک چلایا گیا۔

۳۰ جولائی ۱۹۸۰ء کی گرفتاریوں کے ٹھیک ایک ماہ بعد پاکستان کے اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ یہ خبریں شائع ہوئیں کہ پاکستان دشمن تخریب کاروں کا خفیہ سیل پکڑا گیا ہے۔ ان

خبروں کے مطابق خفیہ سیل ملک کی نظریاتی بنیادوں اور سلامتی کو نقصان پہنچانے کے لیے کئی برسوں سے زیرِ زمین تخریبی مواد تیار اور تقسیم کر رہا تھا۔ بتایا گیا کہ سیل کے سرکردہ افراد غلام شبیر شر، احمد کمال وارثی، نذیر عباسی (انہیں شہید ہوئے اکیس روز گزر چکے تھے) پروفیسر جمال نقوی اور سہیل سانگی شامل تھے۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ دو سال سے گرفتار جام ساقی کو اس مقدمہ کا کرتا دھرتا بنایا جا رہا تھا۔ یہ بھی انکشاف کیا گیا کہ بیرونی ایجنسیاں تخریب کے لیے سرمایہ فراہم کر رہی تھیں۔ یہ اطلاع بھی ملی کہ نازش امروہوی رابطہ کا کام انجام دے رہا تھا۔ خبر کی عزت رکھنے کے لیے یہ بھی انکشاف ہوا کہ چھاپے کے نتیجے میں سائیکلو سٹائل مشین، ٹائپ رائٹر، خفیہ جریدے ''سرخ پرچم'' اور ''ہلچل'' کے مسودے، کاپیاں، پمفلٹ، ہینڈ بل اور پوسٹر برآمد کر لیے گئے۔ حالاں کہ پانچوں گرفتاریاں ایک ماہ قبل ہو چکی تھیں۔ لیکن اخبارات نے اس طرح خبریں دیں جیسے ابھی ابھی کوئی بہت بڑی بغاوت اور سازش پکڑی گئی اور ان سرگرمیوں پر قابو پا لیا گیا ہو، جو پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک سال تک انہیں عدالت میں نہ پیش کیا گیا۔ ۱۴ نومبر ۱۹۸۱ء کو اخبارات نے اطلاع دی کہ ۲۱ نومبر کو جام ساقی، پروفیسر جمال نقوی، امر لال، سہیل سانگی، احمد کمال وارثی، غلام شبیر شر اور بدر ابڑو کو خصوصی فوجی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ ۲۱ نومبر کو انہیں خصوصی فوجی عدالت میں پیش کیا گیا۔ پروفیسر جمال نقوی کو طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے عدالت میں پیش نہ کیا گیا۔ انہیں ۲۴ اور ۲۵ نومبر کو بھی عدالت لایا گیا۔ عدالت نے سماعت کے لیے ۱۲ دسمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ملزمان نے بتایا کہ ان کے خلاف کوئی چارج شیٹ پیش نہیں کی گئی۔ آخرکار ۲۹ دسمبر کو ان کے خلاف فردِ جرم عائد کر دی گئی جس کی صحت سے سب نے انکار کیا۔ استغاثہ کی پیروی سید انور شیر نے کی جبکہ ملزموں کی طرف سے ایس اے وردو ایڈووکیٹ، علی امجد اور رشید رضوی پیش ہوئے۔ ملزموں میں امام علی، جبار خٹک اور نرنجن کمار کے ناموں کا اضافہ کیا گیا۔

ابتدا ہی سے ایسا لگنے لگا کہ کمیونسٹ پارٹی نے اپنے خلاف اس مقدمے کو بھرپور انداز میں عوامی رابطہ مہم کا حصہ بنا لیا تھا۔ ۱۹۵۱ء کے سازش مقدمہ کے برعکس جو ایک خفیہ ٹریبونل میں چلایا جا رہا تھا اور جس کے دفاع کی تفصیلات آج تک سامنے نہیں آ سکیں۔ جام ساقی مقدمہ اگرچہ ایک خصوصی فوجی عدالت میں چلایا جا رہا تھا۔ اس کی خامیاں اور نقائص جلد ہی ابھر کر سامنے آنے لگے۔

دفاعی وکلا کی ایک مضبوط ٹیم کے ساتھ ساتھ خود ملزمان نے اسے اپنے حق میں ایک پروپیگنڈا مہم کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔

۲ جنوری ۱۹۸۲ء کو کرنل عتیق احمد، میجر افتخار جلیس اور ایڈیشنل مجسٹریٹ مجیب اللہ بھٹو پر مشتمل خصوصی فوجی عدالت پر مشتمل ''وفاق پاکستان کے خلاف منافرت پھیلانے اور ''مسلح افواج'' کے خلاف شرانگیز مواد شائع کر کے انہیں اپنے قبضے میں رکھنے اور تقسیم کرنے کے الزام میں گرفتار سات افراد کے خلاف مقدمے کی سماعت ہوئی۔ عدالت میں استغاثہ کے ایک گواہ سب انسپکٹر اسلم نور خان کا بیان جاری تھا کہ وقت ختم ہو جانے کے بعد سماعت ۵ جنوری تک ملتوی کر دی گئی۔ ملزموں کے وکلاء نے ایک مشترکہ درخواست عدالت کو پیش کی جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا تھا کہ مارشل لا آرمی ایکٹ ۲۲ کے تحت خصوصی فوجی عدالت کو کھلی عدالت قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا عدالت میں ملزموں کے رشتہ داروں، وکیلوں اور اخباری نمائندوں کو آنے کی اجازت دی جائے۔ یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔ البتہ عدالت نے صوبائی حکومت کی طرف سے یقین دہانی کرائی کہ ملزموں کو طبی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ اس کے علاوہ ایک ملزم شبیر شر نے سرکاری خرچ پر پیروی کے لیے ایڈووکیٹ نذر الاسلام قرنی کو اپنا وکیل تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ بقول ان کے، وکیل موصوف کا تعلق ایک مخصوص سیاسی جماعت سے تھا۔ شبیر شر نے عدالت سے درخواست کی تھی کہ وہ چوں کہ اپنی پیروی کے لیے وکیل نہیں کر سکتے۔ اس لیے انہیں سرکاری خرچ پر وکیل فراہم کیا جائے۔ قبل ازیں جام ساقی کی طرف سے صفائی میں ایک درخواست عدالت کو پیش کی گئی جس میں بتایا گیا تھا کہ وہ ۱۹۷۸ء سے گرفتار ہیں اور حیدرآباد کی خصوصی فوجی عدالت کی طرف سے ۱۰ سال قیدِ بامشقت کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ ان کے خلاف فردِ جرم میں جن الزامات کا ذکر کیا گیا، وہ اس وقت وقوع پذیر ہوئے، جب وہ حراست میں تھے۔ اگلی پیشی پر سماعت ۷ جنوری تک ملتوی کر دی گئی۔

نئی تاریخ پر استغاثہ کے گواہ سب انسپکٹر امام بخش نے اپنے بیان میں بتایا کہ وہ نارتھ ناظم آباد تھانے میں تعینات تھا۔ اس وقت ۳۰ جولائی ۱۹۸۰ء کو اس نے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے سٹاف افسر میجر طفیل کا جو اس مقدمے میں مدعی ہیں، دستخط شدہ خط موصول ہونے کے بعد ایف آئی

آراور مارشل ریگولیشن کے سیکشن ۱۵اور ۱۸ کے تحت، عدالت میں موجود ملزموں کے خلاف مقدمات درج کیے۔

وکلائے صفائی کی جرح کے دوران سب انسپکٹر امام بخش نے بتایا کہ مدعی میجر طفیل کبھی اس کے سامنے پیش نہیں ہوئے۔ اس نے صرف وہ اندراجات، جو خط میں تحریر تھے، ایف آئی آر میں درج کیے۔ اس نے یہ بات بھی تسلیم کی کہ ایف آئی آر میں مبینہ جرم کا نہ تو وقت لکھا ہے اور نہ ہی تاریخ لکھی گئی تھی جس سے ظاہر ہو کہ ملزموں نے کب جرم کیا تھا۔ اس نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ اس نے ایف آئی آر درج کرنے کے علاوہ کوئی تفتیشی کام نہیں کیا۔ اس نے بتایا، یہ درست ہے کہ ایف آئی آر کے کالم نمبر ۵ میں ایف آئی آر تاخیر سے درج کرنے کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی۔ سب انسپکٹر امام بخش نے اس بات کو بھی درست تسلیم کیا کہ ایف آئی آر پر مدعی کے دستخط نہیں تھے۔ استغاثہ کے گواہ نے یہ بات بھی تسلیم کی کہ اس معاملے کے بعد اسے دیگر پولیس افسران کے ساتھ ترقی دے دی گئی۔

۱۳ جنوری کو استغاثہ کے گواہ سب انسپکٹر اسلم نور خان نے ملزموں کے قبضے سے برآمد ہونے والا ''تخریبی مواد'' عدالت میں پیش کیا جس میں سندھی خبر نامہ ''ہلچل'' اور اردو اخبار ''سرخ پرچم'' شامل تھے۔ اس نے اپنے بیان میں بتایا کہ وہ آرٹلری میدان میں تعینات تھا کہ ۳۰ جولائی ۱۹۸۰ء کو اسے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ہیڈ کوارٹر سے ہدایت ملی کہ ایک گروہ حکومت کے خلاف قابل اعتراض سرگرمیوں میں مصروف اور قابلِ اعتراض مواد شائع کر رہا ہے۔ ہدایت میں ملزموں کو گرفتار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ گواہ نے بتایا کہ وہ ایس ایچ او فضل الرحمان کے احکام پر دو ماتحتوں کے ہمراہ ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرز گیا۔ جہاں میجر طفیل کے، جو مقدمہ کے مدعی ہیں، کے احکام پر انسپکٹر دولت خان، ہیڈ کانسٹیبل محمد فیض اور ایک مخبر کے ہمراہ مجسٹریٹ محمد رمضان لغاری کی نگرانی میں پیپلز کالونی، نارتھ ناظم آباد کے ایک گھر پر چھاپہ مار کر ملزموں احمد کمال وارثی اور شبیر شر کو گرفتار کر لیا اور وہاں سے کافی تعداد میں چھپا ہوا قابل اعتراض مواد پمفلٹ ''ہلچل'' سندھی میں اور ''سرخ پرچم'' اردو زبان میں برآمد کیا۔ گرفتار شبیر شر کی نشاندہی پر انہوں نے پاکستان کوارٹرز میں واقع ایک اور گھر پر چھاپہ مارا جہاں اس قسم کا مزید قابلِ اعتراض مواد برآمد ہوا۔

۱۷ جنوری کو وکیل صفائی یوسف لغاری نے سب انسپکٹر اسلم نور کے بیان پر جرح کی۔ گواہ نے بتایا کہ اس نے شبیر شر اور احمد کمال وارثی کی گرفتاری کا مشیر نامہ تیار نہیں کیا۔ وہ نہیں بتا سکتا کہ برآمد شدہ مواد ان ملزموں کی ذاتی ملکیت ہے یا نہیں۔ وکیل صفائی کے ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا، وہ یہ بھی بیان نہیں کر سکتا کہ کون سا قابل اعتراض مواد شبیر شر کا ہے اور کون سا کمال وارثی کا۔ گواہ نے کہا کہ اس مقدمے کی کوئی ڈائری نہیں لکھی گئی۔ نہ ہی ملزموں کو کسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر کے ریمانڈ حاصل کیا گیا۔ دونوں ملزموں سے پاکستان کوارٹرز، پیپلز کالونی میں کوئی پوچھ گچھ نہیں کی گئی۔ گواہ نے کہا کہ اس نے چوں کہ پورا مواد نہیں پڑھا، اس لیے وہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ تمام مواد غیر قانونی ہے یا نہیں۔ گواہ نے ایک اور سوال کے جواب میں بتایا کہ وہ نویں جماعت تک تعلیم یافتہ ہے اور اردو ادب میں اس نے صرف ابن صفی کے جاسوسی ناول پڑھے ہیں۔ گواہ نے جرح کے جواب میں مزید کہا کہ میں کمیونسٹوں سے سخت نفرت کرتا ہوں۔ اس لیے میں نے کمیونسٹ لٹریچر پڑھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی میں ان کی اصطلاحات سے واقف ہوں۔ گواہ نے مزید بتایا کہ وہ حکومت پر جائز نکتہ چینی کو جرم نہیں سمجھتا۔ اس کو علم نہیں کہ برآمد کیے گئے مواد پر پابندی عائد ہے یا نہیں۔

استغاثہ کے گواہ سب انسپکٹر پولیس اسلم نور خان پر وکیل صفائی یوسف لغاری ایڈووکیٹ نے جرح جاری رکھتے ہوئے پوچھا کہ کیا اس نے ملزمان کو محض اس لیے گرفتار کیا ہے کیوں کہ وہ سیاسی کارکن ہیں اور پاکستان کے محنت کش اور غریب عوام کی بات کرتے ہیں تو اس کا جواب گواہ نے نفی میں دیا۔ اس کے بعد بدر جمال ابڑو کے وکیل شفیع محمدی ایڈووکیٹ نے گواہ پر جرح شروع کی وکیل صفائی کے سوال کے جواب میں گواہ نے بتایا کہ جس جگہ سے احمد کمال وارثی اور شبیر شر کو گرفتار کیا گیا، وہاں سے ایسا کوئی سٹینسل برآمد نہیں ہوا جس پر لفظ ''سرخ پرچم'' لکھا ہوا ہو۔ گواہ نے مزید بتایا کہ اس نے کسی بھی برآمد شدہ کاغذ یا سامان پر کسی مجسٹریٹ یا کسی اور گواہ کے دستخط نہیں لیے تھے۔ گواہ اسلم نور خان سب انسپکٹر پولیس نے وکیل صفائی کے ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ اگر اس کا کوئی افسر اسے ایسا کوئی کام کرنے کے لیے کہے جو اسلام کے خلاف ہو تو بھی وہ اس پر عمل کرے گا۔

استغاثہ کے گواہ سب انسپکٹر نور نے بتایا کہ وہ نظریہ پاکستان کی اصطلاح سے پوری طرح واقف ہے اور اس کے نزدیک نظریہ پاکستان یہ ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے اور اسلام ہی کے نام پر باقی رہے گا۔ اس نے بتایا کہ میرے نزدیک اسلام سے مراد یہ ہے کہ اللہ کا حکم مانو اور اس کے رسول کا حکم مانو اس نے یہ تسلیم کیا کہ جو لٹریچر عدالت کے ریکارڈ پر لایا گیا ہے، اس میں کہیں بھی یہ الفاظ نہیں لکھے کہ اللہ کا حکم نہ مانو یا رسول کا حکم نہ مانو۔ تو گواہ نے کہا کہ وہ کمیونزم سے سخت نفرت کرتا ہے کیوں کہ کمیونسٹ خدا کی ذات پر یقین نہیں رکھتے۔ گواہ نے بتایا کہ دنیا کے تمام نظاموں میں یہ چیز مشترک ہے کہ عدلیہ کا مقام حاکم سے بلند ہوتا ہے اور حاکم عدلیہ کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے اور کسی حاکم کو یہ اختیار نہیں کہ وہ عدلیہ پر کسی قسم کی بندش عائد کرے۔ کیوں کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ گواہ اسلم نور نے بتایا کہ تخریبی مواد کے بارے میں میجر طفیل نے مجسٹریٹ کے سامنے بتایا تھا۔ اس نے کہا کہ ایف آئی آر کٹوانے کا فرض مجسٹریٹ کا تھا۔ مجسٹریٹ کی موجودگی میں یہ فرض مجھ پر عائد نہیں ہوتا۔ گواہ نے بتایا کہ اس مقدمے کے چار عینی گواہ ہیں جن میں مجسٹریٹ، ہیڈ کانسٹیبل فیاض اور کانسٹیبل دولت خان اور وہ خود شامل ہے لیکن کسی بھی چشم دید گواہ نے کسی جگہ کوئی آیف آئی آر نہیں کٹوائی۔ اس نے بتایا کہ چھاپے کے وقت تمام چیزوں کو قبضے میں نہیں لیا گیا کیوں کہ جو مجسٹریٹ نے کہا میں نے وہی قبضے میں لے لیا اور جس کو انہوں نے نہیں کہا میں نے نہیں لیا۔ گواہ سے پوچھا گیا کہ مذکورہ مضمون میں یہ کہیں لکھا ہے کہ خدا اور رسول ﷺ کے حکم کے مطابق زکواۃ نہ دو۔ تو اس نے کہا کہ ایسا نہیں لکھا۔ گواہ نے کہا کہ اس مضمون کے علاوہ مجھے اور کوئی مضمون اس لٹریچر میں سے نہیں ملا جسے میں غیر اسلامی کہہ سکوں۔

گواہ پر جرح سے پہلے شفیع محمد ایڈووکیٹ نے کہا کہ گواہ کے ہاتھ میں قرآن مجید دے کر اس سے حلف لیا جائے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے سچ ہے۔ اور اگر اس میں کچھ جھوٹ ہے تو خدا اس پر اپنا عذاب نازل فرمائے۔ مگر ملٹری کورٹ نے اس کی اجازت نہیں دی اور کہا کہ حلف ملٹری کورٹ کے مطابق ہوگا۔ گواہ سے پوچھا گیا کہ اگر آپ کو عدالت ایک حکم دے اور آپ کا افسر اس کے برعکس حکم دے تو آپ کس حکم کی تعمیل کریں گے تو اس موقع پر سرکاری وکیل سید انور شیر نے اعتراض کیا کہ اگر گواہ یہ کہے کہ افسر کا حکم مانوں گا تو یہ عدالت کی توہین ہوگی اور اگر عدالت کا حکم مانے گا تو افسر

ناراض ہوگا اس لیے سوال کی اجازت نہ دی جائے۔ عدالت نے اس سوال کی اجازت نہ دی۔

سرکاری گواہ اسلم نور خان پر وکیل صفائی علی امجد ایڈووکیٹ نے بھی جرح کی۔ گواہ اسلم نور خان نے جرح کے دوران بتایا کہ برآمد شدہ مواد میں ایسا کوئی مواد نہیں جس سے مختلف طبقوں میں منافرت یا دشمنی پھیلانے کی کوشش نظر آتی ہو۔ گواہ نے مزید کہا کہ اس مواد میں مختلف صوبوں کے درمیان نفرت پھیلانے کی کوئی تحریر نہیں ہے۔ گواہ اسلم نور خان نے کہا کہ اس کو علم ہے کہ موجودہ مارشل لاء ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو نافذ کیا گیا تھا تاہم اس کو مارشل لاء کے نفاذ کے مقاصد کا علم نہیں۔ گواہ نے ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ تخریبی مواد صرف وہ ہوتا ہے جس میں قانونی حکومت کو تشدد کے ذریعے ہٹانے کی کوشش کی جائے۔ گواہ نے سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ پیپلز کالونی والے مکان کے راستے کی نشاندہی نہیں کرسکتا۔ اس نے بتایا کہ مجسٹریٹ نے مکان پر چھاپہ کے دوران دونوں ملزموں کو اس وقت تک گرفتار کرنے کا حکم نہیں دیا، جب تک ضبط شدہ مواد پڑھ نہیں لیا۔ گواہ نے کہا کہ اس نے ہیڈ کانسٹیبل کو موقع کے گواہ ڈھونڈنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس نے بتایا کہ دونوں مکانات کے چاروں طرف مکانات ہیں اور پاکستان کوارٹرز کے سامنے مکانات کی پوری قطار ہے۔ تاہم ان دونوں مقامات سے کوئی بھی شخص گواہی کے لیے دستیاب نہیں ہوسکا تھا۔

سرکاری گواہوں پر جرح سے یہ واضح ہونے لگا کہ مارشل لاء حکومت کی اس کارروائی میں کتنے تضادات تھے۔ ۲۸ اپریل کو عدالت نے تخریبی مواد میں دو کتابیں ''سوویت یونین میں مسلمان'' اور ''ماسکو اولمپکس'' کو مقدمے سے خارج کردیا کیوں کہ ان میں کسی قسم کا تخریبی مواد نہیں پایا گیا۔ ۱۹ اپریل کو ملزمان کی طرف سے عدالت کو بتایا گیا کہ شہید نذیر عباسی سے متعلق ایف آئی آر پر عمل درآمد کرنے، فوجی عدالت کو کھلی عدالت میں بدلنے اور دیگر سہولیات کے سلسلے میں خصوصی فوجی عدالت کا فیصلہ قبول نہیں کیوں کہ عدالت نے ملزموں کی طرف سے پیش کردہ نکات میں سے کسی ایک کا جواب نہیں دیا۔ ملزمان نے شہید نذیر عباسی کی موت کی تحقیقات کرانے کا بھی مطالبہ کیا۔ انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ شہید کی بیوی کی درخواست پر کارروائی کی جائے۔

اب عدالت کے باہر ان مطالبات کے حق میں سرگرمیاں تیز ہونے لگیں۔ مطالبات کے حق میں ایک دستخطی مہم کا آغاز کیا گیا جس پر مشہور ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں، احمد فراز، شوکت

صدیقی، ہاجرہ مسرور، کمانڈر انور، سعیدہ گزدر، غازی صلاح الدین، بیگم ممتاز نورانی اور نفیس صدیقی وغیرہ نے دستخط کیے۔

پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن سندھ کے جنرل سیکریٹری حسن عسکری نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ ملک کے معروف دانشور پروفیسر جمال نقوی، ہاری رہنما جام ساقی اور ان کے ساتھی سہیل سانگی، شبیر شر، امر لال، بدر ابڑو اور طالب علم رہنما نذیر عباسی کو دو سال پہلے گرفتار کیا گیا تھا۔ پھر طالب علم رہنما نذیر عباسی اچانک انتقال کر گئے۔ تحقیقات تک گوارا نہیں کی گئی جب کہ بقیہ لوگوں پر ایک فوجی عدالت کے بند کمرے میں مقدمہ چلایا جا رہا ہے اور حد تو یہ ہے کہ رہنماؤں کو ان کے رشتہ داروں سے ملنے تک نہیں دیا جا رہا اور جیل کے اندر عام قیدیوں سے بھی بدتر سلوک کیا جا رہا ہے جو سراسر ظلم اور زیادتی کے مترادف ہے۔ اسی طرح پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے آرگنائزنگ سیکریٹری شوکت حیات کو بھی گزشتہ ایک سال سے مارشل لاء کے مختلف ضابطوں کے تحت سیالکوٹ جیل میں نظر بند کیا ہوا ہے نہ تو ان پر مقدمہ چلایا جاتا ہے اور نہ ہی اس طویل نظر بندی کی کوئی معقول وجہ بتائی جاتی ہے۔ آج پاکستان کی مختلف جیلوں میں بہت سے مزدور ہاری، اساتذہ، طالب علم اور سیاسی رہنما سال ہا سال سے بغیر کسی وجہ کے سڑ رہے ہیں اور ان رہنماؤں کو حکام جیلوں میں ڈال کر بھول گئے ہیں جیسے یہ لوگ اس ملک کے باشندے ہی نہیں تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم حکام سے مطالبہ کرتے ہیں کہ نذیر عباسی کی موت کی تحقیقات کرائی جائے پروفیسر جمال نقوی، جام ساقی اور ان کے ساتھیوں کو رہا کیا جائے اور اگر یہ لوگ واقعی کسی بڑے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں تو ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے اور جیل میں ان تمام رہنماؤں کو بہتر سہولتیں فراہم کی جائیں۔ ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو ان سے ملنے دیا جائے۔ آخر میں انہوں نے فیڈریشن کے رہنما شوکت حیات، شمیم واسطی، طالب علم رہنما امداد چانڈیو، شیر محمد منگریو سمیت تمام گرفتار ہاری مزدور اور طالب علم رہنماؤں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے فیڈریشن کے مرکزی جنرل سیکریٹری بشیر احمد ایڈووکیٹ کے وارنٹ گرفتاری منسوخ کرنے کا بھی مطالبہ کیا۔

یہ جدوجہد کامیاب ہوئی۔ ۵ مئی ۱۹۸۲ء کو عدالت نے اسے کھلی عدالت تسلیم کرلیا چنانچہ جب مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی تو عدالت نے ان رہنماؤں سے ملنے کے لیے آنے والے ایک

رشتہ دار کو کمرا میں بیٹھنے کی اجازت دے دی مگر عدالت کی کارروائی کے ایم سی اسپورٹس کمپلیکس کی عمارت کے جس کمرے میں منعقد کی جاری تھی اس میں اور کسی شخص کے بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی کیوں کہ کمرا بہت ہی چھوٹا تھا۔ جام ساقی اور ان کے ساتھیوں نے آج بھی اپنے وکلاء کو پیش ہونے کی اجازت نہیں دی کیوں کہ ان کا مؤقف یہ تھا کہ جب تک ان کی درخواست میں پیش کیے گئے باقی تمام مطالبات منظور نہیں کر لیے جاتے، وہ اپنے وکلاء کو پیش ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ درخواست میں شامل مطالبات یہ تھے: عدالت میں رشتہ داروں اور صحافیوں کو بیٹھنے کی اجازت دی جائے۔ عدالت کی کارروائی کی تصدیق شدہ نقول فراہم کی جائیں۔ جیل میں عام سیاسی قیدیوں کی طرح تمام سہولتیں فراہم کی جائیں۔ نذیر عباسی شہید کی موت کے واقعہ کی تحقیقات کروائی جائے۔ نذیر عباسی کی بیوہ حمیدہ گھانگھرو کی درخواست پر کارروائی کی جائے اور عدالت کی کارروائی کی خبریں اخباروں میں چھاپنے پر پابندی ختم کی جائے۔

ملزمان کی طرف سے وکلاء کو پیش نہ کرنے اور عدالتی بائیکاٹ کا سلسلہ طول پکڑ گیا۔ یہ سلسلہ جو مارچ اپریل میں شروع ہوا، جون تک دراز ہوگیا۔ اس اثناء میں ملزموں کو عدالت میں پیش کیا جاتا رہا۔ ۱۲ مئی کی سماعت کے دوران بھی خصوصی فوجی عدالت میں جام ساقی اور دیگر افراد کے خلاف مقدمے میں پولیس سٹیشن شمالی ناظم آباد کے ایس ایچ او صفدر بھٹی مقدمے کی اصل ایف آئی آر پیش کرنے میں ناکام رہے، اس لیے کارروائی اگلے دن تک کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ واضح رہے کہ اس روز بھی عدالت میں سہیل سانگی اور بدر ابڑو کے وکلاء موجود تھے جبکہ جام ساقی، پروفیسر جمال نقوی، ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن کے وائس چیئرمین امر لال، شبیر شر اور احمد کمال وارثی نے نذیر عباسی شہید کی موت کی تحقیقات کرانے اور دوسرے مطالبات کے حق میں احتجاجی طور پر اپنے وکلاء کو ہدایت دینے سے انکار کر دیا تھا۔

۲۲ مئی، ۲۶ مئی، ۳۱ مئی، ۳ جون، ۵ جون اور ۱۰ جون کی سماعت کے دوران بھی وکلائے صفائی موجود نہیں تھے۔ ۱۴ جون کو جام ساقی اور دیگر کے خلاف مقدمے میں استغاثے کے گواہ ایس ایچ او نیو کراچی صفدر علی بھٹی نے خصوصی فوجی عدالت کے سامنے وفاقی وزارت داخلہ کا ایک خط پیش کیا جس میں صدر کی جانب سے یہ ہدایت ان تک پہنچائی گئی تھی کہ ملزموں کے خلاف تفتیش اور

مقدمہ جلد از جلد مکمل کیا جائے۔ خط کے دوسرے پیراگراف کی عبارت یہ تھی، ''صدر بہ مسرت ہدایت کرتے ہیں کہ مقدمے کی مکمل چھان بین کی جائے اور ملزموں پر جلد مقدمہ چلا کر اسے ختم کیا جائے۔'' خط کا مکمل متن عدالت کو دکھایا گیا۔ استغاثہ کے گواہ نے اس سے انکار کیا کہ اس نے مقدمے کی تفتیش یا چھان بین کی تھی مگر وہ خود کو تفتیشی افسر ظاہر کرتا رہا تھا کیوں کہ صدر پاکستان نے ملزموں کے خلاف مقدمے کے بارے میں ہدایت کی تھی۔ اس سے قبل استغاثہ کے گواہ نے بتایا کہ ملزم امر لال کو جامشورو پولیس نے اس کے حوالے کیا تھا اور ملزم امر لال ایک اور ملزم احمد کمال وارثی کے بیان کے باعث پولیس کو مطلوب تھا۔ احمد کمال وارثی نے یہ بیان لانڈھی جیل میں دیا تھا۔ اس مرحلے پر وکیل صفائی نے گواہ سے احمد کمال وارثی کے بیان کے بارے میں دریافت کیا تو گواہ نے بتایا کہ مذکورہ بیان مقدمے کی فائل میں موجود تھا مگر اب وہاں سے غائب ہے اور اسے نہیں معلوم کہ احمد کمال وارثی کا بیان کب اور کس طرح غائب ہوا ہے۔ گواہ نے مزید بتایا کہ اس نے ۱۸ ستمبر ۱۹۸۰ء سے پہلے ملزم کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے وہ مذکورہ تاریخ سے پہلے ملزم کا ریمانڈ حاصل نہ کر سکا۔ گزشتہ روز مقدمے کی سماعت سے پہلے ایک ملزم شبیر شر کو آنکھ کے آپریشن کے لیے ہسپتال لے جایا گیا، جہاں اس کا آپریشن ہوا۔ بعد میں ملزم کو عدالت میں لایا گیا اس وقت ملزم کی آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ چوں کہ ملزم عدالت میں بیٹھ نہیں سکتا تھا، اس لیے اسے برابر کے کمرے میں لیٹنے کی اجازت دے دی گئی۔ اور یوں مقدمے کی سماعت جاری رہی۔ دیگر پانچ ملزموں کے وکلائے صفائی حاضر نہیں تھے کیوں کہ ان ملزموں نے مطالبہ کر رکھا تھا کہ جیل میں ان کے ساتھی نذیر عباسی کی شہادت کی تحقیقات کرائی جائے۔

۲۱ جون کو خصوصی فوجی عدالت میں سرکاری گواہ نارتھ ناظم آباد کے ایس ایچ او صفدر بھٹی پر سہیل سانگی کے وکیل یوسف لغاری ایڈووکیٹ نے جرح کی۔ سرکاری گواہ ایس ایچ او بھٹی نے بتایا کہ وہ نظریہ پاکستان سے واقف نہیں ہے۔ گواہ نے مزید بتایا کہ اس نے ایف آئی آر کی اصلی کاپی ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہیڈ کوارٹرز کے میجر طفیل کو تفتیش کے لیے بھیجی تھی۔ اس نے تسلیم کیا کہ ایف آئی آر پر میجر طفیل کے دستخط موجود نہیں تھے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ملزم یا ان کے خلاف مواد اسے پیش نہیں کیا گیا۔ عدالت میں ایف آئی آر کی دو کاپیاں ریکارڈ میں رکھی گئی ہیں جو ایک دوسرے سے

مختلف ہیں۔ گواہ نے تسلیم کیا کہ ایف آئی آر پراوور رائٹنگ ہے۔ سرکاری گواہ نے بتایا کہ اس نے نارتھ ناظم آباد کے ایس ایچ او کی حیثیت سے امر لال کو جامشورو پولیس سے طلب نہیں کیا تھا بلکہ خود جامشورو پولیس نے انہیں ہماری تحویل میں دیا تھا۔ امر لال کی گرفتاری کی وجہ بتاتے ہوئے اس نے وزارت داخلہ کا ایک خط دکھایا جس میں صدر مملکت کی یہ ہدایت تھی کہ امر لال اور امداد چانڈیو کو گرفتار کیا جائے۔ بدر ابڑو کے وکیل شفیق محمدی ایڈووکیٹ کی جرح پر سرکاری گواہ نے بتایا کہ تفتیش تین مرحلوں میں کی گئی اور پہلے مرحلے میں ملٹری انٹیلی جینس، ڈی ایم ایل اے اور ایم ایل اے کی ٹیموں نے کی۔ دوسرے مرحلہ میں خود اس نے کی۔ تیسرے مرحلے میں ڈی ایس پی ممتاز برنی نے کی۔ سرکاری گواہ نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ اس نے ایف آئی آر تاخیر سے لکھنے کی وجہ نہیں لکھی۔ اور ایف آئی آر میں پاکستان کوارٹرز کا ذکر نہیں ہے۔ صفدر بھٹی نے بتایا کہ جس دفعہ کے تحت ایف آئی آر کاٹی گئی ہے اور مقدمہ چل رہا ہے، وہ دفعہ کس جرم کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ وہ نہیں جانتا۔ چوں کہ اسے مواد نہیں دیا گیا تھا، لہٰذا وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس مواد میں مذہبی یا طبقاتی منافرت پھیلائی گئی ہے۔ سرکاری گواہ نے بتایا کہ اس کو ایک گواہ بھی ایسا نہیں ملا جس نے دوران تفتیش ایسا مواد دیا ہو جس میں فوج کے خلاف منافرت پائی جاتی ہو۔ اس نے بتایا کہ اس نے کبھی بھی نظریہ پاکستان کے خلاف کسی کے خلاف ایف آئی آر نہیں کاٹی۔ اس نے تسلیم کیا کہ وہ نظریہ پاکستان کی تفصیل نہیں جانتا۔ نہ کسی گواہ نے ایسی کوئی شہادت دی ہے جس سے ثابت ہوتا ہو کہ کوئی ملزم نظریہ پاکستان کے خلاف ہے۔ اس نے کہا کہ اسے ایسی کوئی شہادت نہیں ملی جس کے متعلق ملزموں میں سے کسی ایک پر بغاوت کرنے یا مذہبی وطبقاتی منافرت پھیلانے یا نظریۂ پاکستان کی مخالفت کرنے کا الزام ثابت ہوتا ہو۔

اس روز خصوصی فوجی عدالت میں ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن پاکستان کے وائس چیئرمین امر لال، احمد کمال وارثی اور شبیر شر نے ایک درخواست پیش کی اور فوجی عدالت سے استدعا کی کہ یہ درخواست چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو بھیجی جائے۔ اس درخواست میں تینوں نے کہا ہے کہ انہیں لبنان بھیجا جائے تاکہ فلسطینیوں کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے لڑیں۔ وہ اسرائیل اور امریکی جارحیت کا مقابلہ کریں گے اگر زندہ بچ گئے تو وطن واپس آ کر خود کو حکومت کے حوالے کر دیں

گے اور مقدمہ لڑیں گے۔ عدالت میں جام ساقی، پروفیسر جمال نقوی، امر لال، احمد کمال وارثی اور شبیر شر کے گواہ موجود نہیں تھے۔ واضح رہے کہ انہوں نے اپنے ساتھی نذیر عباسی شہید کے قتل کی تحقیقات کرانے اور ایف آئی آر پر عمل درآمد کرانے کے حق میں احتجاجاً اپنے وکلاء کو ہدایت دینے سے انکار کر دیا تھا۔

۲۴ جون کو جام ساقی پروفیسر جمال نقوی اور ان کے ساتھیوں کو خصوصی عدالت نمبر ۵ میں پیش کیا گیا۔ جام ساقی نے عدالت میں درخواست پیش کی کہ وہ اسرائیلی جارحیت کے خلاف فلسطینی بھائیوں کے لیے یکجہتی کے طور پر اپنے خون کا عطیہ دینا چاہتے ہیں۔ عدالت نے ان کی درخواست منظور کرتے ہوئے کہا کہ اس کے لیے مناسب انتظام کرلیا جائے گا۔ عدالت میں سرکاری گواہ محمد یعقوب کا بیان ریکارڈ ہوا۔ سرکاری گواہ نے بتایا کہ پیپلز کالونی میں مکان پر چھاپے کا واقعہ چھ سات ماہ پرانا ہے جبکہ استغاثہ کے مطابق یہ واقعہ تقریباً دو سال پہلے کا ہے گواہ نے بتایا کہ میرا بیان چھاپے والے دن صفدر بھٹی نے لیا تھا۔ عدالت نے گواہ کا بیان ضابطہ فوجداری کے تحت دیکھا تو اس پر ۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء کی تاریخ تھی جبکہ استغاثہ کے مطابق چھاپہ ۲۹ جولائی ۱۹۸۰ء کا ہے۔ گواہ نے بتایا کہ اس علاقے میں مکانوں کے نمبر نہیں ہیں، اس لیے اس نے پولیس کو کسی مکان کا نمبر نہیں بتایا جبکہ عدالت میں ملاحظہ کیا تو بیان میں مکان نمبر درج تھا۔ گواہ نے شروع شروع میں بتایا کہ اس کی چائے کی دکان اسی گلی میں ہے جہاں مذکورہ مکان ہے لیکن جرح کے دوران کہا کہ اس کی دکان ایک دور کی گلی میں ہے جہاں کے مکان نمبر اسے معلوم نہیں۔ گواہ نے بتایا کہ اس کا بیان ایک ہی دفعہ لکھا گیا ہے اور اس میں دو آدمیوں ایک ڈاڑھی والے اور ایک بغیر ڈاڑھی والے کا ذکر تھا۔ اسے ڈاڑھی والا شخص نذیر عباسی معلوم ہوتا تھا لیکن اس نے عدالت میں کہا کہ ڈاڑھی والا شخص شبیر شر تھا، نذیر عباسی نہیں۔ گواہ نے کہا کہ جس تاریخ کو اس کا بیان ریکارڈ کیا گیا تھا ملزم اس سے دس یا بارہ روز پہلے آئے تھے۔ اس سے پہلے وہ اس علاقے میں کبھی نہیں آئے۔ گواہ کے مطابق لوگوں نے اسے بتایا کہ چھاپے اور گرفتاری کا واقعہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جبکہ واقعہ اس نے خود نہیں دیکھا۔ احمد کمال وارثی گردے کے درد کے باوجود عدالت میں موجود تھے۔ سینٹرل جیل کراچی کے ڈاکٹروں نے لکھا کہ احمد کمال وارثی کا علاج سول ہسپتال میں داخلے کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔

جام ساقی کیس میں کئی ماہ سے وکلاء کے بائیکاٹ کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اب مقدمہ میں لبنان کی صورتِ حال کا نیا عنصر شامل ہو گیا تھا جو ظاہر ہے فوجی عدالت کے دائرہ اختیار میں نہیں آتا تھا۔ اس لیے احمد کمال وارثی اور دیگر ساتھیوں کی لبنان جا کر لڑنے کی درخواست مسترد کر دی گئی۔ بدر ابڑو کے وکیل شفیع محمدی نے عدالت میں تحریری بیان داخل کیا کہ وہ کراچی بار کی اپیل پر عدالتی کارروائی کا بائیکاٹ کر رہے ہیں۔ جام ساقی اور ان کے ساتھیوں نے بھی مشترکہ طور پر لبنان میں اسرائیلی جارحیت اور حکومت کی طرف سے فلسطینیوں کی مدد نہ کرنے کے خلاف احتجاجاً عدالتی کارروائی کا بائیکاٹ کیا اور ملک میں ہونے والے احتجاجی مظاہروں اور ہڑتال کی حمایت کی۔ شبیر شر کو آنکھ کے آپریشن کی وجہ سے تکلیف کے باوجود طبی معائنے کے بغیر عدالت میں پیش کیا گیا، جبکہ احمد کمال وارثی کے گردے میں شدید درد کے باعث کرسی پر بٹھا کر جیل ہسپتال سے پولیس وین میں لایا گیا۔ ڈاکٹروں نے احمد کمال وارثی کا سول ہسپتال میں داخلہ تجویز کیا تھا لیکن انہیں سینٹرل جیل کے ہسپتال میں رکھا گیا۔

اس اثناء میں جام ساقی اور ساتھیوں کے مقدمے میں سرکاری گواہ پر جرح مکمل کر لی گئی۔ سرکاری گواہ محمد یعقوب نے اپنے بیان میں بتایا کہ اس کی اسی گلی میں چائے کی دکان تھی، جس گلی کے مکان پر پولیس اور آرمی نے چھاپہ مار کر شبیر شر کو گرفتار کیا تھا۔ جرح کے دوران اس نے بتایا کہ اس کی دکان گلی میں کافی فاصلے پر ہے جس کی وجہ سے اسے مکان کا نمبر معلوم نہیں۔ گواہ نے بتایا کہ اس کا بیان ایک ہی دفعہ لکھا گیا تھا۔ اور اس میں دو آدمیوں ایک ڈاڑھی والے اور ایک بغیر ڈاڑھی والے شخص کا ذکر تھا ڈاڑھی والا شخص نذیر عباسی نہیں، شبیر شر تھا جبکہ اس نے ڈاڑھی والا شخص نذیر عباسی بتایا تھا۔ گواہ نے بتایا کہ جس تاریخ کو اس کا بیان قلم بند کیا گیا، ملزم اس سے دس یا بارہ روز پہلے آیا تھا۔ جسے اس نے علاقے میں اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ گواہ نے بتایا کہ دوسرے لوگوں نے بھی گرفتاری کا واقعہ دیکھا تھا مگر اس نے خود نہیں دیکھا۔ گواہ کے مطابق ایس ایچ او صفدر علی بھٹی نے اس کا بیان ضابطہء فوجداری کے تحت قلم بند کیا تھا، اس پر ۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء کی تاریخ تھی جبکہ استغاثہ کے مطابق چھاپہ ۲۹ جولائی ۱۹۸۰ء کو مارا گیا تھا۔ گواہ نے بتایا کہ اسے علاقے کے مکانوں کے نمبر معلوم نہیں ہیں، اس لیے اس نے پولیس کو نمبر نہیں بتایا جبکہ ریکارڈ شدہ بیان میں اسے

مکان نمبر معلوم تھا۔

۲۹ جون کو جام ساقی اور ان کے ساتھی خصوصی عدالت میں پیش ہوئے جہاں سرکاری گواہ اشفاق زمان پر وکیل صفائی شفیع محمدی نے جرح کی۔ جرح کے دوران سرکاری گواہ نے بتایا کہ پروفیسر جمال نقوی ایک اچھے شہری اور معزز آدمی ہیں۔ میں نے انہیں کبھی کالج کے اندر نظریۂ پاکستان کے خلاف منافرت پھیلاتے، طبقاتی یا مذہبی منافرت پھیلاتے نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی انہوں نے فوج کے خلاف نفرت پھیلائی یا بغاوت کے مرتکب ہوئے۔ کالج کے کسی طالب علم یا پروفیسر نے کبھی پروفیسر جمال نقوی کے بارے میں شکایت نہیں کی۔ وکیل صفائی شفیع محمدی نے اس موقع پر عدالت سے استدعا کی کہ پروفیسر صاحب کا پرسنل فائل کالج سے منگوایا جائے تاکہ گواہ عدالت کو یہ بتایا جا سکے کہ پروفیسر صاحب کو جھوٹے کیس میں ملوث کیا گیا تھا۔ بعد میں انہیں باعزت طور پر بری کر دیا گیا اور انہیں دوبارہ جھوٹے کیس میں ملوث کیا گیا ہے۔ عدالت نے شفیع محمدی ایڈووکیٹ کی یہ درخواست مسترد کر دی۔ سرکاری گواہ اشفاق زمان نے جرح کے دوران فوجی عدالت کو بتایا کہ اردو سائنس کالج وفاقی حکومت کے ماتحت ہے۔ مرکزی حکومت کی طرف سے کوئی تفتیشی ٹیم نہیں آئی اور نہ ہی ایس ایچ او نارتھ ناظم آباد صفدر علی بھٹی ملیر تھانے کے ایس ایچ او کے ساتھ کالج آئے۔ اس نے مزید بتایا کہ سابق ڈی ایس پی نارتھ ناظم آباد ممتاز بربنی کالج آتے تھے۔ انہوں نے پروفیسر جمال نقوی کی پرسنل فائل سے کچھ کاغذات لیے تھے۔ سرکاری گواہ کو جو وہاں آفس سیکریٹری ہے کوئی بھی تحریری حکم نامہ انہیں نہیں دیا۔ عدالت میں جام ساقی، پروفیسر جمال نقوی، امر لال، احمد کمال وارثی، شبیر شر کے وکلاء موجود نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھی نذیر عباسی شہید کے قتل کی تحقیقات کرانے اور ایف آئی آر پر عمل درآمد کرنے کے لیے احتجاجاً اپنے وکلاء کو ہدایت دینے سے انکار کر دیا ہے۔ احمد کمال وارثی کو شدید علالت کے باوجود بھی ہسپتال نہیں بھیجا گیا۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ سرکاری گواہ اشفاق زمان جو وفاقی اردو سائنس کالج کے آفس سپرنٹنڈنٹ اور پروفیسر جمال نقوی کے کالج کے ساتھی تھے، نے پروفیسر نقوی کے حق میں بیان دیا، جس پر وکیل صفائی شفیع محمدی نے جرح کی۔ سرکاری گواہ نے بتایا تھا کہ وہ ملزموں میں صرف پروفیسر

جمال نقوی کو پہچانتا ہے۔ اس نے اور کسی ملزم کو کالج آتے یا ان سے ملتے نہیں دیکھا۔ شفیع محمدی کی جرح کے دوران گواہ نے بتایا کہ اس نے کسی اور کالج میں پروفیسر جمال نقوی کے ساتھ کام نہیں کیا اور وہ کسی حد تک پروفیسر نقوی کی صرف انگریزی ہینڈ رائٹنگ کو پہچان سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ پروفیسر جمال نقوی کالج سے باہر بھی ایک بہت ہی باعزت آدمی ہیں۔ سرکاری گواہ وفاقی اردو سائنس کالج کے آفس سپرنٹنڈنٹ اشفاق زمان پر جرح مکمل ہونے کے بعد استغاثہ کے ساتویں گواہ اسی کالج کے پروفیسر محمد اشفاق خان کو بیان کے لیے پیش کیا گیا۔ گواہ محمد اشفاق جیسے ہی عدالت میں داخل ہوئے تمام ملزم احترام میں کھڑے ہوگئے پروفیسر محمد اشفاق خان نے عدالت کو بتایا کہ پروفیسر جمال نقوی کے علاوہ وہ کسی ملزم کو نہیں جانتے اور نہ ہی کسی ملزم نے کالج میں پروفیسر صاحب سے مل کر اس کے خلاف بتائے گئے الزامات کے سلسلے میں کوئی مدد کی اور نہ ہی کوئی سازش کی۔ سرکاری گواہ نے بتایا کہ پروفیسر جمال نقوی کی کالج میں کبھی بھی کوئی ایسی سرگرمی دیکھنے میں نہیں آئی جس سے انہیں بغاوت کا مرتکب ٹھہرایا جائے۔ انہوں نے کہا کہ میں جب پرنسپل اکرام الزمان کے کمرے میں داخل ہوا تو اس وقت ڈی ایس پی ممتاز برنی اور پرنسپل کے علاوہ کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا اور عدالت میں جو کاغذات پیش ہوئے۔ وہ ڈی ایس پی برنی کے پاس تھے۔ میں نے پرنسپل کے کہنے پر ان کاغذات کی رسید پر بطور گواہ دستخط کیے۔ لیکن دوسرے گواہ اشفاق الزمان نے میرے سامنے دستخط نہیں کیے۔ عدالت میں موجود کاغذات میری موجودگی میں پروفیسر جمال نقوی کی پرسنل فائل سے نکالے گئے تھے۔ اس روز عدالت میں جام ساقی، پروفیسر جمال نقوی، ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن پاکستان کے مرکزی نائب صدر امر لال، احمد کمال وارثی، شبیر شر کے وکلاء موجود نہیں تھے۔ مزدور رہنما احمد کمال وارثی گردے کے درد کے باوجود عدالت میں موجود تھے۔ واضح رہے کہ وہ سینٹرل جیل کراچی کے ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ سول ہسپتال کے ماہر ڈاکٹروں نے اپنی رپورٹ میں احمد کمال وارثی کو علاج کے لیے ہسپتال میں داخل کرنے کی سفارش کی لیکن حکومت سندھ کے حکام نے ان کو ہسپتال میں داخل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ احمد کمال وارثی نے عدالت کو درخواست دی کہ ان کی تکلیف بڑھتی جا رہی ہے۔ انہیں فوری طور پر اسپتال میں داخل کیا جائے۔ عدالت میں ان رہنماؤں کے دوست رشتہ دار موجود تھے۔

۴ جولائی ۱۹۸۲ء کو خصوصی فوجی عدالت نے سہیل سانگی اور بدر ابڑو کی ضمانت کی درخواستیں مسترد کر دیں۔ قبل ازیں استغاثہ کے گواہ پروفیسر اشفاق پر وکیل صفائی یوسف لغاری نے جرح کی۔ گواہ نے جرح کے جواب میں بتایا کہ ڈی ایس پی ممتاز برنی نے اس کے سامنے کاغذات تحریر نہیں کیے تھے۔ نہ ہی پروفیسر جمال نقوی نے اپنا بائیو ڈیٹا فارم اس کے سامنے بھرا تھا۔ گواہ نے بتایا کہ اس کے کالج میں تمام کارروائی اردو میں ہوتی ہے۔ اس مقدمہ کے سلسلے میں گواہ سے کسی پولیس آفیسر نے تفتیش نہیں کی تھی۔ استغاثہ کے ایک اور گواہ پرنسپل اردو سائنس کالج پروفیسر اکرام نے ملزم بدر ابڑو کے وکیل شفیع محمدی کی جرح کے جواب میں بتایا کہ انہوں نے کبھی بھی ان چھے ملزموں میں سے کسی کو کالج میں پروفیسر جمال نقوی سے ملتے نہیں دیکھا۔ نہ انہیں کسی تخریبی سرگرمی میں ملوث پایا۔ عدالت میں ساتوں اسیروں سے ملنے کے لیے ان کے عزیزوں اور دوستوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔

۷ جولائی کو خصوصی فوجی عدالت استغاثہ کے گواہ اے سی ایم مسرور خان کو ملزم امر لال کے خلاف گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ گواہ نے بتایا کہ وہ گذشتہ سات سال سے اے سی کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ گواہ نے خصوصی فوجی عدالت کو بتایا کہ ملزم امر لال، نذیر عباسی کے بعد سندھ این ایس ایف کا صدر ہے۔ اس نے عدالت میں زیر دفعہ ۱۶۴ اقبالی بیان قلم بند کرایا تھا کہ اس کا اور اس کی تنظیم کا کسی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ ہی کسی بیرونی ملک سے کوئی تعلق ہے۔ وہ طلباء کے مسائل اور مشکلات کے حل کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ ملزم امر لال نے نہ تو کسی غیر قانونی کام میں حصہ لیا ہے نہ ہی مدد کی ہے۔

وکیل صفائی شفیع محمدی نے گواہ سے سوال کیا کہ کیا ملزم امر لال نے اپنے اقبالی بیان میں اقرار کیا کہ اس نے مذہبی یا طبقاتی منافرت پھیلانے والی کوئی چیز چھپوائی تھی۔ گواہ نے جواب دینے سے گریز کیا۔ استغاثہ کے گواہ اے سی ایم مسرور خان سے قبل خصوصی فوجی عدالت میں سرکاری گواہ صفدر بھٹی ایس ایچ او پیش ہوئے اور صدر جنرل ضیاالحق کی طرف سے موصول ہونے والا ایک خط پیش کیا۔ خط میں صدر ضیا کی طرف سے ہدایت کی گئی تھی کہ امر لال اور امداد چانڈیو کو گرفتار کر لیا جائے۔

گرفتاریوں کوتقریباً دوسال گزر چکے تھے۔ استغاثہ کی شہادتوں اوران پروکلائے صفائی کی جرح کا سلسلہ جاری تھا۔ملزمان کی اکثریت کے وکلا احتجاجاً عدالت میں پیش نہیں ہورہے تھے اوراب یہ بحث زور پکڑرہی تھی کہ کیا نذیرعباسی شہید کی موت کی تحقیقات کا مطالبہ غیرقانونی ہے۔ اس مطالبے پر جام ساقی اوران کے ساتھی پیش پیش تھے۔ دوسری طرف بعض ملزمان کے خلاف سرکاری شہادتوں پر جرح کبھی کبھی شدت اختیار کرلیتی تھی۔۱۱ جولائی ۱۹۸۲ءکو جام ساقی اوران کے ساتھیوں کوخصوصی فوجی عدالت میں پیش کیا گیا تو سندھی ادیب بدرابڑو کے وکیل شفیع محمدی اورصحافی سہیل سانگی کے وکیل یوسف لغاری بھی موجود تھے۔ طالب علم رہنما امرلال کے خلاف سرکاری گواہ مجسٹریٹ سرورخان پرشفیع محمدی نے جرح جاری رکھی۔ سرکاری گواہ نے انہیں بتایا کہ اقراری بیان سے پہلے اس نے امرلال سے کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔اس دوران جوگفتگو ہوئی تھی اسے ریکارڈ میں درج کردیا گیا۔ یہ بیان دیتے ہوئے امرلال نے اسے بتایا تھا کہ ۱۹۶۸ء میں پنوعاقل میں اس نے ایک جلسے میں جام ساقی، حیدر بخش جتوئی، ولی خان، عطاالله مینگل اورغوث بخش بزنجوسمیت کئی رہنماؤں کی تقریریں سنی تھیں اور جام ساقی کی تقریر نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ تاہم امرلال نے یہ اقرارنہیں کیا کہ اس نے بھی کوئی غیرقانونی تقریر کی تھی اورنہ ہی پولیس نے مجسٹریٹ کوکوئی ایساریکارڈ فراہم کیا جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ اس نے کوئی غیرقانونی تقریر کی تھی۔ سرکاری گواہ نے مزید بتایا کہ امرلال نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ بعض افراد نے سندھ یونیورسٹی میں 'سرخ پرچم'، 'ہلچل' اور ''عوام اقتدارسنبھالنے کے لیے تیار ہوجائیں'' نامی پمفلٹ تقسیم کیے تھےلیکن اس نے ان افراد کے نام نہیں بتائے۔ جرم کے دوران سرکاری گواہ نے بھی تسلیم کیا کہ نذیرعباسی کی موت کے اسباب معلوم کرنے کی اپیل کرنا کوئی جرم نہیں۔ سرکاری گواہ نے یہ بھی بتایا کہ امرلال نے تمام الزامات کی تردید کی اوراس کے قبضے سے کوئی غیرقانونی مواد بھی برآمد نہیں ہوا۔ شفیع محمدی کے بعد سہیل سانگی کے وکیل یوسف لغاری نے سرکاری گواہ پرجرح کی جس نے یہ تسلیم کیا کہ دفعہ ۱۶۴ کے تحت لیے گئے بیانات کے ہرصفحے پراس کے دستخط نہیں ہیں اوراس نے یہ بیان متعلقہ عدالت کوبھی نہیں بھیجا اورنہ ہی ریکارڈ روم میں داخل کیا۔ گواہ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اسے ڈی سی ویسٹ کا کوئی خط نہیں ملا بلکہ پولیس کے پرچے پراس کے احکامات درج تھے۔ گواہ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اس نے ملزم کویقین دہانی

کرادی تھی کہ اسے پولیس کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔

۱۳ جولائی کو مقدمے کی آئندہ سماعت کے دوران سندھی ادیب بدر ابڑو کے وکیل شفیع محمدی نے سرکاری گواہ اے سی ایم محمد حنیف پر جرح کی۔ گواہ نے فوجی عدالت کو بتایا کہ وہ پولیس کے ساتھ حیدرآباد کی بابن شاہ کالونی میں تلاشی کے لیے گیا تھا۔ مشیر نامہ ایس ایچ او نے لکھا تھا جس پر اس نے دستخط کیے تھے۔ سرکاری گواہ نے یہ بھی بتایا کہ اس نے پولیس پارٹی سمیت اے ڈی ایم کے محض احکامات پر گھر کی تلاشی لی تھی اور مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ برآمدشدہ مواد میں سے کس پر پابندی عائد ہے۔ اور اس پر کوئی مخصوص نشان بھی نہیں لگایا گیا تھا۔ میں تقریباً پانچ گھنٹے تک مذکورہ گھر میں رہا لیکن اس دوران میں نے ان سارے ملزمان میں سے کسی کو بھی وہاں نہیں دیکھا۔ جو مشیر نامہ عدالت میں پیش کیا گیا، اس میں یہ بات درج تھی کہ متعلقہ تفصیلات ایک علیحدہ کاغذ پر درج ہیں۔ عدالت میں اس مشیر نامہ کے ساتھ پانچ اور صفحات بھی منسلک تھے۔ سرکاری گواہ نے مزید بتایا کہ اُس نے ایف آئی آر کٹوانے کا حکم نہیں دیا اس لیے کہ اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ برآمد شدہ مواد قابل اعتراض ہے بھی یا نہیں۔ سرکاری گواہ نے یہ بھی بتایا کہ تفتیشی افسر نے دفعہ ۱۶۱ کے تحت اس کا بیان لیا تھا۔ مذکورہ مکان سے دستیاب ہونے والے ایک مضمون کے متعلق مشیر نامہ میں درج ہے کہ شاید یہ جام ساقی کا تحریر کردہ تھا لیکن چوں کہ اس نے گھر کی تلاشی سے قبل یا بعد جام ساقی کی تحریر کبھی نہیں دیکھی، اس لیے وہ نہیں کہہ سکتا کہ مذکورہ مضمون واقعی جام ساقی کا تحریر کردہ ہے۔ سرکاری گواہ نے اس بات کا بھی اقرار کیا کہ حاصل شدہ ۱۲۶۰ مضامین میں سے اس نے کسی ایک کا بھی مطالعہ نہیں کیا، اس لیے اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا کہ ان میں تخریبی مواد ہے یا نہیں۔ دریں اثناء فوجی عدالت میں احمد کمال وارثی دردِ گردہ سے تڑپتے رہے لیکن انہیں سول ہسپتال نہیں بھیجا گیا۔ عدالت میں جام ساقی، پروفیسر جمال نقوی، امر لال، احمد کمال وارثی اور شبیر شر کے وکلاء حاضر نہیں ہوئے۔

۱۶ جولائی کی سماعت کے دوران بھی جام ساقی، جمال نقوی، امر لال، شبیر شر اور احمد کمال وارثی کے وکلاء عدالت میں موجود نہیں تھے۔ سماعت کے دوران صحافی سہیل سانگی کے وکیل یوسف لغاری نے سرکاری گواہ اے سی ایم محمد حنیف پر جرح کی گواہ محمد حنیف نے کہا کہ یہ درست ہے

کہ حیدرآباد فوجی عدالت نمبر ۷ میں بھی اسی قسم کا مقدمہ چل رہا ہے جس میں ایک ملزم امداد چانڈیو ہے۔ انہوں نے بتایا کہ بابن شاہ کالونی حیدرآباد کے مکان نمبر ۵۲۷ پر جب چھاپہ مارا گیا تو گھر سے کوئی ملزم گرفتار نہیں ہوا تھا۔ گواہ مالک مکان کا نام بھی نہیں بتا سکا۔ گواہ نے ''سرخ پرچم'' کے شمارے جنوری ۷۹ء کے بارے میں بتایا کہ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ وہی ہے جو حیدرآباد سے برآمد ہوا تھا۔ گواہ نے کہا کہ اس کے پاس سوائے ایس ڈی ایم کے زبانی حکم کے کوئی ریکارڈ یا مواد موجود نہیں تھا جو اسے گھر کی تلاشی لینے کے لیے مطمئن کر سکے اور نہ اس کے پاس اس مقدمے کا ریکارڈ موجود ہے۔ جام ساقی اور دیگر تمام افراد نے فوجی عدالت کو درخواست دی کہ ۱۲ اپریل سے اب تک جتنے گواہ گزرے ہیں، ان پر جرح کا حق محفوظ ہے کیوں کہ عدالت ریکارڈ میں یہ لکھتی رہی ہے کہ ان سب کو موقع فراہم کیا گیا تھا لیکن جرح سے انکار کر دیا۔

۲۷ جولائی کو جام ساقی مقدمے کی سماعت کے دوران وکیل صفائی شفیع محمدی ایڈووکیٹ نے سرکاری گواہ مسعود پر جرح کی۔ استغاثہ کی طرف سے ایک اور گواہ شمس قریشی کو پیش کیا گیا۔ شفیع محمدی ایڈووکیٹ کی جرح پر شمس قریشی نے بتایا کہ پولیس نے چھاپے کے دوران علاقے کے کسی معزز شخص کو نہیں بلایا تھا۔ ضبط کی جانے والی چیزوں کی فہرست کے ایک کاغذ پر اس نے دستخط کیے تھے جبکہ چھاپے کی تفصیلات موقع پر نہیں لکھی گئیں۔ دوسرے روز کسی شخص نے دکان پر آ کر اس سے دستخط لیے تھے۔ اس نے اپنے علاقے میں احمد کمال وارثی کو کبھی غیر قانونی کام کرتے نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی اس سے برآمد ہونے والا مواد گھر سے لاتے ہوئے یا لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسی روز طالب علم رہنما جبار خٹک کو ڈی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹر میں قائم سمری ملٹری کورٹ میں پیش کیا گیا۔ ان کو مارچ میں پشاور میں گرفتار کیا گیا تھا۔ مقدمہ جام ساقی میں ان کو مفرور قرار دیا گیا تھا۔ ہری پور ہزارہ جیل سے جبار خٹک کو کراچی سینٹرل جیل منتقل کیا گیا۔ اس وقت تک ان کے خلاف کسی مقدمے کی سماعت شروع نہیں ہوئی تھی۔

اس اثناء میں جیل کے باہر سے ملزمان کے حق میں اور جمہوریت کی بحالی کے لیے بیانات کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ ۱۶ جولائی کو سندھ ہاری کمیٹی کے مرکزی جوائنٹ سیکریٹری غلام حسین شر نے مطالبہ کیا کہ پروفیسر جمال نقوی کی تشویشناک حالت کے پیش نظر انہیں فوری طور پر علاج کے

لیے بیرون ملک بھیجا جائے۔ ۵ اگست کو پاکستان نیشنل پارٹی کے رہنماؤں نے مطالبہ کیا کہ جام ساقی مقدمہ کے ملزموں احمد کمال وارثی اور شبیر شر کی خراب صحت کے پیش نظر انہیں جیل سے سول ہسپتال منتقل کیا جائے۔ جیل کے ڈاکٹر بھی کئی بار انہیں ہسپتال منتقل کرنے کی سفارش کر چکے تھے لیکن جیل انتظامیہ اس پر عمل کرنے سے قاصر تھی۔ ۹ اگست کو کراچی اور ملک کے دیگر شہروں میں شہید نذیر عباسی کی دوسری برسی منائی گئی۔ ۹ اگست کو جام ساقی مقدمہ کی سماعت کے دوران مقدمہ کے ملزمان جب عدالت میں پیش ہوئے تو انہوں نے اپنے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ وہ نذیر عباسی کی موت کی تحقیقات نہ کرانے اور ایف آئی آر پر عمل درآمد نہ ہونے پر احتجاج کر رہے تھے۔ ۱۱ اگست کی سماعت کے دوران ایس ایچ او جامشورو شفیع محمد سومرو پر وکیل صفائی یوسف لغاری نے جرح کی۔ سماعت سے قبل جام ساقی کی درخواست پر راولپنڈی سازش مقدمے کے ملزم ائیر کموڈور محمد خان جنجوعہ، سندھی ادیب نور عباسی اور ممتاز ترقی پسند افسانہ نگار کی موت پر فاتحہ خوانی اور دعا کی گئی۔

اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۲ء کے دوران بھی جام ساقی کیس کی سماعت جاری رہی۔ پروفیسر جمال نقوی کی بگڑتی ہوئی صحت کے پیش نظر ان کی رہائی اور بیرون ملک ان کے علاج کے مطالبے ہوتے رہے۔ بے بنیاد مقدمے کو ختم کرنے اور جمہوریت کو بحال کرنے کے مطالبے ہوتے رہے۔ سرکاری گواہوں کے کمزور بیانات اور ان پر وکلائے صفائی کی جرح ہوتی رہی۔ ایسا لگتا ہے کہ حکومت کی طرف سے ایک معمول کی کارروائی تھی جسے پابندی اور مستقل مزاجی کے ساتھ گزشتہ ایک سال سے دہرایا جا رہا ہے، یہاں تک کہ ۱۸ اکتوبر کو ایمنسٹی انٹرنیشنل نے جام ساقی مقدمے کے سات کمیونسٹ ملزمان کو ضمیر کے قیدی قرار دینے کا اعلان کیا۔

۲۱ اکتوبر کو پروفیسر جمال نقوی کی حالت بگڑنے پر انہیں جناح ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ دو ماہ قبل ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور اس تمام عرصہ میں ان کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے معائنے کے بعد بتایا کہ انہیں طبی سہولتیں فراہم نہ کرنے کے باعث ان کی صحت کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کر گیا ہے۔ ممتاز ترقی پسند سیاسی رہنما غوث بخش بزنجو، تحریک بحالی جمہوریت (ایم آر ڈی) کے سیکریٹری خواجہ خیر الدین نے انہیں فوری رہا کر کے بیرون ملک علاج

کے لیے بھیجنے کا مطالبہ کیا۔ ۲۷اکتوبر کو ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اپنی رپورٹ جاری کی جس میں کہا گیا کہ سیاسی مخالفین کے خون سے نہ کھیلا جائے۔ ۱۳نومبر کو حسن ناصر شہید کی برسی کے موقع پر بھی ان مطالبوں کی گونج سنائی دی۔ ۲۱نومبر کو استغاثہ کے آخری گواہ ڈی ایس پی ممتاز برنی کے بیان پر جرح کا سلسلہ شروع ہوا۔

۲۰نومبر کو پروفیسر جمال نقوی کا نام ملزموں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا، لیکن ان کی رہائی عمل میں نہ آسکی۔ البتہ جناح ہسپتال میں ان کا علاج جاری رہا۔ ۹دسمبر کو آخری گواہ نے جرح کے دوران بتایا کہ ایس پی لیاقت آباد نے ایک خط کے ذریعے احمد کمال وارثی اور شبیر شر کے خلاف مقدمات کی تحقیقات کا حکم دیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ پاکستان کوارٹرز کے جس گھر پر چھاپہ مارا گیا، وہ کمیونسٹ پارٹی کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ گواہ نے اس بات کی تردید کی کہ کمیونزم میں مذہب کے خلاف کچھ نہیں ہے۔ تاہم اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ بیانات نمبر۳ اور۴ میں مذہب کے خلاف کچھ نہیں ہے۔ ان بیانات میں افغانستان کے ببرک کارمل کو مبارک باد دی گئی تھی۔ گواہ کے مطابق ملزم امرلال نے اس بات کا اقرار کیا کہ وہ ''سرخ پرچم'' اور ''ہلچل'' تقسیم کر رہا تھا۔

سرکاری گواہوں کے بیانات اور ان پر جرح مکمل ہوتے ہی اب جام ساقی مقدمہ کے ملزموں کے بیانات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

۲۸دسمبر کو شبیر شر کا بیان شروع ہو کر یکم جنوری کو مکمل ہوا۔

بیان کیا ہے، بلیک کامیڈی کا شاہکار ہے۔ اس مقدمے میں شبیر شر کو سات سال قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں یہ بیان ایک ایسا آئینہ ہے جس میں فوجی جرنیلوں کو یقیناً بندر دکھائی دیئے ہوں گے۔ اس کو سات سال سے زیادہ سزا ملنی چاہیے تھی۔ بیان کے چند حصے آپ بھی دیکھیں:

''مجھے یہ تو پتا نہیں کہ گرفتاریوں اور آزادیوں کا آپس میں کتنا گہرا رشتہ ہے لیکن ۲۶جولائی کیوبا کا یوم آزادی ہے اور میں ۹جولائی کو گرفتار ہوا۔ وہاں کیوبا کے عوام ابھی آزادی کا جشن منا کر اپنی تھکن دور نہیں کر پائے ہوں گے کہ یہاں مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ وہ واقعی خوش تدبیر ہیں لیکن میں سوچتا رہا کہ بہر حال دو ملکوں میں کتنا بڑا تضاد ہے ایک جگہ سرخ پرچم بلندی پر اور آزاد

فضاؤں میں لہرا رہا ہے۔اور دوسری طرف ''سرخ پرچم'' کو گرفتار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور مجھ پر اسے لہرانے کی فرد جرم عائد کر کے مجھے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ پس جناب میں بہت اہم قیدی ہوں۔اس لیے نہیں کہ میرا نام کیا ہے اور نہ اس لیے کہ میں ملک کے کس حصے میں پلا بڑھا۔ بلکہ اس لیے کہ بین الاقوامی فکر کا حامل سرخ پرچم میری پہچان کا معیار مقرر ہوا ہے۔اور شاید اس لیے بھی کہ کہیں میری آزادی ملک کو بھی آزاد نہ کرا لے۔

جب مجھ پر گوریلا کارروائی ہوئی تب حکومت نے دیکھا کہ میں نے پھٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے، پسینے سے شرابور تھا اور تلاشی کے بعد میرے پاس سے صرف ساڑھے تین روپے برآمد ہوئے تھے پھر بھی وہ مجھ سے خوف زدہ تھے۔ یہ بہر حال اک اچھی علامت ہے کہ حکومت مفلس آدمی سے ڈرنے لگی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ملٹری آفیسر نے مجھے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا تھا، ''بہت خوب۔'' ایسا ہی جملہ ہم کرکٹ کے میدان میں چھکے لگتے وقت سنتے ہیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے کشمیر کا کوئی مورچہ سر کر لیا ہو۔ جہاں تک میرا خیال ہے، اس موقع پر اس کو شرمندہ ہونا چاہیے تھا، آخر اس نے کسی جنرل اروڑا یا مانک شا کو تو نہیں پکڑا تھا مجھے پکڑنا کون سی فخر کی بات تھی؟ لیکن جناب! اگر ایک لاکھ فوجی ہتھیاروں سے مسلح ہونے کے باوجود ہتھیار ڈال کر آتے ہیں تو اس میں شبیر شر کا کیا قصور ہے؟ پھر اس نے مجھے ایک عجیب خبر سنائی، اس نے مجھے بتایا کہ میں بہت دنوں سے روپوش تھا۔ اس کی یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی، میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ اگر مجھے روپوش ہونا ہوتا تو میرے وطن کا کوئی بھی گھر مجھے موت کے فرشتے سے بھی چھپا لیتا۔

میں نے اس کو یہ بھی بتایا تھا کہ مجھے پہلے سے ہی خبر تھی کہ وہ آئیں گے، میں نے کہا تھا، ''تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آ گیا۔'' اس نے حیران ہو کر پوچھا تھا، ''کیسے؟'' شاید اس نے سمجھا کہ مجھے سرکاری رازوں کی خبر ہو چکی ہے۔اس نے حیران ہو کر پوچھا تھا کہ اس کے باوجود ہم ان کا انتظار کیوں کر رہے تھے۔ سچ یہ ہے کہ اس وقت مجھے اپنی ہنسی روکنی مشکل ہو گئی تھی۔ میں نے ہنسی روک کر اسے بتایا، ''محترم! ہر قصے میں جادو یا چڑیل اور کانا دیو تو ہوتے ہی ہیں۔'' اس پر اس نے کہا تھا کہ وہ میرا دماغ درست کر دے گا۔ میرا جواب تھا، ''میں نہ صرف سرخ سوچ کا پرچارک ہوں بلکہ

اگر موقع ملا تو آئندہ بھی بنا رہوں گا۔'' لیکن وہ بگڑ گیا۔ غصے کے مارے اس کے منہ سے جھاگ بہنے لگی۔ لفظوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا، پھر بھی اس نے کہا، ''تم بڑے خطرناک آدمی ہو۔'' میں صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ ''شاید تمہاری نظر میں ہر شریف آدمی خطرناک ہوتا ہے۔'' پھر میری آنکھوں پر کالی پٹیاں باندھ دی گئیں اور میں نے شکر ادا کیا کہ اب میں شیطان کا چہرہ نہیں دیکھوں گا۔

لانڈھی جیل میں قیدی بچے خطرناک قیدی کے لیے ''ڈانڈرس'' قیدی کا محاورہ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے معصوم ذہنوں میں وہ لوگ ڈانڈرس ہوتے ہیں جن کی قامت پہلوانوں جیسی ہو، بڑی بڑی تاؤ دی ہوئی مونچھیں ہوں اور وہ کم سے کم دس پندرہ خون کر چکا ہو۔ جب وہ اپنی زندگیاں ''خطرے'' میں ڈال کر ڈرتے ڈرتے مجھے دیکھنے آئے تو بڑے مایوس بھی ہوئے اور حیران بھی، کیوں کہ میں نے نہ خون کیے تھے اور نہ بھولو پہلوان جتنا وزن رکھتا تھا اور نہ ہی اپنی مونچھوں پر تاؤ دے رکھا تھا۔ نہ ہی میری آواز میں شیروں جیسی گرج تھی۔ نہ میں نے ان سے چرس مانگی اور نہ ہی کٹّر۔ لیکن وہ یقین کرنے پر مجبور تھے کہ میں بڑا ڈنڈارس قیدی ہوں اس لیے کہ جیل انتظامیہ یوں کہہ کر ان کو ہم سے دور رکھ رہی تھی۔

ہمارے ملک میں اور بھی بڑی عجیب باتیں ہوتی ہیں (ویسے تو ہر بات عجیب ہے) مثلاً جب امریکہ سے ہماری حکومت کی یاری کڑھائی پر جلیبی کی طرح پکتی ہے تو ہمارے جرنیلوں کے لیے ہتھیار آتے ہیں اور پھر شیر شاہ کے لشکر مسکین آدمیوں کے لیے زمین تنگ کر دیتے ہیں۔ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ جب امریکی بیڑہ کراچی کے سمندر پر پہنچتا ہے تو عوام کے اہم نمائندوں کو گرفتار کر کے ان کو اذیتیں دی جاتی ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں بھی یوں ہی ہوا تھا، امریکی بیڑہ پہنچنے کی شرط کے طور پر کامریڈ حیدر بخش جتوئی، سوبھو گیان چندانی، امام علی نازش اور پروفیسر جمال نقوی اور دوسرے رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ تو جب جولائی ۸۰ء میں امریکی ساتواں بیڑہ کراچی کے سمندر میں پہنچا تو مجھے بڑی تشویش ہوئی کہ دیکھیں اب کون سے مجاہد پکڑے جاتے ہیں؟ کیا دیکھتا ہوں کہ میں خود ہی حراست میں ہوں۔ وہی جولائی کا مہینہ اور اور وہی سرخ پرچم کے خلاف کارروائی! واقعی میں بڑا ڈنڈارس ہوں۔

جناب! پھر فوجی چھاؤنیاں تھیں، بند اندھیری کھولیاں اور میرا جسم ہاتھوں اور پیروں

سمیت زنجیروں سے بندھا ہوا۔ کبھی الٹا لٹکاتے تھے کبھی سیدھا اور کبھی مارتے پیٹتے تھے، نہ سگریٹ نہ پانی اور روٹی اس وقت تک نہیں ملتی تھی، جب تک ڈاکٹر چیک نہ کر لے چاہے دن کی جگہ رات ہو جائے۔ انہوں نے میرا بہت اچھا ''خیر مقدم'' کیا۔ میں ان کے احسانات کبھی نہیں بھلاؤں گا۔ انہوں نے اپنی اسلام پسندی کا اظہار بے جگری سے تشدد کر کے کیا، سپاہیوں کو صرف مار پیٹ کی اجازت تھی۔ بولنے کی نہیں اس لیے کہ کہیں وہ بھی مجھ سے نہ مل جائیں۔ بات یہاں ختم نہیں ہوئی مجھے حیرت اس وقت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ ہر دو گھنٹے کے بعد ان کی ڈیوٹی تبدیل ہو جاتی۔

میں اپنے اور اپنے ساتھیوں پر ہونے والے تشدد کی تفصیل دہرا کر نہیں چاہتا کہ آپ کا جی متلا جائے۔ مجھے ڈر ہے کہ آپ وحشت میں کہیں متلی نہ کرنے لگیں۔ میں آپ کے سامنے صرف ایک بات دہرانا چاہتا ہوں کہ وہ ۸ اگست ۱۹۸۰ء کی ایک صبح تھی جب کامریڈ نذیر عباسی شہید کو بھیڑیوں کے گھیرے سے نکالا گیا۔ زنجیر بکف جوان رعنا کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی گئی، اس کا پر وقار وجود زنجیروں سے چھن کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔

جناب! پھر مجھے بتایا گیا کہ اس سے محنت کشوں کے لیے جینے کے جرم میں انتقام لیا گیا ہے۔ پھر پتا چلا کہ جب اس کا بے جان جسم دفن کیا گیا اس وقت اس کے جسم پر کاٹنے کے نشانات تھے اور سینے میں دل نہیں تھا۔ ان بھیڑیوں نے کامریڈ شہید کا دل نکال لیا تھا اور اسے اپنے وحشی دانتوں میں چچوڑا تھا! آپ کو پتا نہیں ان کمینوں نے اس گلاب جیسے دل کو لوہے کے پنجوں سے اور دانتوں سے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے، جس میں محبت کا سورج جلتا تھا، ہمت کے پہاڑ ایستادہ تھے، جوش کے بے انت طوفان اٹھتے تھے، یہ دل کروڑوں انسانوں کے لیے دھڑکتا تھا اور اَن گنت دل اس کے ساتھ ساتھ دھڑکتے تھے۔ اتنا پیارا انسان! اور اس پر تہمت لگائی گئی کہ ''وہ ملک کا خوفناک ترین آدمی تھا۔''

شبیر شر اس کال کوٹھڑی میں شاہ لطیف بھٹائی کے اشعار کی شمع روشن کرتا ہے۔

دوسرے قیدی آرام سے ہیں لیکن ہم قید میں بھی چپ نہیں ہیں

ہمارے جسم پر اپنے لوگوں سے وعدے کی تلوار لٹک رہی ہے

لیکن جناب! ایف ۱۶ اور ایٹمی ہتھیاروں سے لیس یہ حکومت۔ اگر خائف ہوئی ہے تو

بس میرے جیسے ایک بے روزگار، بے اختیار شخص سے۔ اور کیوں نہ ہوتی آخر میں بھی تو بہت ڈانڈرس آدمی ہوں، پہلے تو مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں کتنا ڈانڈرس ہوں۔ پھر میں نے ڈانڈرس کامریڈ جام ساقی کو کیس میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ بھی تشدد برداشت کرکر کے ڈانڈرس ہوگیا ہے۔ اور پھر دوسرے ساتھیوں کو دیکھا۔ اسی راستے سے سفر کر کے آنے والے اور ڈانڈرس بنتے ہوئے لوگوں کو۔ اور اب مجھے تو یہ مقدمہ ڈانڈرس قیدیوں کا تاریخی مقدمہ لگ رہا ہے۔

ایک ڈانڈرس آدمی کو قید میں ڈالے رکھنے کے بعد سرکاری سطح پر جو دوسری سازشیں کی گئیں، ان میں سے ایک سازش ہمیں جلاوطن کرنے کی بھی تھی۔ مارچ ۱۹۸۱ء میں ایک منصوبہ بنایا گیا کہ کسی طرح مجھے اور میرے ساتھیوں کو زبردستی ہاتھ پاؤں باندھ کر ہائی جیکروں کے مطالبے کے بہانے ملک سے باہر نکال دیا جائے۔ میرے اور میرے ساتھیوں کے صاف انکار پر حکومت کے اہلکاروں نے زبردستی ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ کر اور ہمیں اوندھا کر کے تصویریں بنائیں۔ ہماری بھرپور مزاحمت، ان کا کیمرا توڑ ڈالا تھا۔ ظاہر ہے کہ قید خانے میں ہم اس سے زیادہ کیا کر سکتے تھے۔ ویسے بھی ہم ذہنی جنگ لڑنے کے حامی ہیں، لیکن اگر دوسرے جھگڑا کرنا چاہتے ہوں تو پھر دو ہاتھ ہر ایک کے پاس ہوتے ہیں۔ پھر مجھے پتا چلا کہ بی بی سی سے بھی بہت کچھ نشر کیا جاتا تھا کہ کمیونسٹوں نے جیل میں پھڈا ڈالا ہے۔ پھر ہماری ڈرپوک حکومت نے ہم سے تحریری طور پر پوچھا تھا کہ کیا ہم کابل یا دمشق جانے کے لیے تیار ہیں؟ تب جناب! ہم نے انہیں جواب دیا کہ پہلے تو ہمیں جیل سے رہا کرو اور پھر بات کرو۔ دوسرے محب وطن پاکستانیوں کو زبردستی جلاوطن کرنے کی بجائے کچھ فوجی جنرلوں کو گرفتار کر کے اور باندھ کر باہر بھیج دو تاکہ سب لوگوں کی جان چھوٹے۔ لیکن حکومت نے دونوں مطالبے نہیں مانے، خاص طور پر دوسرا جناب! وہ کچھ جنرلوں کے مفاد میں ساری قوم کو جلاوطن کر سکتے ہیں لیکن کچھ گندی مچھلیوں (جنرلوں) کو قوم اور ملک کی بقا کے لیے جلاوطن اور قربان نہیں کر سکتے۔ جناب! یہ بھی جہاز کے پاکستانی یرغمالیوں کی خوش قسمتی تھی کہ جہاز میں تین امریکی سمگلر موجود تھے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو حکومت پاکستان جہاز کے تمام مسافروں کو بھی مروانے کے لیے بڑی خوشی سے تیار تھی۔ وہ صرف یہ اعلان کرتی کہ ملک کے وقار کے لیے ضروری ہے کہ ڈیڑھ سو مسافر تو کیا، ملک کے آٹھ کروڑ انسان بھی ایک دھماکے سے اڑائے جا سکتے ہیں۔ لیکن

حکومت کی اس بد نصیبی کو کیا کیجئے کہ آقاؤں کے تین افراد بھی اس جال میں پھنس گئے تھے۔

تو جناب! میں ڈانڈرس پہاڑ کی چوٹی کو سر کرنے والے قافلے کا ڈانڈرس مسافر ہوں۔

پھر کیس شروع ہوا، سرکار نے مجھے میری مرضی کا دفاع کا وکیل نہ دیا۔ اس کے باوجود کہ اس قانون کے ماہر کا تعلق فوج سے تھا۔ فوجی وکیل پر میں نے اعتبار کیا لیکن سرکار نے نہیں۔ نہ صرف وکیل پر مجھے تو سارے فوجی سپاہیوں پر اعتبار ہے کیوں کہ وہ بھی مجھ جیسے میرے ہی ملک کے کسانوں، مزدوروں کے چہیتے ہیں۔''

اور بہت کچھ کہنے کے بعد ٹی وی آرٹسٹ شبیر شر اپنا بیان اس واقعہ پر ختم کرتا ہے۔

''جناب! بات کچھ یوں ہوئی کہ سکھر کے ایک فوجی افسر نے بابا سائیں اور کنبے کے سارے مکینوں کو بلا کر ڈرایا اور دھمکیاں دیں تھیں، میرے گھر کی عورتوں کی بے عزتی کی گئی جس کی وجہ سے میرے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اسی دوران میری ملاقات انقلابی رہنما کامریڈ جام ساقی سے ہوئی۔ میں نے ان کو اپنی انتقام لینے والی خواہش بتائی۔ اس فوجی آفیسر کا نام بتایا جس سے میں بدلہ لینے کے لیے بے چین تھا مگر کامریڈ نے مجھے سمجھایا کہ اس معاشرے میں اس جیسے نجانے کتنے ہیں تم کس کس سے انتقام لو گے۔ اس نے نذیر عباسی کی شادی کے فوراً بعد گرفتاری کا بھی ذکر کیا جس کے نتیجے میں اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ کامریڈ جام ساقی آدمیوں سے بدلہ لینے کی بجائے معاشرے کو بدلنے کی ضرورت کی بات کرتے ہیں اور اس بات کا مجھ پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ یہ انہی الفاظ کا نتیجہ ہے کہ آج میں ایک خونی قاتل کی بجائے ذمہ دار سیاسی کارکن ہوں لیکن اس کو کیا کہیئے کہ حکومت مجھے انہی اسباب کی وجہ سے ڈانڈرس سمجھنے لگی ہے۔''

اب اعلیٰ اور خصوصی فوجی عدالت کے سامنے اس طرح کا بیان دینے کے بعد شبیر شر کو صرف سات سال کی قید با مشقت دی گئی تو میں سمجھتا ہوں، اس کے ساتھ خاصی رعایت ہوئی۔ ورنہ حسن ناصر اور نذیر عباسی کی طرح اسے بھی رسمِ شبیری یاد دلائی جا سکتی تھی۔

شبیر شر کی طرح احمد کمال وارثی کو بھی سات سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ گرفتار وہ ۱۹۸۰ء میں ہوئے تھے لیکن مدتِ قید ۱۹۸۳ء سے شمار کی گئی۔ اور کیوں نہ کی جاتی۔ ہماری تاریخ کو قبل از مسیح اور بعد از مسیح کے ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنے مقدمے کے دور کو تارا مسیح کا

دور کہہ کر تاریخ سے عدم واقفیت کا کتنا بڑا ثبوت دیا۔ اسے فوجی حکومت تخریب کار نہ کہتی تو اور کیا کہتی۔ آغاز ہی سے ''بے چارے پولیس والے'' سے لے کر استغاثہ کے گواہوں کے مابین تضادات تک کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آپ خود دیکھ لیجئے:

''ہمارے خلاف یہ مقدمہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ ہمارے خلاف جن بے چارے پولیس والوں کو گواہ بنا کر پیش کیا گیا۔ انہوں نے نہ تو ہمیں گرفتار کیا تھا، نہ وہ گرفتاری اور خانہ تلاشی کے دوران موجود تھے اور نہ ہی کوئی تفتیش کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جھوٹے گواہ ہمیں شناخت کرنے میں قطعاً ناکام رہے۔ حالاں کہ عدالت میں کئی کئی بار چوری چھپے ہماری شناخت کروائی گئی۔ ایس ایچ او صفدر بھٹی نے بڑی صداقت کے ساتھ عدالت میں یہ بات تسلیم کی کہ سمری آف ایویڈنس کے دوران اس نے ہم لوگوں کو پہلی بار دیکھا تھا اور یہ کہ اس وقت ایک سب انسپکٹر زبیر کی محض نشاندہی پر انہوں نے ہماری شناخت کی تھی۔

جناب والا! استغاثہ کے ایک اور اہم گواہ ڈی ایس پی ممتاز برنی نے جو مقدمہ کی تفتیش کے تیسرے مرحلہ میں تفتیشی آفیسر بتایا جاتا ہے۔ عدالت کے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ ''میں یہ بات ریکارڈ دیکھ کر ہی بتا سکتا ہوں کہ ہمارے ملک میں کمیونزم کی تشہیر پر کوئی پابندی تو نہیں؟'' بے چارے تفتیشی افسر! تفتیش تو کر لی، کمیونزم کی تشہیر کے ''جرم'' پر مبنی چارج شیٹ بنا کر دستخط تو کر دیئے۔ لیکن یہ نہیں معلوم کیا کہ کمیونزم کی تشہیر پر پابندی ہے کہ نہیں؟ اسی بے چارے ڈی ایس پی کو نظریہ پاکستان کی وضاحت کرنے کے لیے ایسی کتاب کا سہارا لینا پڑا جو ہمارا مقدمہ شروع ہونے کے بھی چار ماہ بعد کی چھپی ہوئی تھی۔ (یہ بھی الگ بحث ہے کہ یہ کتاب کس حد تک قانونی لحاظ سے مستند ہے) نہ جانے مسٹر برنی اس مقدمے کی تفتیش اور چالان کی تیاری کے لیے ایسی کتنی ہی کتابوں سے استفادہ کر چکے تھے جو اس وقت شائع ہی نہیں ہوئی تھیں۔

یہ بات بھی کم مضحکہ خیز نہیں کہ ایک موقع پر کامریڈ جام ساقی کے ایک اعتراض کو عدالت درست مانتی ہے لیکن ایک دوسرے موقع پر ان کے ایسے ہی اعتراض کو مسترد کر دیتی ہے۔ مارشل لاء عدالتوں کے ''انصاف پرست'' ہونے کا ذکر کرتے ہوئے مجھے اس مقدمہ میں ملوث ایک دوست کی بات یاد آ رہی ہے جسے ٹارچر کیمپ میں پوچھ گچھ کے دوران تفتیش کرنے والے ایک فوجی افسر نے بتایا

کہ آپ لوگوں کی سزا کا تعین کوئی عدالت نہیں بلکہ صرف ہم (تفتیش کرنے والے افسران) کریں گے۔ انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ ''میاں یہ تارا مسیح کا دور ہے۔'' اگر چہ ہم نے اب تک قبل از مسیح اور بعد از مسیح کے ادوار کے بارے میں سنا اور پڑھا تھا۔ تاہم تفتیش کرے والے فوجی نے موجودہ دور کو تارا مسیح کا دور کہہ کر کچھ غلط نہیں کہا۔ واقعی آپ کی حکومت کا دور تارا مسیح کا دور ہے۔ جب ہی تو آپ کی حکومت نے لوگوں کو پھانسیاں دینے میں نہ صرف پچھلی حکومتوں کے ریکارڈ توڑ دیئے بلکہ اتنا آگے بڑھ گئے کہ آئندہ کی کوئی حکومت اس میدان میں شائد ہی آپ کی ہمسری کر سکے۔''

ممتاز سندھی ادیب اور جام ساقی کیس کے ایک اہم رکن بدر ابڑو نے اپنے مختصر بیان میں کمال شاعرانہ لب و لہجہ اختیار کیا:

''میں قلم، برش اور چھینی کے ذریعے خدمت کی وجہ سے بہتر رویہ اور عزت کا مستحق تھا لیکن چند آگ بگولہ، نامعلوم اور سادہ کپڑوں میں ملبوس لوگ میرے دفتر میں طوفان لے آئے۔ انہوں نے مجھے گرفتار نہیں درحقیقت اغوا کیا اور بدتمیزی سے پیش آئے۔ وہ مجھے ایک پرائیویٹ کار میں نامعلوم اور ویران جگہوں کی طرف لے گئے۔ اسے قانون کی اصطلاح میں گرفتاری نہیں کہا جاسکتا۔ اگر یہ گرفتاری تھی تو میں حیران ہوں کہ مجھے میری گرفتاری کے اسباب کیوں نہیں بتائے گئے۔ چار سو سات دن کی اذیت ناک قید کے بعد مجھے بتایا گیا کہ مجھے تخریب کاری کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ اس وقت مجھے قید ہوئے دو سال سے زائد وقت گزر چکا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا یہ ہے آپ کا اسلامی انصاف؟ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ سوال بھی تخریب کاری کے زمرے میں آجائے گا۔ میں کسی شکاری پرندے کے پنجوں میں فاختہ کی مانند محسوس کر رہا ہوں۔ اور مجھے اپنے جسم پر اپنے ہی خون کے چھینٹے دکھا کر کہا جا رہا ہے کہ میں شکاری ہوں، جبکہ اصل شکاری کے خون سے تر پنجوں کو نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ مجھے یہی کچھ حاصل ہوا ہے۔

امرتا پریتم کا خیال ہے کہ شاعر ققنس پرندے کی طرح ہوتا ہے۔ وہ پرندہ جو اپنے وجود سے موسیقی پیدا کرتا ہے، حتیٰ کہ موسیقی سے آگ بھڑک اٹھتی ہے اور اس کا اپنا ہی وجود جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ اور جب بارش ہوتی ہے، تب اس کی راکھ سے وہ پھر جنم لیتا ہے، جو پھر اپنے وجود سے

موسیقی پیدا کرتا ہے اور پھر جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ شاعر بھی اسی طرح لو جلاتا ہے اور اپنے وجود کی بھینٹ دیتا ہے اور پھر ہر دور میں پیدا ہوتا رہتا ہے۔ پھر سے اپنے وجود کی بھینٹ دینے کے لیے۔ یہ ایک تاریخی سچ ہے شاعر کو پھانسی چڑھا دیجئے، وہ پھر عیسیٰ کی طرح واپس آجائے گا اور زندہ رہے گا۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ تاریخ اسے اور مجھے بھی بے گناہ ثابت کرے گی۔ میں اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑا ہوں۔ میرے ضمیر نے مجھے بری کر دیا ہے۔ آپ بھی ضمیر کی عدالت کو فیصلہ کرنے دیجئے۔ اس لیے کہ انصاف عبادت کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔''

سہیل سانگی کو کبھی اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ انہیں کیوں جام ساقی مقدمہ کا حصہ دار بنا دیا گیا۔ شاید اس لیے کہ وہ جام ساقی کے چچازاد بھائی تھے!

''یہ محض ایک اتفاق تھا کہ میں روزگار کی تلاش میں کراچی آیا اور گرفتار ہو گیا۔ مجھے آج تک کوئی ایسی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے جس کے تحت میری گرفتاری ہوئی۔ شاید میرا زندگی کو پرکھنے کا زاویہ ان سے بہت مختلف تھا جنہوں نے مجھے گرفتار کیا۔

بھٹائی نے کہا ہے، کاش میں اتنا دانشمند نہ ہوتا کیوں کہ دانشمندوں کو ہی دکھ دیکھنے پڑتے ہیں۔ یہ دکھ وتایو فقیر کی طرح بھی تھے تو بلاول شہید اور عنایت شہید کی طرح بھی۔ ہر دور میں ''روایتی سوچ'' پر سوالات کرنے والوں پر مظالم ڈھائے گئے ہیں، کبھی کسی کو جلاوطن کر کے تو کبھی جیل میں بند کر کے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ڈھلتی ہوئی شام اور اس کے سائے چاہے کتنے ہی بڑے اور خوفناک کیوں نہ ہوں ان کی زندگی چند لمحوں کی ہوتی ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ مجھے اس لیے پابندِ سلاسل کیا گیا ہے کہ میں سوچنا چھوڑ دوں۔ بھوک کو بھوک، دکھ کو دکھ، حسن کو حسن نہیں کہوں، لکھنا چھوڑ دوں، رنگ اور خوشبو کی تمیز کھو بیٹھوں۔ ایسا کوئی بھی حساس، باشعور آدمی نہیں کر سکتا۔ اور یہ سب کچھ میں بھی نہیں کر سکتا۔ قید خانے کی محدود اور گھٹی ہوئی دنیا میں جہاں محرومیاں بڑھ جاتی ہیں تو وہاں رنگ اور خوشبو کی طلب اور شدت اختیار کر جاتی ہے۔ شاید یہ اس لیے ہے کہ بقول پال بران کے میں انسانی تاریخ کی سب سے اعلیٰ روایات یعنی انسانیت، عقل اور ترقی کا وارث ہوں، نگہبان ہوں۔ میرا قلم حسن کی تلاش میں سچائی کو اخذ کرنے اور انسانی ذات سے بھوک، بے روزگاری، جہالت اور بیماری کے مشکل دن دور کرنے

کے لیے کھر درے کاغذوں پر بھی چل سکتا ہے۔

میرے انٹیروگیٹر نے مجھ سے بعض بہت ہی دلچسپ سوالات کیے، پوچھا کہ میں صحافی کیوں ہوں؟ میں نے بتایا کہ صحافت کیا چیز ہوتی ہے اور اس کے کیا لوازمات ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اگر مجھ سے یہ پوچھ بیٹھتا کہ میں جام ساقی کا چچازاد بھائی کیوں ہوں تو اس کے اس سوال کا میرے پاس واقعی کوئی بھی جواب نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ جام ساقی کا چچازاد بھائی ہونا بھی جرم ہے کہ نہیں؟ لیکن اس کا اندازہ مجھے انٹیروگیشن اور اس کیس میں ملوث کرنے سے ہو رہا ہے۔

کسی بھی استغاثہ کے گواہ نے میرے خلاف کچھ بھی نہیں کہا ہے، سوائے اس بات کے کہ مجھے گرفتار کیا گیا، میری گرفتاری تو ایک حقیقت ہے۔ آج تقریباً ڈھائی سال ہو گئے ہیں کہ میں جیل میں ہوں۔ کیا جرم ثابت کرنے کے لیے گرفتاری ہی کافی ہے استغاثہ کے گواہوں کے بیانات اس سے زیادہ میرے خلاف کچھ بھی نہیں بتاتے۔ اس مسئلے پر میرا وکیل تفصیلی بحث کرے گا لیکن میں بعض حقائق کورٹ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میری گرفتاری کے جو استغاثہ کے گواہ بنائے گئے ہیں ان بچاروں کے فرشتوں کو بھی میری گرفتاری کا علم بھی نہیں تھا۔ گرفتار کرنا تو دور کی بات۔ ان بچاروں نے مجھے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عدالت کے باہر والے کمرے میں چار مرتبہ شناخت کرانے کے باوجود وہ کورٹ کے اندر مجھے نہیں پہچان سکے۔''

جنابِ صدر اور معزز اراکین عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے، جام ساقی کیس کے ایک اور رکن امر لال نے فوجی عدالت کو عدالت ماننے سے انکار کیا۔ اپنا بیان ختم کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

''پاکستان کے نوجوانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے میں اس فوجی عدالت کو عدلیہ کا حصہ تسلیم نہیں کرتا بلکہ اسے استحصالی حکومت یا ایجنٹ سمجھتا ہوں۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ ملک اور عوام کے مفاد میں جو کچھ ہم نے کیا ہے، ہم اس پر فخر کرتے ہیں اور یہی کریں گے۔ ہمارا مقصد پاکستان میں سیکولر جمہوری حکومت قائم کرنا ہے جس کی طاقت کا منبع عوام ہوں۔''

خود جام ساقی کا بیان پاکستان کی سیاسی اور سماجی تاریخ کا نچوڑ تھا۔ ابتدا میں انہوں نے اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کی نشاندہی کی۔ اس کے بعد انہوں نے پوری تفصیل سے پاکستان کی

سیاسی، اقتصادی اور سماجی تاریخ کا کچا چٹھا بیان کیا۔

''میرے ملک کی کہانی خون اور آنسوؤں سے لکھی گئی ہے لیکن جن لوگوں نے اپنے ملک اور عوام سے دھوکہ کیا ہے، ان کی غداری کو بھی کبھی نہیں بخشا جائے گا۔ جمہوری اور محنت کش عوام کی دہشت نے ان حاکموں کو اس قدر خوف زدہ کر رکھا ہے کہ ان مارشل لاء حاکموں نے مجھے اس مقدمہ میں ملوث کرنا ضروری سمجھا جو میری گرفتاری کے بتیس ماہ اور کچھ دن بعد قائم کیا گیا تھا۔ اور چوں کہ یہ بھی ایک سیاسی مقدمہ ہے اس لیے مجھے اپنے سیاسی دفاع کے ساتھ ساتھ خود اپنا دفاع بھی کرنا پڑے گا۔ مجھے ۱۰ دسمبر ۱۹۷۸ء کو گرفتار کرنے کے بعد میرے ساتھ جو وحشیانہ برتاؤ کیا گیا اور جو اذیتیں دی گئی ہیں، میں دوبارہ ان کا ذکر نہیں کروں گا۔ مجھے تیس دنوں کے لیے قید تنہائی میں ڈنڈا بیڑیاں لگا کر کھولی (کوٹھری) میں بند کرنے کی سزا سنا دی گئی۔ ایک لمحہ کے لیے ہی سہی، ذرا یہ تصور تو کیجیے کہ کہاں ایک سیاسی قیدی اور کہاں یہ ڈنڈا بیڑیاں! میری معلومات کے مطابق، میں پہلا سیاسی قیدی ہوں جسے یہ ڈنڈا بیڑیاں لگائی گئیں اور مجھے یقین ہے کہ ان احکامات کے پسِ پردہ کوئی بڑی توپ ہوگی۔ ورنہ سپرنٹنڈنٹ جیل کو ایسے احکامات جاری کرنے اور عمل درآمد کرنے سے پہلے سو بار سوچنا پڑتا۔ یہاں میں یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ پہلے جب میں خفیہ فوجی اذیت گاہوں میں اپنی زندگی اور موت سے برسرِ پیکار تھا، تب مجھے روزانہ چار ٹیکوں کے حساب سے تیس دنوں تک Depress کرنے والے انجکشن لگائے گئے تھے اور یہ اس لیے کیا گیا کہ میری قوتِ ارادی اور اعصاب کو کمزور کیا جا سکے۔ ان ایک سو بیس انجکشنوں کا میری صحت پر کتنا اثر پڑا ہے یا پڑے گا۔ اس کا فیصلہ تو ماہر ڈاکٹر ہی کر سکتا ہے۔ ایک ایسی حکومت جو اپنے مخالفوں کے خلاف ایسی وحشیانہ کارروائی کرتی ہے، وہ کسی طرح بھی مہذب نہیں ہو سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے اس پُراسرار غازی کے کسی بہت ہی قریبی رفیق کار نے ایسا اشارہ دیا ہوگا ورنہ کوئی چھوٹا موٹا افسر کبھی بھی اپنے طور پر ایسی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال یہ وحشیانہ برتاؤ اور دوسری ایسی غیر انسانی، غیر اخلاقی اور غیر قانونی کارروائیاں پاکستان کے عوام کے خلاف ان کے جارحانہ حملے کا حصہ ہیں۔

موجودہ مقدمے میں میری شمولیت دراصل موجودہ حکومت کے امریکہ کے ساتھ نئے ناطے اور دست نگری کا ایک واضح ثبوت ہے اور اس قدیمی دشمنی اور سامراجی سازشوں کی کہانی

۱۹۵۳ء سے شروع ہوتی ہے جب امریکہ نواز افسروں کے ایک چھوٹے ٹولے نے موقع پرست اور اپنے حواری سیاست دانوں سے مل کر جی ایچ کیو (فوجی ہیڈکوارٹر) کی مدد سے خواجہ ناظم الدین کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ اور پھر ان کی برطرفی نے پاکستان میں سازشوں کے جال کی راہ ہموار کردی۔ امریکہ میں پاکستان کے ایک سفیر محمد علی بوگرہ کو وہاں سے درآمد کرکے پاکستان کا وزیراعظم مقرر کیا گیا اور ان عوام دشمن سازشوں میں جنرلوں کے ٹولے نے چوں کہ اہم کردار ادا کیا تھا، اس لیے انہوں نے اس اقتدار میں حصہ مانگا اور اس طرح ایوب خان کو وزیر دفاع مقرر کردیا گیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک فوجی ہیڈکوارٹر ملک کی پالیسیاں بنانے میں اہم کردار ادا کرتا رہا ہے اور اس ضمن میں ہمیں یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ یہ فوجی نوکرشاہی جو ہمیں انگریزوں سے ورثے میں ملی ہے بنیادی طور پر امن وامان قائم رکھنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ یعنی اس کا اہم فریضہ آزادئ وطن کے لیے لڑنے والوں کو دبا کر رکھنا تھا۔ اس لیے اسے ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت اور ریشہ دوانیوں کا چسکا پڑا ہوا تھا۔ اس نے نہ صرف انتظامیہ میں اپنے اثر ورسوخ میں اضافہ کیا بلکہ موقع غنیمت جان کر نوکرشاہی سرمایہ بھی پیدا کیا۔ اس نے زرعی زمینوں پر بھی قبضہ کیا، حتیٰ کہ بالآخر وہ ایک مفاد پرست ٹولہ بن گئے۔ اس مفاد پرست ٹولے نے امریکی سامراج کا سہارا لیا اور اس سے فوجی معاہدے کیے پھر حکمران طبقوں کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ لولی لنگڑی اسمبلی بھی ان کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ ہے، اس لیے انہوں نے اسے بھی برطرف کردیا۔ اس وقت کی اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیزالدین نے اس کارروائی کے خلاف ایک پٹیشن داخل کی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ منتخب اسمبلی کے ذریعے عوام ہی اقتدار اعلیٰ کے مالک ہیں نہ کہ گورنر جنرل جو کہ اس وقت برطانوی حکومت سے نامزد کیا جاتا تھا۔ لیکن اس وقت کی اعلیٰ عدالت نے اسی کارروائی کو جائز قرار دے دیا۔ حالاں کہ سات سال بعد جسٹس منیر نے خود اعتراف کیا کہ انہوں نے یہ فیصلہ حکومت کے دباؤ اور دھمکی کے تحت سیاسی بنیاد پر کیا تھا۔ مسلم لیگ عوام میں اس قدر غیر مقبول ہو چکی تھی کہ جب مشرقی پاکستان میں انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ نے ۳۱۰ نشستوں سے صرف ۹ نشستیں حاصل کیں لیکن مرکزی اقتدار پر قابض ٹولے نے عوام کی رائے کو ماننے سے انکار کردیا اور ان کے خلاف پروپیگنڈا شروع کردیا۔ درحقیقت سامراجی پٹھوؤں کی حکومت تمام جمہوری قوتوں کو کچلنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ اور اس

نے اسی لیے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان پر پابندی عائد کر دی، ترقی پسند ادیبوں کی انجمن طلباء کی متعدد انجمنوں اور دیگر ترقی پسند تنظیموں پر بھی پابندیاں عائد کر دی گئیں اور ہزاروں سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کو قید کر دیا گیا۔ چوں کہ کمیونسٹ پارٹی اپنے ملک کے مظلوم عوام کے حقوق کی اہم علمبردار ہوتی ہے، اس لیے ہر عوام دشمن حکومت پہلا حملہ اسی پارٹی پر کرتی ہے۔ مسلم لیگ بھی ترقی اور قومی خیر خواہی کی بجائے تنزل کی طرف گئی ہے اور مسلم لیگ جو کبھی روشن خیال مسلمانوں کی جماعت تھی اور قائداعظم جس کے پہلے صدر تھے آج یہاں تک جا پہنچی ہے کہ اس کا صدر حکومت کے قریبی گٹھ جوڑ کا شریک ایک پیر ہے۔

ایوب خان حکومت کا عوام نے عین اس وقت بیڑہ غرق کر دیا جب وہ اپنا دس سالہ جشن منا رہی تھی، عوام نے اس کے جبر اور اقتدار کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا اور گلی گلی اس خود ساختہ صدر کے لیے ایوب کتا ہائے ہائے کے نعرے لگانے لگے اور اس احتجاج کے بعد وہ گول میز کانفرنس بلانے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن جنرلوں کے اس ٹولے نے ایک بار پھر سازش کر کے کرسی پر قبضہ کر لیا اور نیا مارشل لاء لگا کر یحییٰ خان کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا گیا۔ پھر اس کے ساتھ ہی دوبارہ تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی اور اظہارِ رائے کی بندش عائد کر کے تمام آزادی سلب کر لی گئی۔ لیکن آخر کار اس فوجی ٹولے کو بھی عوام کے شدید دباؤ کی وجہ سے بنیادی جمہوریتوں کے فرسودہ نظام کو ختم کر کے ایک آدمی ایک ووٹ کی بنیاد پر عام انتخابات کا اعلان کرنا پڑا اور ون یونٹ کو توڑ کر مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں کو بحال کرنا پڑا اور یحییٰ خان نے اگرچہ انتخاب تو کروا دیا لیکن اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔''

جام ساقی تفصیل سے بتاتے ہیں کہ کیسے یحییٰ خان نے اپنے ہی ملک پر حملہ کر دیا۔ مشرقی پاکستان کے عوام کا قتل عام ہوا۔ شملہ معاہدے پر دستخط ہوئے۔ لیکن صرف پانچ سال کے اندر اندر جرنیل دوبارہ اقتدار پر قابض ہو گئے۔ اور جلد ہی افغان جہاد کا شور۔

''جس دن افغان حکومت نے اپنے ہاں سود اور خواتین کی خرید و فروخت کو غیر قانونی قرار دیا تھا، اسی دن مرحوم مفتی محمود صاحب نے یہ بیان دیا کہ یہ پٹھانوں کی حکومت ہو ہی نہیں سکتی۔ شاید مرحوم کسی ایسے پٹھان کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے جو سود اور خواتین کی خرید و فروخت کو ناجائز

سمجھتا ہو۔ یہ حکومت افغانستان کی قومی جمہوری پارٹی کی حکومت پر الزام لگاتی ہے کہ وہ وہاں کے عوام کی منتخب حکومت نہیں ہے حالاں کہ یہ حکومت خود غاصب اور بن بلائی مہمان ہے اور یہ ایسا ہی ہے گویا کہ بھینس گائے پر الزام لگاتی ہے کہ ''تمہاری دم کالی ہے۔''

قرآن شریف میں اشارہ ہے، اے ایمان والو، وہ نہ کہو جو کرنے کا ارادہ نہ ہو۔ خدا کو یہ بات انتہائی ناپسند ہے (سورۃ صف ۲۔۳) لیکن اس پُراسرار غازی کے قول وفعل میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اسلام اور ملک میں موجود قوانین حلف کی خلاف ورزی کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ مگر اس نے اور اس کے ساتھیوں نے ایک منتخب حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اگر حلف نامے (بیعت) کی خلاف ورزی اتنی ہی آسان تھی تو تعجب ہے کہ کربلا کے المیے سے بچنے کے لیے حضرت امام حسینؓ نے یہ ترکیب کیوں نہ استعمال کی۔

حکومت کو پوری طرح علم ہے کہ پریس اور عدلیہ کی آزادی کے حقیقی علمبردار صرف ملک کے محنت کش عوام ہیں اور ملک کے محنت کش عوام کے لیے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اگر عدلیہ کو تھوڑی سی بھی آزادی ہوتی، قانون کی بالادستی ہوتی، اگر پریس پر پابندی نہ ہوتی اور ہمارا بدنصیب ملک امریکہ کے زیردست اور اس کی طفیلی ریاست کی حیثیت میں نہ ہوتا تو یہ پُراسرار غازی ''نذیر عباسی'' کو فوجی کیمپ میں وحشیانہ اذیتیں دے کر شہید نہ کر سکتے تھے۔ اس مقدمے میں شامل میرے دوسرے ساتھیوں اور دوستوں کی زندگیاں اس لیے نہیں بچیں کہ وہ قصائی بعد میں کوئی انسان بن گئے تھے بلکہ ان کی زندگیاں صرف اس لیے بچ گئیں کہ تمام ترقی پسند اور محب وطن لوگوں نے ملک بھر اور پوری دنیا میں بڑی مہم چلائی تھی۔ میں اپنے تمام ساتھیوں اور پاکستان کے عوام کی طرف سے ان سب کا شکر گزار ہوں اور انہیں یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کو جدید مواصلاتی ذرائع بھی اس قدر قریب نہیں لا سکے اور نہ ہی اتنی ہم آہنگی پیدا کر سکے جس قدر کہ یکجہتی، بھائی چارے اور اصولوں کے یہ جذبات دنیا کو قریب لائے ہیں۔''

جام ساقی اپنے بیان میں پلٹ پلٹ کر شہید نذیر عباسی کی طرف آتے ہیں۔ ان کے بقول اس نام نہاد اسلامی حکومت نے نہ صرف مجھ پر بار ہا تشدد کیا ہے بلکہ پاکستان کے بے باک اور نڈر طالب علم رہنما نذیر عباسی کو انتہائی درندگی کے ساتھ شہید کر دیا۔

جام ساقی بڑی تفصیل سے سماجی اصلاحات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ وہ سماجی انصاف پر اصرار کرتے ہیں۔ جرائم پیشہ سربراہ مملکت کا ذکر کرتے ہوئے، جام ساقی سماجی تباہی کی تفصیل بیان کرتے ہیں:

''جب حکومت کا سربراہ (اور ملک کا بھی) ملتان کے مزدوروں کا قتل عام کرواتا ہے۔ منتخب وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کرواتا اور حمید بلوچ کو پھانسی پر لٹکا دیتا ہے اور نوجوانوں کے رہنما ''نذیر عباسی'' کو اذیتیں دے کر شہید کرواتا ہے تو اس کے بعد قتل ملک میں روزمرہ کا معمول بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی کی سی آئی اے، غلام حسین، عطا محمد اور دوسروں کو اذیتیں دے کر قتل کرتی ہے۔ چوکی کی پولیس محمد سرور کو اذیتیں دے کر ہلاک کر دیتی ہے اور بوا اور صغریٰ کی عصمت لوٹ کر انہیں ننگا کر کے نچاتی ہے۔ سانگلہ ہل پولیس ماسٹر اصغر کو اذیتیں دے کر مار ڈالتی ہے۔ لاہور چھاؤنی کی پولیس کئی بے گناہ افراد کو اپنے ظلم وتشدد کا نشانہ بنا کر مار ڈالتی ہے۔ دادو پولیس کالو برہمانی کو اذیتیں دے کر ہلاک کرتی ہے۔ جیکب آباد پولیس جمعہ پٹھان کو تادم مرگ زدوکوب کرتی ہے۔ بنوں جیل کے حکام اسلم خان کو اذیتیں دے کر قتل کرتے ہیں۔ کورنگی پولیس محمد داؤد کو بے پناہ تشدد کر کے ہلاک کر دیتی ہے۔ دوداپور پولیس اللہ ڈنہ کو تشدد کر کے مار ڈالتی ہے۔ چوہڑکانہ منڈی، لاہور پولیس مس شہناز اور فیضان کو تھانے میں بلا کر ننگا کر کے نچاتی ہے۔ سرحد پولیس سید کامران رضا کو اذیتیں دے کر قتل کر دیتی ہے۔ گوجرہ پولیس صحافی اشفاق حسین قریشی کو تشدد کے بعد ہلاک کر دیتی ہے۔ تلہار (سندھ) پولیس شاہ محمد قریشی کو اذیتیں دے کر قتل کر دیتی ہے۔ علاوہ ازیں کون جانے ایسے کتنے دوسرے واقعات رونما ہوئے جو محض سینسر شپ کی وجہ سے پریس میں نہیں شائع ہو سکے۔''

جام دوبارہ نذیر عباسی کی طرف آتے ہوئے اپنے مقدمے کے ذکر پر اپنا بیان ختم کرتے ہیں۔ ''مجھے خفیہ اذیت گاہوں کے شریفانہ سلوک کا پہلے سے ہی اندازہ تھا، اس لیے میں نے حیدر آباد کی خصوصی فوجی عدالت کے سامنے اپنے بیان میں یہ کہا تھا کہ اگر فوجی انٹیلی جینس کے شعبے کی سیاست میں مداخلت جاری رہی تو وہ ایک آدم خور بن جائے گا۔ یہ بیان میں نے ۲۹ جون ۱۹۸۰ء کو دیا تھا اور نذیر عباسی کو ۹ اگست ۸۰ء کو فوجی کیمپ میں اذیتیں دے کر شہید کر دیا گیا تھا۔ یہ بات اب

پوری دنیا کو معلوم ہو چکی ہے اور یوں قاتلوں کے اس ٹولے نے ہماری فوج کو ذلیل و خوار کیا ہے۔
اس لیے میں مطالبہ کرتا ہوں کہ نذیر عباسی شہید کے قاتلوں کو منصفانہ مقدمے کے لیے پاکستان کے
عوام کے حوالے کیا جائے اور ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہم یہ مقدمہ سول عدالتوں میں ملک کے عام
قوانین کے مطابق چلائیں گے اور ہم یہ بھی یقین دلاتے ہیں کہ ہم تارا مسیح جیسے چھوٹے ملزموں کو
ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے بلکہ اصل مجرموں سے حساب کتاب لیں گے۔

جہاں تک اس مقدمے کا تعلق ہے اس میں کوئی نئی چیز نہیں ہے، سامراج کی دلال ہر وہ
حکومت جو بڑے سرمایہ داروں، بڑے بڑے زمینداروں اور سینئر جرنیلوں سے گٹھ جوڑ کرتی ہے، وہ
کمیونسٹوں اور دیگر محبِ وطن لوگوں کے خلاف اس قسم کے مقدمات ہمیشہ قائم کرتی ہے تا کہ وہ ان
کے مکروہ عزائم کو ناکام نہ بنا سکیں۔ اس عدالت کے فیصلے کی تصدیق بھی انہی جرنیلوں کو کرنی ہے جو
ہمارے اتنے ہی دشمن ہیں کہ انہوں نے ۲۶ جنوری ۸۴ء کو اخبارات کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اس مقدمہ کی
خبریں نہ شائع کریں اور میرا نام تو کسی بھی صورت میں اخبار میں نہ آنے پائے۔

اس عدالت کو تشکیل کرنے والے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل عباس اور چیف مارشل لاء
ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیا دونوں ہی ہمارے نوجوانوں کے رہنما نذیر عباسی شہید کے قتل کے مقدمے کی
''ایف آئی آر'' میں ملزم ہیں۔ اس کے علاوہ یکم اگست ۸۱ء کے لیٹر نمبر N/11/80/P.O11/1 میں
جنرل ضیا مجھے اور اس مقدمہ میں شامل میرے دیگر دوستوں کو مقدمہ چلانے سے پہلے ہی مجرم قرار
دے چکا ہے، لہٰذا ہم کون سے انصاف کی توقع رکھ سکتے ہیں۔ جب کہ اسے اس فیصلے کی، تصدیق ہی
کروانی ہے۔ مجھے پتا ہے کہ اس کورٹ کے نام میں بڑے بڑے ٹوپلوں کے فیصلہ کے خلاف
پاکستان کی سپریم کورٹ میں بھی کوئی اپیل نہیں کر سکتے لیکن پھر اس سے بھی بڑی عوامی عدالت میں
ہمارے مادرِ وطن کے تمام محبِ وطن لوگ مشترکہ طور پر ہمارے منصف ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ
دن دور نہیں جب وہ مادرِ وطن کو ان سامراجیوں اور اس کے دلالوں سے آزاد کروائیں گے۔

جنابِ والا! یہ کورٹ ہم پر اتنی نامہربان رہی ہے کہ اس نے ہمارے گواہانِ صفائی کی
فہرست کو کم کر کے صرف چند ایک افراد کو ہی بلانے کی اجازت دی ہے۔ اگر چہ فوجی قوانین کے
مطابق بھی اسے ایسا کوئی اختیار نہیں ہے۔ شاید اس عدالت نے اس لیے ایسا کیا ہے کہ اس پر ان

بزدل ظالموں کا دباؤ ہے جنہوں نے اس عدالت کو لولے لنگڑے اختیارات ہی اس لیے دیئے ہیں کہ ہمارے بدنصیب ملک میں موجود مارشل جسٹس (فوجی انصاف) بھی ناپید کر دیا جائے۔ جناب من! یہ ایک سیاسی مقدمہ ہے خود وکیل استغاثہ نے بھی ہمیں اخلاقی مجرم ٹھہرانے سے گریز کیا ہے، اگر ہمیں ملک کے تمام ممتاز صحافیوں، رائے عامہ کے رہنماؤں، مختلف مکاتب فکر کے سیاسی لیڈروں اور زندگی کے ہر شعبے کے ماہروں کو طلب کرنے کی اجازت دی جاتی تو یہ بات بڑی آسانی سی ثابت ہوسکتی تھی کہ نہ صرف ہم محب وطن ہیں بلکہ جس لٹریچر کو تخریبی کہا جا رہا ہے وہ بھی وطن دوستی، امن، ترقی اور خوشحالی کا پرچار کرتا ہے!

بہر حال، شاید جیسا کہ یہ مقدمہ اب اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے اور اس عدالت کو آخر کار کوئی ناخوشگوار فیصلہ سنانا ہے، اس لیے اس کے ایک فریق بن کر الگ کھڑے ہونے کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ جناب والا! میں آپ کو یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اگرچہ ملک کی اعلیٰ عدالتیں بھی دباؤ کے تحت فیصلے دیتی رہی ہیں لیکن پھر بھی انہیں حکومت کی تبدیلی کے بعد تلافی کا موقع مل جاتا ہے مگر فوجی عدالتوں کو یہ موقع بھی نہیں ملے گا۔ لہٰذا انہیں ایک ہی مرتبہ یہ فیصلہ بھی کرنا ہوگا کہ وہ تاریخ کی طرف ہیں یا بڑی ٹوپیوں کی چمچہ گیری کریں گے۔''

جام ساقی مقدمہ چار پانچ سال تک چلتا رہا۔ اس باب کے ابتدائی صفحات میں ہم استغاثہ کے گواہوں کے بیانات اور ان پر جرح کی تفصیل دے چکے ہیں۔ ملزموں کے بیانات کے بعد اب ہم صفائی کے گواہوں کے بیانات کا جائزہ لیں گے اور دیکھیں گے کہ ضیا الحق کے انتہائی تاریک دنوں میں بھی روشن ضمیر انسانوں کی کمی نہیں تھی۔

جام ساقی نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے گواہان صفائی کے طور پر درجنوں نام پیش کیے جن میں سے اکثریت عدالت میں پیش ہوئی جبکہ بعض نے گواہی دینے سے معذرت کر لی۔ ۱۳ جنوری کو صحافی اقبال جعفری عدالت میں پیش ہوئے اور اپنے بیان میں کہا کہ مارشل لاء حکومت کا ایک نظام ہے جبکہ مسلح افواج ایک ادارہ ہیں، اس لیے مارشل لاء پر کی جانے والی تنقید مسلح افواج پر تنقید نہیں ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے جام ساقی مقدمہ کے قیدیوں کو ضمیر کے قیدی قرار دیا ہے۔ صفائی کے گواہ کو ''سرخ پرچم'' کے بعض مضامین دکھائے گئے جس پر اقبال جعفری

نے کہا، وہ نہیں سمجھتے کہ یہ مضامین تخریب کاری کے زمرے میں آتے ہیں۔ جام ساقی نے سندھ یونیورسٹی کی ایسوسی ایٹ پروفیسر مہتاب راشدی کا نام بھی صفائی کی گواہ کے طور پر پیش کیا تھا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر کہ وہ اس مقدمے کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں، عدالت میں حاضری سے معذرت کرلی۔ مشہور سیاسی رہنماؤں، خان عبدالولی خان، غوث بخش بزنجو، معراج محمد خان اور فتح یاب علی خان اور مولانا امروٹی بھی گواہان صفائی کے طور پر پیش ہوئے۔

غوث بخش بزنجو نے ایک طویل بیان میں جام ساقی اور ان کے ساتھیوں پر لگائے جانے والے تمام الزامات کو مسترد کردیا۔ انہوں نے کہا:

''میں نے جام ساقی کو کبھی تخریب کاری یا ملک دشمن سرگرمیوں میں شریک ہوتے نہیں دیکھا۔ ملزم جام ساقی نے مختلف مواقع پر میرے ساتھ کام کیا ہے اور میں نے اسے ملک کا وفادار اور ایک ثابت قدم سیاسی رہنما پایا ہے۔ پاکستان میں یہ ایک افسوس ناک روایت ہے کہ حکمران اپنے مخالف سیاستدانوں پر غداری اور ملک دشمنی کا الزام لگاتے ہیں۔ اس میں ایسی کوئی بھی سیاسی جماعت یا سیاسی رہنما نہیں ہے جس پر ملک دشمنی یا غداری کا الزام نہ لگا ہو۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج کے حکمرانوں کو بھی کل غدار تصور کیا جائے گا۔ جام ساقی پر جو یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ مسلح افواج کے خلاف نفرت پھیلاتے ہیں۔ مجھے اس الزام سے اتفاق نہیں ہے۔ جام ساقی ایسا نہیں کرتے۔''

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ فوج کے خلاف نفرت کون پھیلاتا ہے، بزنجو صاحب نے کہا: ''میں فوج کے خلاف نفرت پھیلانے کا ذمہ داران مہم جو جنرلوں کو تصور کرتا ہوں جو مارشل لاء نافذ کرتے ہیں اور اپنے ذاتی اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے فوج کو پاکستانی عوام کے بالمقابل لاکھڑا کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہ ان کی صلاحیتوں سے بالاتر ہے میں صوبوں کے مابین بھی نفرتوں کو جنم دینے کی ذمہ داری حکمرانوں اور مفاد پرستوں پر عائد کرتا ہوں کیوں کہ ان لوگوں نے ذاتی مفادات کے لیے پاکستان کی شکل وصورت کو مسخ کردیا ہے۔ پاکستان ایک وفاقی ملک تھا اور اس کی وفاقی اکائیاں خودمختار اور آزاد تھیں۔ قائداعظم اور ان کے رفیقوں نے ملک کا جو تصور دیا تھا وہ یہ تھا کہ وفاق پاکستان اکائیوں پر مشتمل ہوگا۔ ہمارے صوبے انتظامی اکائیاں ہیں۔ پاکستان کی وفاقی

اکائیاں تاریخی اکائیاں ہیں۔ ماسوائے چند ایک گنے چنے لوگوں کے باقی تمام وفاقی اکائیوں کے ساتھ تھے لیکن ایک کے بعد دوسرے حکمران نے اس انتہائی اہم اور بنیادی مسئلہ کو پیچیدہ بنا دیا۔ ہر حکمران نے پاکستان کو وحدانی ریاست بنانے کی کوشش کی اور اس کے نتائج کو نظرانداز کیا جس کی ایک مثال پاکستان کو ''ون یونٹ'' بنانا ہے۔ چنانچہ اس طرح وفاقی اکائیوں کی حیثیت میونسپلٹی سے کم ہوگئی اور مرکزی حکومت نے خود کو وفاقی اکائیوں کے تمام چھوٹے و بڑے مسائل میں براہ راست ملوث کر لیا۔ وفاقی اکائیوں کو زیادہ تر حلقہ اقتدار سے دور رکھا گیا اور انہیں حکومت میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی۔ جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان ہم سے علیحدہ ہوگیا۔ مثال کے طور پر بار بار مارشل لاء نافذ کیا گیا، ون یونٹ کا نظام مسلط کیا گیا اور غیر جماعتی نظام کے ذریعے مشرقی پاکستان کے عوام کو ان کے حق رائے دہی سے محروم کر دیا گیا۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہی وہ اسباب تھے جو صوبوں کے مابین نفرتوں کو جنم دینے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ جام ساقی اور دیگر سیاستدانوں پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ انہوں نے صوبوں میں نفرت پھیلائی۔

میں اس بات کو پاکستان کے ہر شہری کا حق سمجھتا ہوں کہ وہ مارشل لاء کی مخالفت کرے اور ملک میں جمہوریت بحال کرے۔ میں یہاں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ اور تو اور خود جنرل ضیاء الحق بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ حکومت کرنے کا سب اچھا طریقہ مارشل لاء ہے۔ موجودہ مارشل لاء کو کسی بیمار شخص کے لیے ایک آپریشن سمجھا جا سکتا ہے جسے بعد میں فزیشن کے پاس لے جانا ضروری ہوتا ہے، یعنی اقتدار پھر عوام کے حوالے کر دیا جائے جو حقیقی معنوں میں حکمران ہیں۔ مگر آپریشن کو چھے سال تک طویل کر دیا جائے تو پھر مریض کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے مجھے ایسی کسی بغاوت کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے جس کا الزام جام ساقی پر عائد کیا گیا ہے۔''

کارروائی کے پہلے ہی روز عدالت نے الزام لگایا تھا کہ یہ لوگ افغان اور سوویت نقطہء نظر کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اس سوال کا دوٹوک جواب دیتے ہوئے بزنجو بولے:

''ایران اور افغانستان میں ہونے والے انقلابات کا پاکستان پر براہ راست اثر پڑا ہے کیوں کہ پاکستان ان دونوں ممالک کا نزدیکی ہمسایہ ہے۔ مجھے افغان مسئلہ پر بہت زیادہ تشویش ہے ہمیں ان دونوں مسائل پر غیر جانبداری سے نظر ڈالنا چاہیے۔ ہمیں افغانستان میں ہونے والی

تبدیلی پر پریشان نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ یہ ان کا داخلی معاملہ ہے۔ پاکستان جب سے معرض وجود میں آیا ہے، ہم یہاں مختلف نظاموں کو اپناتے رہے ہیں، لیکن افغانستان کے حکمرانوں اورعوام نے کبھی ہمارے داخلی معاملات میں مداخلت نہیں کی۔ جب ۶۵ء اور ۷۱ء میں پاکستان کی مسلح افواج بھارت کے ساتھ برسر پیکار تھیں تو اس وقت بھی افغان حکمرانوں نے نہ تو ہمیں پریشان کیا اور نہ ہماری سرحدوں پر کوئی گڑ بڑ کی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم نے ''انسانی بنیادوں'' کے نام پر یہاں افغان مہاجرین کی بہت بھاری تعداد کو پناہ دے کر ایک بہت بڑی غلطی کی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ایک بار جب مہاجر کسی ملک میں آباد ہو جائیں تو پھر وہ وہاں سے کبھی اپنے ملک واپس نہیں جاتے۔ افغان مہاجرین اس ملک کا انتہائی سنگین مسئلہ ہیں اور یہ بات ناممکنات میں سے نہیں ہے کہ افغان مہاجرین اپنی بندوقوں کا رخ کابل کی بجائے اسلام آباد کی طرف پھیر دیں۔ خدانخواستہ اگر ہم نے ایران کے معاملے میں بھی ایسی ہی سنگین غلطی کا ارتکاب کیا تو یہ پاکستان کی یکجہتی وسلامتی کے لیے انتہائی تباہ کن ہوگا۔''

بزنجو صاحب نے نظریہ پاکستان کی بھی وضاحت کی جس پر بہت ہنگامہ ہوا اور اخباروں نے اس کے خلاف اداریے لکھے:

''پاکستان کوئی ذی ہوش شے نہیں بلکہ زمین کا ایک جغرافیائی ٹکڑا ہے، اس لیے اس کا اپنا کوئی نظریہ نہیں ہوسکتا۔ صرف انسان کو ہی اللہ تعالیٰ نے اس گراں قدر خوبی سے مالا مال کیا ہے کہ اس کا کوئی نظریہ خیال اور سوچ ہو۔ دوقومی نظریے کی بنیاد پر برصغیر کی تقسیم برصغیر کے آئینی مسائل کا حل تھا۔ قائداعظم اور مسلمانوں کی کوششوں کے باوجود کانگریس نے حتی المقدور یہ کوشش کی کہ بھارت کو متحد رکھا جائے لیکن کسی تصفیے پر سمجھوتہ نہ ہوسکا اور انگریز نے حالات کی بناء پر برصغیر کو تقسیم کردیا۔''

انہوں نے مزید کہا: ''جنرل یحییٰ خان کے دور تک نظریہ پاکستان جیسی کوئی اصطلاح سامنے نہیں آئی تھی اور اسے جماعت اسلامی نے وضع کیا اور استعمال کیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے نظریہ پاکستان وہ تھا جس پر قائداعظم نے عملدرآمد کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان کے موجودہ اور سابقہ حکمرانوں سمیت اس سلسلے میں کوئی قائداعظم سے زیادہ بہتر طور پر کچھ نہیں جانتا۔ قائداعظم نے

ملک کوایک آزاد جمہوری نظام دیا تھا۔ آئین پاکستان یا کوئی اور قانون یہاں مارشل لاء نافذ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ تاہم منتخب جمہوری اور قانونی حکومت، سویلین حکمرانوں کی مدد کے لیےفوج کو طلب کرسکتی ہے اور ایسی صورت میں فوج، سول حکام کے احکامات کی پابند ہوگی۔

میں نے جام ساقی کو آخری بار ۱۹۷۳ء میں دیکھا تھا پھر آج دیکھ رہا ہوں۔ اس دوران میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ مجھے جام ساقی پر عائد کیے جانے والے الزامات کا بھی کوئی علم نہیں اور میری ہمیشہ سے یہ رائے رہی ہے کہ جام ساقی بالکل بے قصور ہے، بے گناہ ہے۔ میں اس بات پر یقین نہیں کرسکتا کہ جام ساقی تخریب کاری میں ملوث ہوگا۔

گواہ کو سرخ پرچم شمارہ نمبر ۴ کے صفحہ نمبر ۳ پر اداریہ پڑھ کر سنایا گیا۔ عدالت کے روبرو اس کا بیان یہ تھا کہ اداریہ میں تخریب کاری کی کوئی بات نہیں ہے اور تو اور اداریہ میں لفظ ''ریاست'' تک استعمال نہیں کیا گیا۔ یہ کہنا درست ہے کہ غاصب وہ فرد یا گروہ ہوتا ہے جو ان لوگوں کی مدد یا حمایت کرتا ہے جو بزور قوت عوام کے حقیقی حقوق غصب کرلیتے ہیں اور غاصب منتخب نہیں ہوتا اور اس نے عوام سے منظوری حاصل نہیں کی ہوتی۔ جو اداریہ مجھے پڑھ کر سنایا گیا ہے اس میں تخریب کاری یا نفرت کا کوئی اشارہ تک نہیں ہے۔ البتہ پوسٹر لگانے، جلسے کرنے اور دیواروں پر لکھنے کے ذریعے جام ساقی کی رہائی کی اپیل ضرور کی گئی ہے کیوں کہ جلسوں کے انتظامات کرنے پر مکمل پابندی عائد ہے اور یہ غیر قانونی اور غیر آئینی پابندی مارشل لاء نے عائد کی ہے چنانچہ یہ احکامات بھی غیر قانونی ہیں۔''

خان عبدالولی خان نے بھی جام ساقی پر لگائے گئے الزامات کی تردید کی۔ بزنجو صاحب کی طرح انہوں نے بھی نظریہ پاکستان کے بارے میں بات کی:

''موجودہ مارشل لاء جب نافذ ہوا تو میں حیدرآباد سینٹرل جیل میں مقید تھا۔ اس مارشل لاء کا سبب یہ بتایا گیا تھا کہ پچھلی حکومت کا محاسبہ کیا جائے گا اور وعدہ کیا گیا تھا کہ ۹۰ دن میں انتخابات کروائے جائیں گے۔ یہ وعدہ ہنوز تکمیل طلب ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ انتخابات اسی وقت ہوں گے جب پاکستان کے عوام سنجیدگی سے مطالبہ کریں گے۔ سرخ پرچم (۶۔۱۴) کے صفحہ نمبر ۲ پر جو لکھا گیا ہے اس میں زیادہ ترسچائی موجود ہے اس میں جام سے یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ اس

حکومت نے اگر انتخابات نہ کرائے تو لوگ اسے خود ہی بتا دیں گے۔

میرے خیال میں جام ساقی پر فوج کے خلاف نفرت پھیلانے کا الزام غلط ہے۔ میری رائے میں اس کی بات کا مطلب یہ ہے کہ فوج کو ملکی سیاست میں ملوث کیا جا رہا ہے۔ میری رائے میں فوج ایک قومی ادارہ ہے جس پر ہر شہری کا حق ہے جو بھی اسے سیاست میں ملوث کرتا ہے، وہ اسے کسی مخصوص سیاسی نظریے کے تحت کرتا ہے اور اس قومی ادارہ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ فوجی کیمپوں میں تشدد اور اذیت گاہیں، لوگوں میں اس کے خلاف نفرت پیدا کرتی ہیں۔ جام ساقی کی بات کو اسی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔''

نظریۂ پاکستان کے حوالے سے ولی خان بولے:

''حیدرآباد کیس میں مجھ پر بھی یہی الزام تھا۔ میں نے یہ مطالبہ کیا کہ وکیل سرکار اس جرم کی وضاحت کرے کیوں کہ نہ تو قانونی کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے اور نہ ہی اس آئین میں جس پر میں نے دستخط کیے ہیں عدالت نے اس اصطلاح کی تشریح کرنے سے معذوری ظاہر کی۔

آئین کی دفعہ ۲۷۳ کے تحت مسلح افواج کا رول متعین کر دیا گیا ہے۔ دفعہ ۶ میں درج ہے کہ فوج کو اقتدار پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور دستور کی منسوخی کو انتہائی درجہ کی غداری سمجھا جائے گا۔ لہٰذا مارشل لاء کے قانونی ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے۔

صوبوں کے درمیان نفرت پھیلانے کے مسئلہ پر میں آپ کو قیام پاکستان کے فوری بعد کا عرصہ یاد دلاتا ہوں جب اسمبلی آئین بنا رہی تھی۔ اور اس وقت ایکا ایکی حکمران طبقہ پر کھلا کہ مشرقی بنگال کی آبادی مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہے۔ اس لیے اگر دستور جمہوری ہوا تو اقتدار مشرقی پاکستان کے ہاتھ میں منتقل ہو جائے گا۔ لہٰذا ون یونٹ بنایا گیا۔ ون یونٹ ٹوٹ گیا۔ لیکن قومیتوں کے حقوق غصب رہے۔''

جب غوث بخش بزنجو کا نظریۂ پاکستان کے حوالے سے بیان سامنے آیا تو روزنامہ ''نوائے وقت'' نے اس کے خلاف ایک طول طویل اداریہ لکھا۔ اداریے میں سیاق وسباق سے ہٹ کر قائداعظم کے اس بیان کو دہرایا گیا:

''کالعدم پاکستان نیشنل پارٹی کے سربراہ جناب غوث بخش بزنجو نے نظریہ پاکستان کو

بنیادی طور پر ایک غلط اصطلاح قرار دیا ہے جو (ان کے بقول) پہلی بار یحییٰ خان کے زمانے میں جماعت اسلامی نے استعمال کی تھی اور اس سے پہلے کبھی سننے میں نہیں آئی تھی۔ انہوں نے یہ بات ایک خصوصی فوجی عدالت میں جام ساقی کے خلاف مقدمے میں صفائی کے گواہ کے طور پر اپنے بیان میں کہی۔ اس مقدمے اور اس کے سلسلے میں گواہی سے قطع نظر (جس پر اظہارِ رائے ہرگز مقصود نہیں)۔ جہاں تک جناب بزنجو کا تعلق ہے وہ اپنے اس خیال یا رائے کا پہلے بھی کئی بار اظہار و اعلان کر چکے ہیں اور یہ کہنا غلط معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بات ان کے سیاسی نظریے کا حصہ ہے۔

جناب بزنجو کا تعلق یا وابستگی جس نظریے سے ہے اس کی تو عمارت ہی لادینیت بلکہ الحاد کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے جب کہ نظریۂ پاکستان کی بنیاد اور روح نفاذِ اسلام ہے۔ اس سے انحراف ان کی سیاست کا حصہ بلکہ تقاضا ہے۔ باعثِ حیرت بات تو یہ ہے کہ جس مملکت کا رسمی اور آئینی طور پر دین ہی اسلام ہے اس میں جناب بزنجو ایسے عناصر اسلام پر مبنی نظریۂ پاکستان سے انحراف و انکار کی کھلی جرأت روا رکھتے ہیں اور مملکت و حکومت کے کارفرما ان سے کوئی باز پرس نہیں کرتے۔

جناب بزنجو اور ان کے ہم خیال عناصر نظریہ پاکستان سے انکار اور اس اصطلاح کو بنیادی طور پر غلط قرار دیتے وقت اس تاریخی اور عہد آفرین جدوجہد کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں جو برصغیر کے مسلمانوں نے قیام پاکستان کے سلسلے میں کی تھی۔ لیکن بڑا سیدھا سادہ سوال یہ ہے کہ آخر کسی نظریے کے بغیر برصغیر کی ہندو اکثریت اور غیر ملکی انگریز حکمرانوں کی زبردست اور متحدہ مخالفت کے باوجود اسلام کو بنائے مملکت قرار دینے والے پاکستان کا قیام کس طرح عمل میں آ گیا تھا؟ کیا کسی بنیادی نظریے اور جزو ایمان فلسفے کے بغیر پاکستان جیسی نظریاتی مملکت کے معرضِ وجود میں آنے کا تصور بھی کیا جا سکتا تھا؟ یہ اور بات ہے کہ جناب بزنجو اس وقت بھی اس نظریے پر (کہ مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ قوم ہیں) ایمان نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا سیاسی اعتقاد یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں اور آج بھی ان کا نظریہ یہ ہے کہ پاکستانی ایک قوم نہیں بلکہ مملکت پاکستان چار قومیتوں (بلوچ، سندھی، پنجابی اور پٹھان) کے وفاق پر مشتمل ہے اور ظاہر ہے کہ جس شخص کا یہ نظریہ ہو، وہ اسلامی نظریہ پاکستان کو کس طرح بنیادی طور پر درست اصطلاح تسلیم کر سکتا ہے۔

پاکستان کو زمین کا ٹکڑا اور نظریۂ پاکستان کو شعوری چیز قرار دینے کے متعلق جناب بزنجو

نے جو بات کہی ہے وہ بھی محض اور صرف نکتہ آرائی اور فلسفہ طرازی ہے۔ قائداعظم نے قیام پاکستان کی جدوجہد کے زمانے میں بھی اس نظریے کی بڑی شرح و بسط سے بار بار نشاندہی فرمادی تھی۔ کراچی میں مسلم لیگ کے اجلاس (۱۹۴۳ء) میں انہوں نے فرمایا تھا:

''وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں؟ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے؟ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟ وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، کتاب اللہ، قران حکیم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں، ایک خدا، ایک رسول ﷺ، ایک کتاب، ایک امت پر زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔''

مسلمانوں کے علیحدہ قوم ہونے کے نظریے پر جب ہندو کانگریس نے خاص طور پر یہ اعتراض کیا کہ اس برصغیر کے لوگ محض مذہب و عقیدہ تبدیل کر لینے سے (ان کی مراد اسلام قبول کر لینے سے تھی) کس طرح علیحدہ قوم بن سکتے ہیں تو قائداعظم نے مارچ ۱۹۴۴ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خطاب کرتے ہوئے اس کا جواب دیتے ہوئے یہ فرمایا:

''پاکستان تو اسی دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلے ہندو نے اسلام قبول کیا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے۔ وطن نہیں اور نہ ہی نسل۔ ہندوستان کا پہلا باشندہ جب مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم (ہندو) کا فرد نہ رہا۔ وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد بن گیا اور ہندوستان میں ایک نئی قوم (مسلمان) معرضِ وجود میں آ گئی۔''

یہ تو کچھ بعد کی باتیں ہیں۔ جب تحریک پاکستان تیزی سے پیش رفت کر رہی تھی اور جس نظریہ پاکستان سے جناب بزنجو اب تک انکار و انحراف کر رہے ہیں، اس پر بڑی تفصیل سے روشنی قائداعظم نے مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے اجلاس میں اس قرارداد پر اپنی تقریر میں ہی ڈال دی تھی جسے بعد میں قراردادِ پاکستان سے موسوم ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ قائداعظم نے فرمایا تھا:

''اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب ہی نہیں بلکہ درحقیقت وہ دو مختلف معاشرتی نظام ہیں، چنانچہ اس خواہش کو خواب و خیال ہی کہنا چاہیے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک متحدہ قومیت تخلیق

کر سکیں گے۔ میں واشگاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ کہ وہ دو مختلف تہذیبوں سے وابستہ ہیں جن کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی ترقی کی تمناؤں کے سلسلے میں مختلف تاریخوں سے نسبت رکھتے ہیں ان کی رزمیہ نظمیں، ان کے سر کردہ بزرگ، ان کی تاریخی ماخذ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک قوم کی فتح کو دوسری قوم کی شکست قرار دیا جاتا ہے۔''

ولی خان کے بیان پر ردِ عمل مختلف تھا۔ بیان دینے کے بعد انہیں فوراً کراچی بدر کر دیا گیا کیوں کہ حکومتِ سندھ نے صوبہ میں ان کے داخلے پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ انہیں گواہی بیان کے لیے صرف چار دن کے قیام کی اجازت دی گئی تھی اور جب انہیں کراچی بدر کر دیا گیا تو اس پر ولی خان کو کہنا پڑا کہ وہ چار دن کے ویزے پر کراچی آئے تھے۔ وہ عدالت میں بیان دے کر جونہی باہر نکلے۔ پولیس انہیں زبردستی ایئرپورٹ لے گئی۔ انہیں اس قدر جلدی میں صوبہ بدر کیا گیا کہ وہ اپنا سامان تک نہ لے جا سکے۔ روزنامہ ''نوائے وقت'' کے برعکس روزنامہ ''امن'' کے جمعہ خان نے صوبہ بدری پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

''حکومت علیحدگی پسندی کے خلاف ہے، صوبائی تعصب کے خلاف ہے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین سے وفاداری کا حلف اٹھائے ہوئے ہے جس میں پاکستان کو چار صوبوں، بلوچستان، سرحد، سندھ اور پنجاب کا ایک وفاق قرار دیا گیا ہے۔ مگر وہ قومی رہنماؤں کو ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں جانے سے روکتی ہے۔ اور وہ چاہتی ہے کہ کوئی سیاستدان اپنے صوبہ سے باہر نہ نکلے۔ بعض سیاستدانوں کو اپنے شہر سے باہر نکلنے کی بھی ممانعت ہے۔ اس طرح قومی اتحاد کو قائم رکھنے اور قومی یک جہتی کے لیے کام کرنے والوں پر پابندیاں لگائی جا رہی ہیں۔ ان پابندیوں سے خود بخود علیحدگی کے جراثیم پھیلیں گے۔ صوبائی تعصب پھیلے گا اور وفاق کا استحکام مجروح ہوگا۔ مگر حکومت نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے، اس کو خطرات نظر نہیں آتے اور وہ خود کو محفوظ سمجھنے لگی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ بلّی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر لے اور یہ سمجھ لے کہ اب بلّی کا خطرہ ٹل گیا ہے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو نے ضیا حکومت کے غیر قانونی ہونے سے اپنے بیان کا آغاز کیا۔ انہوں نے انقلابِ ایران، نظریۂ پاکستان اور مارشل لاء کے مقاصد پر بھی اظہارِ خیال کیا۔ بے نظیر

بھٹو نے کہا:

''آج پاکستان میں قانونی حکومت نہیں ہے بلکہ مارشل لاء کی حکمرانی ہے۔ مارشل لاء کا مطلب فوج کی حکومت ہے۔ ایسی حکومت جو فوجی رجمنٹ کے کمانڈر کی مرضی پر ہوتی ہے اور جو رائے عامہ سے نہیں بلکہ بندوق کی نالی پر قائم ہوتی ہے۔ میں مارشل لاء عدالتوں کو غیر قانونی سمجھتی ہوں۔ قانونی طور پر مجرم وہ ہوتا ہے جسے کوئی قانونی عدالت سزا دے۔ جسے مارشل لاء کی عدالت سزا دے، وہ شخص قانونی طور پر معصوم ہے۔''

انقلاب ایران کے حوالے سے محترمہ بے نظیر بھٹو نے بتایا کہ:

''عوام سینوں پر گولیاں کھانے کو اسی وقت تیار ہوتے ہیں جب ان کے پیش نظر کوئی عظیم مقصد ہو۔ کوئی نظام جب اپنے تضادات اپنے اندر حل نہیں کرسکتا تو لازمی طور پر دم توڑ دیتا ہے۔ میں شہید بھٹو کے الفاظ دہراتی ہوں، ''انقلاب تاریخ کی کہکشاں ہے۔ انقلاب کا مطلب ناانصافی اور نابرابری کا خاتمہ ہے۔ اس کا مطلب استحصال اور نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ہے۔ اس کا مطلب تیسری دنیا کے ممالک کے لیے نیا معاشی نظام ہے۔ انقلاب کا مطلب ظلم کا خاتمہ ہے۔''

بینظیر بھٹو نے پاکستان کو ایک نظریاتی مملکت قرار دیتے ہوئے کہا:

''پاکستان تاریخی ریاست نہیں ہے بلکہ آزادی کی جدوجہد چوں کہ ایک نظریہ کی بنیاد پر تھی، اس لیے یہ نظریاتی ریاست ہے۔ میری رائے میں اس نظریہ کی بنیاد غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کو معاشی و سیاسی حقوق نہ ملنے کے خوف پر تھی۔ قائداعظم نے اپنی تقریروں میں پاکستان کو ایک جمہوری ریاست قرار دیا جس میں اقتدارِ اعلیٰ عوام کے پاس ہو اور عدلیہ آزاد ہو تا کہ لوگوں کو ان کے سیاسی و معاشی حقوق حاصل ہوں۔۔ کچھ گروہ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان نظریہ اسلام ہے جبکہ تمام مسلمان یہ جانتے ہیں کہ اسلام جغرافیائی سرحدوں میں قید نہیں ہے۔ اسلام کی تعریف یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے اور مسلمان وہ ہے جو اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔ اس لیے اسلام کا نظریہ ہر اس مسلمان کے لیے ہے۔ جو پوری کائنات میں کہیں بھی اللہ کی اطاعت کرے، اس کے لیے مخصوص جغرافیائی حد بندی ضروری نہیں۔

قائداعظم نے چٹا گانگ میں ۱۹۴۸ء میں ایک تقریر میں کہا تھا کہ وہ اسلامی سوشلزم کی

حمایت کرتے ہیں اور پبلک سیکٹر کو اہمیت دیتے ہیں۔ پی پی پی نے اسلامی معیشت کے نعرے پر لڑائی لڑی اور اس پر عمل کرنے کے لیے عوام سے لازمی اختیار حاصل کیا۔''

مارشل لاء کے مقاصد پر اظہار خیال کرتے ہوئے محترمہ نے کہا:

''مارشل لاء کا پہلا مقصد پی این اے اور پی پی پی کے درمیان ۴ جولائی کو ہونے والے معاہدہ کو روکنا تھا' دوسرا مقصد بھٹو حکومت کو بدنام کرنا تھا کہ انتخابات میں دھاندلی ہوئی ہے جو سراسر جھوٹ تھا۔ تیسرا مقصد اس جھوٹ کو بڑھاوا دینا تھا کہ ملک میں خانہ جنگی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ چوتھا مقصد اقتدار حاصل کرنے کے لیے اس غداری کو چھپانا تھا جو آئین توڑ کر کی گئی اور یہ کہا گیا کہ پی پی پی نے آئین کو نقصان پہنچایا ہے۔ پانچواں مقصد محاسبہ تھا جو کبھی مکمل نہ ہوا۔ چھٹا مقصد اس جھوٹ کو پھیلانا تھا کہ وزیر اعظم کا ارادہ چیف آف آرمی سٹاف کو ہٹانے کا ہے۔ ساتواں مقصد مضبوط معاشی نظام قائم کرنا تھا جو درحقیقت ملک کو لوٹ مار کا اڈا بنانے پر ختم ہوا۔ آٹھواں مقصد انقلاب کے اثرات کو روکنا تھا۔''

جمیعت العلماء اسلام کے قائم مقام سیکریٹری اور ایم آر ڈی سندھ کے سیکریٹری جنرل نے اپنے بیان میں اسلام اور موجودہ حکومت، اسلام اور جغرافیائی سرحدوں اور نظریۂ پاکستان کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے آئین پاکستان کو نظریۂ پاکستان قرار دیا اور وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ

''میں آئین پاکستان کو نظریۂ پاکستان سمجھتا ہوں جسے معرض التوا میں ڈال دیا گیا ہے۔ میں اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ جس کسی نے آئین کو معطل کیا اس نے نظریہ پاکستان کو نقصان پہنچایا۔ اسلام بنیادی انسانی حقوق کا احترام، عدلیہ کی آزادی اور قانون کو مشعل راہ سمجھنے کا درس دیتا ہے۔ میں ان مطالبات سے بھی متفق ہوں کہ مزدوروں کو ان کے بنیادی حقوق دیئے جائیں۔ زمین ہاریوں میں تقسیم کی جائے اور یہ مطالبات غیر اسلامی نہیں ہیں۔ سوشلزم بھی زرعی اراضی کی کسانوں میں تقسیم اور بنیادی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے کا درس دیتا ہے۔ یہ بھی اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ میرے نزدیک سوویت یونین کے مسلمانوں پر کتاب لکھنا کوئی جرم یا غیر اسلامی کام نہیں ہے۔ اسلام صحت مند تنقید کی اجازت دیتا ہے۔ حکمران اور حکومت پر تنقید کرنا غیر اسلامی نہیں

ہے اور نہ ہی کوئی جرم ہے۔ اگر حکومت منتخب نہیں ہے تو غیر اسلامی ہے۔ موجودہ حکومت امریکہ سے مدد مانگتی ہے اور دوستی کی تجدید کرتی ہے حالاں کہ امریکہ، لبنان میں مسلمانوں کو قتل کرنے میں اسرائیل کے ساتھ ہر طرح تعاون کر رہا ہے اور اس کی مدد کر رہا ہے۔ میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ موجودہ حکومت نے سیاسی جماعتوں کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ اس نے مجاہدین کی جنگ کو پاکستان کے لیے جنگ قرار دیا ہے۔ سوشلزم ایک معاشی و اقتصادی نظام ہے۔

جنرل ضیا کی حکومت کو غاصب قرار دینا درست ہے کیوں کہ پاکستان کے عوام نے اسے منتخب نہیں کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ جام ساقی پر کیا الزامات ہیں۔ موجودہ حکومت کے خلاف دیواروں پر نعرے لکھنا، پوسٹر لگانا یا جلسوں کا اہتمام کرنا اور پاکستان کے عوام کو خبردار کرنا جرم نہیں ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ''ہلچل'' کے پہلے صفحے کو دیکھ کر بغاوت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔''

عدالت کے سوال پر کہ کیا اسلام اور سوشلزم ایک دوسرے سے متضاد ہیں؟ مولانا امروٹی نے کہا کہ ''یہ دونوں معاشی و اقتصادی نظام ہیں۔ اسلام مذہب کے ساتھ ساتھ ایک اقتصادی نظام بھی ہے لیکن سوشلزم اسلام کا درس نہیں دیتا۔''

ذوالفقار علی بھٹو کے ابتدائی ایام کے ساتھی اور بعد ازاں پیپلز پارٹی سے اپنی راہیں جدا کرنے والے انقلابی رہنما معراج محمد خان، جن کا انتقال ہو چکا ہے، نے جام ساقی اور ان کے ساتھیوں کا دفاع کرتے ہوئے کہا:

''میں جام ساقی کو عظیم محب وطن سمجھتا ہوں جو عوام کے حقوق اور جمہوریت کے لیے لڑتا رہا ہے۔ جام ساقی نظریۂ پاکستان کی اس توجیح کے خلاف ہے جو مخصوص مفادات رکھنے والے لوگ کرتے ہیں۔ قائداعظم نے نظریۂ پاکستان کی کوئی تشریح نہیں کی تھی۔ جام ساقی نے قومی خوداختیاری کے لیے کام کیا ہے اور یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ میری رائے میں قومی خوداختیاری نہ دینے سے پاکستان کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا۔

میں فوجی عدالتوں کو غیر قانونی سمجھتا ہوں۔ کمیونسٹ لٹریچر پر پاکستان میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ تمام حکومتی اداروں بمعہ فوج پر تنقید کرنا جرم نہیں ہے۔ میں ایران کے انقلاب پر سرخ پرچم کی تحریر سے اتفاق کرتا ہوں۔''

ایک اور انقلابی رہنما فتحیاب علی خان نے نظریۂ پاکستان کو ایک مبہم اصطلاح قرار دیتے ہوئے کہا کہ جام ساقی ہی نہیں، پورا پاکستان مارشل لاء کے خلاف ہے۔

''میں مزدور کسان پارٹی کا صدر ہوں جو ایم آر ڈی میں شامل ہے۔ نظریۂ پاکستان ایک مبہم اصطلاح ہے جس کے کوئی قانونی معنی نہیں ہیں۔ نظریہ جغرافیائی حدود کا پابند ہوتا ہے اگر ایسا ہوتا تو پاکستان تقسیم ہونے کے بعد نظریہ مشرقی پاکستان اور نظریہ مغربی پاکستان پیدا ہو گئے ہوتے۔ پاکستان کی بنیاد لاہور قرارداد ۱۹۴۰ء اور دہلی قرارداد ۱۹۴۶ء تھی۔ مسلح افواج ریاست اور آئین کے تحت تشکیل پاتی ہیں۔ اس لیے جام ساقی نے ان کے اقدام پر تنقید کر کے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں نے اور متعدد دوسرے لوگوں نے اس پر تنقید کی ہے۔ صرف جام ساقی ہی نہیں بلکہ پورا پاکستان مارشل لاء حکمرانوں کے خلاف ہے۔''

ممتاز صحافی اور روزنامہ ''امن'' کراچی کے ایڈیٹر جناب افضل صدیقی نے بتایا:

''سائکلو سٹائل مشین رکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے اور نہ سرکاری اجازت کی ضرورت ہے۔ کسی مواد کو پمفلٹ کتاب کی شکل میں چھاپنے کے لیے بھی سرکاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے میں UNO کے چارٹر آف ہیومن رائٹس سے متفق ہوں اور حکومت پاکستان نے بھی اس چارٹر پر دستخط کیے ہیں۔ موجودہ حکومت عوام کو بنیادی حقوق نہیں دے رہی ہے اور اس نے ۱۹۷۳ء کا آئین معطل کیا ہوا ہے۔ کوڑوں کی سزا غیر اسلامی ہے کیوں کہ اسلامی قانون نافذ نہیں ہے۔ کسی ملک کی ہڑتال کے بارے میں خبر شائع کرنا غیر قانونی نہیں ہے۔ ڈان ۲۵ جنوری ۸۳ء میں شائع ہونے والی خبر کا عندیہ یہ ہے کہ پاکستان کو ایف سولہ کی ٹیکنالوجی اس لیے مل رہی ہے کہ امریکہ، پاکستان کو اسرائیل اور مصر، لیبیا حلیف سمجھتا ہے۔ قائد اعظم نے نظریہ پاکستان کا تذکرہ نہیں کیا، اسی لیے ہر سیاسی پارٹی نظریہ پاکستان کی اپنی اپنی تعریف گھڑ رہی ہے۔ کیمونسٹ پارٹی نے ((E) 7-5 Ex) لوگوں سے حاکم ہونے کے لیے تیار رہنے کی اپیل کی ہے۔ اس طرح کے خیالات جنگ ۱۳ جنوری ۸۳ء میں بھی موجود ہیں۔ جنگ کے اسی شمارہ میں یوسف ہارون کا یہ بیان موجود ہے کہ موجودہ حکومت ایماندارانہ انتخابات نہیں کرائے گی۔ پارٹی کے پرچہ میں بھی یہ بات کہی گئی ہے۔

جام ساقی اور ان کے نظریات کا دفاع کرتے ہوئے جناب افضل صدیقی نے کہا:

''مارشل لاء سے میری مرادفوجی قانون ہے۔ پاکستان کی آئینی حکومت کا تختہ الٹ کر مارشل لاء نافذ ہوا ہے۔ میں ''سرخ پرچم'' کے صفحہ چار کے بیان سے متفق ہوں جس میں جنرل ضیا کو حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے غاصب کہا گیا ہے اور میں موجودہ مارشل لاء کو غاصب سمجھتا ہوں۔ کیمونسٹ پارٹی پر پچھلی حکومتوں نے پابندی لگائی تھی کیمونسٹ لٹریچر پر کوئی پابندی نہیں ہے۔''

ایک اور ممتاز صحافی منہاج برنا کی رائے میں مارشل لاء پر تنقید کو روسی یا افغان نقطہ نظر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

''میں گزشتہ تیس سال سے صحافی ہوں اور متعدد اخباروں سے وابستہ رہا ہوں اور اس وقت APNEC کا چیئرمین ہوں پریس، رائے عامہ کی تنظیم ہے اور ریاست کا چوتھا ستون کہلاتی ہے۔ موجودہ مارشل لاء کا ۱۹۷۳ء کے آئین سے کوئی جواز نہیں ہے اسلام میں مارشل لاء کا کوئی تصور نہیں ہے۔ نہ اسلامی تاریخ میں اس کا تذکرہ ہے۔ نظریہ پاکستان کی کوئی قانونی یا عدالتی توجیح نہیں ہے۔ پریس آرڈیننس کی تمام سیاسی پارٹیوں نے مذمت کی ہے۔ کتاب شائع کرنے کے لیے کسی سرکاری اجازت نامے کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈیکلریشن صرف پرنٹنگ مشین رکھنے اور اخبارات شائع کرنے کے لیے چاہیے۔ ایران کے انقلاب کے بارے میں جو ''سرخ پرچم'' میں لکھا گیا ہے، میں اس سے متفق ہوں۔ پاکستان کے عوام نے انقلاب ایران کا خیر مقدم کیا ہے۔ تمام سیاسی پارٹیاں پاکستان پر امریکی اثرات کے خلاف ہیں اور یہ کہنا کوئی جرم نہیں ہے۔ میں مارشل لاء پر تنقید کو روسی یا افغانی نقطہ نظر نہیں سمجھتا۔ موجودہ حکمرانوں کے لیے غاصب کا لفظ استعمال کرنا غلط نہیں ہے کیوں کہ وہ عوام کے منتخب نہیں ہیں۔''

انجمن جمہوریت پسند خواتین کی مرکزی صدر طاہرہ مظہر علی نے اس بات پر فخر کا اظہار کیا کہ جام ساقی نے انہیں اپنے مقدمہ میں گواہ کے طور پر بلایا۔

''میں اس کی بے حد عزت کرتی ہوں۔ اسیری کے دوران اس کی بیوی اور بچہ مر گئے لیکن جام ساقی ثابت قدم رہا۔ یہی چیزیں انسان کو متاثر کرتی ہیں۔ کام کی امنگ اور حوصلہ، کاروں اور قالینوں سے نہیں بلکہ ایسے ہی لوگوں سے ملتا ہے۔''

سندھی روزنامہ ''عبرت'' کے غنی درس اور روزنامہ ''حریت'' کے میگزین ایڈیٹر نے جام

ساتی مقدمہ کے ایک رکن سہیل سانگی کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ ''تمام باضمیر صحافی ہمیشہ سچ لکھتے ہیں اور ہر ناسور کے خلاف جہاد کرتے ہیں۔ سہیل سانگی ایسی ہی صحافت پر یقین رکھتے ہیں بزرگ خدائی خدمتگار رہنما اور عظیم پشتون سیاستدان باچا خان اور ممتاز حریت پسند شاعر فیض احمد فیض کو بھی گواہی کے لیے بلایا گیا تھا لیکن باچا خان علالت کے باعث اور فیض احمد فیض بیروت میں جلاوطنی کے باعث عدالت میں نہ آسکے۔''

۱۹۸۳ء میں صفائی کی شہادتوں کا سلسلہ تمام ہوا تو جام ساقی خصوصی فوجی عدالت حیدر آباد کی طرف سے دی گئی دس سال کی قید بامشقت کاٹ رہے تھے۔ یہ سال تحریکِ بحالی جمہوریت (ایم آر ڈی) کا سال بھی تھا۔ اس تحریک کے دوران جام ساقی کی جیل میں کی گئی تقاریر پر مشتمل کیسٹس سندھ کے گاؤں گاؤں، قریہ قریہ، قصبہ قصبہ اور شہر شہر بے انتہا گرم جوشی سے سنی جا رہی تھیں۔

۱۹۸۳ء میں دفاع کے لیے دیئے جانے والے بیانات کا سلسلہ تمام ہوا۔ ۱۹۸۴ء میں مقدمہ اپنے آخری مراحل میں داخل ہو گیا تھا۔ پروفیسر جمال نقوی پہلے ہی ہسپتال میں تھے۔ سہیل سانگی کی بگڑتی ہوئی صحت کے باعث انہیں جیل سے ہسپتال منتقل کرنے کے مطالبے کیے جا رہے تھے لیکن فوجی حکومت سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اسی طرح کا مطالبہ بدر ابڑو کے لیے بھی کیا جا رہا تھا۔ ۲۸ جولائی ۱۹۸۴ء کو خصوصی فوجی عدالت سے جام ساقی کیس کے تمام ملزم بری کر دیئے گئے۔ تاہم یہ افراد رِہا نہ ہو سکے کیوں کہ وہ ایک خصوصی حکم کے تحت تین ماہ کے لیے نظر بند تھے۔ جام ساقی اور شبیر شر پہلے ہی ایک مقدمے میں سزا کاٹ رہے تھے۔ کمیونسٹ رہنما جام ساقی، نذیر عباسی شہید، شبیر شر، بدر ابڑو، کمال وارثی، سہیل سانگی، امر لال، پروفسر جمال نقوی اور جبار خٹک کے خلاف تخریبی سرگرمیوں میں ملوث ہونے، قابل اعتراض مواد شائع کرنے، مسلح افواج کے خلاف بغاوت اور مختلف طبقوں میں نفرت پھیلانے کے الزامات میں مقدمہ قائم کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں نارتھ ناظم آباد پولیس نے ایک سازش پکڑی تھی جس میں ملوث جام ساقی، شبیر شر، بدر ابڑو، کمال وارثی، سہیل سانگی، امر لال کو گرفتار کیا گیا۔ اسی الزام میں پولیس نے، نذیر عباسی کو بھی گرفتار کیا تھا جو دوران حراست شہید ہو گئے۔ مقدمہ کی سماعت خصوصی فوجی عدالت نے کی جو تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہی۔ کرنل عتیق، کیپٹن افتخار جلیس اور مجسٹریٹ حبیب اللہ بھٹو پر مشتمل خصوصی فوجی عدالت نے

سماعت مکمل کر کے فیصلہ محفوظ کر لیا تھا۔ پروفیسر جمال نقوی اور جبار خٹک کے خلاف خصوصی فوجی عدالت نے مقدمے کی سماعت الگ کر دی تھی۔ پروفیسر جمال نقوی ایک عرصہ سے علیل تھے جب کہ جبار خٹک کو گرفتاری سے قبل مفرور قرار دے دیا گیا تھا۔ ملزمان گرفتاری سے اب تک جیل میں تھے۔ مقدمہ کا فیصلہ خصوصی فوجی عدالت نے اس ماہ کے دوسرے ہفتے میں سنایا۔ خصوصی فوجی عدالت نے جام ساقی سمیت تمام ملزموں کو بری کر دیا۔ تاہم بری ہونے والے افراد کو تین تین ماہ کے لیے کراچی جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ جام ساقی سکھر جیل میں تھے وہ اور شبیر شر ایک اور مقدمے میں سزا کاٹ رہے تھے۔ بدر ابڑو گزشتہ کئی ماہ سے شدید علیل اور مقامی ہسپتال میں داخل تھے۔

۱۹۸۴ء کے وسط میں جام ساقی نے سینٹرل جیل سکھر سے سندھی عوام کے نام ایک طویل پیغام بھیجا۔ یہ کیسٹ بھی گاؤں گاؤں، شہر شہر پہنچی۔ جام کے سندھی الفاظ کا وہ جذبہ، وہ تڑپ آپ کو اردو ترجمے میں نہیں ملے گی۔ اس پیغام کے چند اقتباسات سے آپ کو اس بات کا ضرور اندازہ ہو جائے گا کہ سندھ اور سندھی عوام سے جام ساقی کا وحدت الوجودی رشتہ تھا۔ پیغام شاہ لطیف کے اشعار سے شروع اور شاہ کے شعر پر ہی ختم ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے لوگوں کو اسطرح مخاطب کیا۔

''میرے محبوب ہم وطنو، نوجوانو، ساتھیو، دوستو، بھائیو، بہنو، مزدورو، کسانو اور دانشورو!

اس سے پیشتر بھی ایک طویل عرصے تک ہمیں جدا رہنا پڑا ہے۔ مگر اس عرصے کے دوران بھی، کبھی کسی دوست کی معرفت پیغام کی صورت میں، کبھی کسی خط کے توسط اور کبھی کسی بیان کے ذریعے آپ تک میری بات ضرور پہنچتی رہی ہے۔ مگر اب اس لحاظ سے میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میری آواز کیسٹ میں ریکارڈ ہو کر میرے ہم وطنوں کی محفل تک پہنچ رہی ہے۔ ساتھیو! اس بار ہمارے وطن میں جو اتنی عظیم تحریک چلی ہے، جس میں ہم نے اتنی ساری قربانیاں دی ہیں، اس نے ہمیں کچھ سبق بھی سکھائے ہیں۔ میں نے کھولیوں میں بیٹھ کر اس تحریک کا جائزہ لیا ہے اور اس جائزے نے مجھے یہ دکھایا ہے کہ ہمیں اس جدوجہد سے آئندہ پروگرام بناتے وقت کچھ باتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں۔

ساتھیو! ہمارے ملک کی فوج، پاکستان کی فوج دنیا کے ۲۲ ممالک میں امریکہ کے نمائندہ

کے طور پر موجود ہے۔ ۲۲ ممالک میں تیل کے کنوؤں اور بادشاہوں کے محلوں پر پہرہ دے رہی ہے۔ امریکہ اس حیثیت میں نہیں کہ وہ براہِ راست اپنی فوج وہاں رکھ سکے۔ اس لیے وہ پاکستانی فوج کو وہاں استعمال کر رہا ہے۔ لہٰذا امریکہ کو اگر کبھی بھی ہم پاکستان کے آٹھ کروڑ لوگوں اور اس کی چھے لاکھ فوج میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑا تو وہ اس فوج کا انتخاب کرے گا۔ امریکہ آٹھ کروڑ انسانوں کو ذبح کرنے یا کرانے پر تیار ہو جائے گا مگر وہ اس فوج کو کوئی گزند پہنچانے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ اس لیے اگر ہم کسی کو بھی اس غلط فہمی میں مبتلا دیکھیں کہ امریکہ کبھی بھی جمہوریت بحال کرانے میں دلچسپی لے سکتا ہے تو ہمیں اس کی یہ غلط فہمی دور کرنا چاہیے، کیوں کہ ہمارے ملک میں جمہوری جدوجہد کے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ وہ سامراج دشمن ہو اور ملک سے امریکہ کی جڑیں اکھاڑ پھینکنے کے لیے ہو۔

میرے ہم وطنو! ساری دنیا کی جمہوری جدوجہد پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ جو جمہوریت یا صرف جمہوری آزادیوں کی جدوجہد ہوتی ہے اس میں بھی زیادہ تر تھوڑے بہت فرق کے ساتھ لوگ اتنی ہی قربانیاں دیتے ہیں جتنی ہمارے لوگوں نے دی ہیں۔ اس سے زیادہ صرف جمہوریت کے لیے قربانیاں نہیں ہوتیں۔ کیوں کہ اس سے زیادہ شدید جدوجہد کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے پروگرام کو مزید وسیع کریں۔ معاشی پروگرام بھی اس میں شامل کریں۔ معاشی و اقتصادی پروگرام کے علاوہ اس سے زیادہ سخت جدوجہد، اس سے زیادہ قربانیوں والی جدوجہد دنیا میں کہیں بھی نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے ملک کی ہر جماعت کو عموماً اور ملک کی بائیں بازو کی ہر جماعت کو خصوصاً ہمیں اس بات پر مجبور کرنا چاہیے کہ وہ اپنے پروگرام میں واضح طور پر معاشی مسائل اٹھائیں۔

علاوہ ازیں اس جدوجہد نے ہمیں یہ بھی دکھایا ہے کہ قومی مسئلہ پہلے کی نسبت زیادہ ابھر کر سامنے آیا ہے۔ قومی حقوق کا مسئلہ پاکستان کی تاریخ میں اہم ترین مسئلہ رہا ہے۔ اس مسئلہ کی وجہ سے کبھی آئین کے بننے میں رکاوٹیں رہی ہیں۔ تو کبھی سندھ کے دلاروں، بلوچستان کے بہادروں، پشتونستان کے جیالوں اور بنگال کے حق پرست عوام کو مسلسل جدوجہد کرنی پڑی ہے۔ ہمارے ملک میں صوبے ایسے نہیں جیسے عام طور پر دنیا کے مختلف ممالک میں ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں صوبے انتظامی حلقوں کی طرح نہیں ہیں۔ ان کا وجود قومی اور ثقافتی بنیادوں پر ہے اور پاکستان ہمارے ان

صوبوں نے بنایا ہے نہ کہ پاکستان پہلے وجود میں آیا ہے اور اس نے ان صوبوں کو جنم دیا ہے۔ یہ صوبے پہلے سے تھے بلکہ ازل سے تھے اور انہوں نے مل کر یہ بندوبست کیا کہ ایک ملک بنائیں۔ اس لیے یہ طے کرنے کی ضرورت نہیں کہ مرکز ہمیں کتنے اختیارات دیتا ہے بلکہ اصول کی بنیاد پر یہ بات طے کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ چاروں صوبے اور چاروں قومیں مل بیٹھ کر مرکز یا مشترکہ بندوبست کو کتنے اختیارات دینے کو تیار ہیں؟ قومی مسئلہ اتنا ابھر کر سامنے آیا ہے کہ اب ایم آر ڈی کو بھی تسلیم کرنا پڑا ہے اور ہر تنظیم کو یہ سوال کسی نہ کسی صورت میں اپنے پلیٹ فارم سے اٹھانا پڑا ہے۔

ساتھیو! یہ بات ایک لحاظ سے اپنی سچائی ثابت کرتی ہے اور مجھے خوشی ہوتی ہے کہ جب ۱۹۷۳ء کا آئین بنا تو ہم تھوڑے لوگ تھے اور کمیونسٹ پارٹی ہی تھی، جس پر اپنی تقاریر پر اپنے بیانات اور کبھی سنگت رسالے کے ذریعے کہا کہ بابا اس آئین میں جتنی خودمختاری دی گئی ہے، وہ کافی نہیں، اس سے کام نہیں چلے گا۔ نیز یہ بھی گزارش کی کہ کالے قوانین اس آئین سے نکال دیئے جائیں، نہیں تو آگے چل کر ہمیں سب کو ان کا شکار ہونا پڑے گا۔ وقت نے یہ بات ثابت کی کہ ہم نے ٹھیک کہا تھا۔ اس سے قبل خاص طور پر ۱۹۶۷ء سے میں ذاتی اعتبار سے اس جدوجہد میں شریک رہا ہوں۔ ہم نے کبھی طلباء کے پلیٹ فارم سے ''۴ مارچ'' کے نام پر تحریک چلائی، جس میں ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ سندھی زبان کو قومی زبان تسلیم کیا جائے، ون یونٹ توڑا جائے اور سندھی زرعی زمینیں، جو فوجی افسروں کو الاٹ ہو رہی ہیں وہ ان سے واپس لی جائیں۔ ہم یہ تحریک کبھی نعرے لگا کر اور لاٹھیاں سہہ کر چلاتے تھے تو کبھی ہم اس کے لیے پمفلٹ اور پوسٹر چھاپتے تھے جس کے نتیجے میں ہم پر ''بغاوت کیس'' قائم کیا گیا اور کبھی شاہ لطیف بھٹائی کے میلے میں جا کر پمفلٹ یا بیج تقسیم کرتے اور جلسے جلوس منعقد کرتے تھے، جن میں یہی تین اہم مطالبات ہوتے تھے۔ ہم اس جدوجہد کو جاری رکھتے آئے ہیں اور اب آہستہ آہستہ یہ مطالبات دوسری تنظیموں نے بھی قبول کرنا شروع کیے ہیں۔ یہ بہت ہی مثبت بات ہے کہ ایم آر ڈی میں شریک تمام جماعتوں نے کم از کم اس ضرورت کو محسوس کیا ہے کہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں دی گئی صوبائی خودمختاری سے کام نہیں چلے گا۔ انہوں نے اب اس سوال پر نئے سرے سے بات کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب اگر کوئی بھی تحریک چلی اور اس میں قومی مسئلہ نہیں اٹھایا گیا تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔''

اپنے طویل پیغام میں جام نے معاشی مسئلہ اٹھانے کی اشد ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے ماروی اور نذیر عباسی شہید کی مثالیں دہرائیں۔ بھٹو شہید کی بات کی۔ سیاسی بیداری کی وضاحت کی۔ جاگیرداری اور وڈیرا شاہی کو کوسا۔ منظم فوجی قوت کی بات کی۔ یہ سوال اٹھایا کہ ہم عام لوگ ریاستی اداروں کا مقابلہ کیوں نہیں کر سکتے۔ جام نے قربانیوں کی بات کی، سائنسی حقائق پر اصرار کرتے ہوئے جانیں قربان کرنے کی بات کی۔

جام ساقی نے کہا:

''نوجوان دوستو! آپ جب جغرافیہ کی کتاب اٹھا کر یہ جملہ پڑھتے ہیں کہ یہ زمین گول ہے اور سورج کے گرد گھومتی ہے تو آپ کو مشکل سے احساس ہوتا ہوگا کہ یہ جملہ آپ تک پہنچانے کے لیے کسی آدمی نے آگ میں جل کر اپنی جان دی ہوگی۔ برونو نے جس وقت یہ کہا کہ سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، تب پادریوں نے مل کر اسے آگ میں زندہ جلانے کی سزا دی تھی۔ آگ میں جلانے سے قبل اسے کہا گیا کہ اگر وہ اب بھی یہ کہنے کے لیے تیار ہو کہ زمین سورج کے گرد نہیں بلکہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے تو اسے زندہ چھوڑ دیا جائے گا۔ مگر اس نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور اس کے نتیجے میں اسے آگ میں جلا دیا گیا۔

آپ تک جو کتابیں پہنچتی ہیں یا آپ جو کتابیں پڑھتے ہیں۔ ان کے ایک ایک حرف کے پیچھے نہ جانے کتنے لوگوں کی قربانیاں ہوں گی، کتنے لوگوں کی محنتیں ہوں گی، کتنے لوگوں کی بے خوابی ہوگی؟ آپ علم کو اس طرح پڑھیں تو شاید آپ کبھی بھی نہ بھول سکیں اور شاید اسے بہتر طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔''

جام ساقی نے مزدور ساتھیوں کو انقلاب کا امام کہا۔ انہوں نے ملیر کے لوگوں کی بات کی، انہوں نے دھرتی کے باسیوں کو نئے سندھ کے بیدار ہونے کی نوید سنائی۔ جام نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا:

''یہ سامراجی دلال اور کرائے کے قاتل جنرل، چاہے کتنی بھی کوشش کریں، ہمیں کتنا بھی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں رکھیں اور ظلم و اذیتوں کے جو بھی طریقے اختیار کریں، ہمیں اور آپ کو ذہنی و جذباتی طور پر اور جدوجہد کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ یہ بات

انہوں نے اس سے قبل بھی آزما کر دیکھی ہے۔ اس کا جواز بھی ہے کیوں کہ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ کبھی سگے بھائی بھی آپس میں لڑ جھگڑ پڑتے ہیں کہ دولت میں حصہ کم یا زیادہ ملا ہے مگر ہمارا اور آپ کا اس دولت کے کسی حصہ کا رشتہ نہیں۔ ہمارے اور آپ کے درمیان ملک کے تمام لوگوں اور وطن کے درد کو محسوس کرنے کا ایک اٹوٹ اور عظیم رشتہ ہے جو ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس لیے دوستو! ساتھیو، مزدورو، کسانوں، بہنو، بھائیو، نوجوانو، اور دانشورو ہم اور آپ ساتھ ہیں اور ساتھ رہیں گے۔''

۱۹۸۴ء میں جام ساقی نے سکھر جیل میں مقید سینکڑوں سیاسی کارکنوں، طالب علموں اور دیگر قیدیوں کے سامنے ایک اور تقریر کی جو قومی حقوق کے مسئلے پر کمیونسٹ نقطۂ نظر کا اظہار کرتی تھی۔ یہ تقریر بھی سندھ کے کونے کونے میں پہنچی جس کے کچھ نکات ہم یہاں اجاگر کر رہے ہیں۔

- اکثر معاملات پر ملک میں اتفاق رائے موجود ہے لیکن قومی مسئلے پر ابھی بہت تجزیے اور بحث و مباحثے کی ضرورت ہے۔ پاکستان بننے سے لے کر اب تک قومی حقوق کا مسئلہ ہی زبردست کشمکش اور آئین کے بننے میں رکاوٹ کا باعث رہا ہے۔
- طلباء میں ''سندھی زبان، قومی زبان'' اور ''ون یونٹ توڑیں گے'' کے نعرے نیپ کے نعرے یا ''کامریڈوں کے نعرے'' سمجھے جاتے تھے اور ہمارے آج کے کچھ نام نہاد رہنما ان نعروں کی یہ کہہ کر مخالفت کرتے تھے کہ یہ سیاسی نعرے ہیں یا نیپ کے نعرے ہیں۔ یہ نعرے ہم سے اس قدر وابستہ سمجھے جاتے تھے کہ جب شوکت سندھی نے بھٹو صاحب کو ون یونٹ توڑنے کے مسئلے کو اٹھانے کے لیے یاد دلایا تو ان سے کہا ''سائیں بھٹو صاحب! وہ جام ساقی والوں کا مسئلہ بھی اٹھائیں۔''
- مجھے فخر ہے کہ بطور فرد میں پہلا آدمی تھا۔ جس نے بنگال کے عوام کے قتل عام کے خلاف آواز اٹھائی اور بطور جماعت کمیونسٹ پارٹی وہ واحد جماعت تھی جس نے اس قتل عام کی مخالفت کی تھی۔ اس کے خلاف جلسے کیے، پمفلٹ شائع کیے اور بیانات دیئے۔ فوجی ٹولہ اور اس کے پٹھو ابھی تک پارٹی سے اور مجھ سے وہی دشمنی جاری رکھے ہوئے ہیں دیگر تمام سیاسی جماعتیں اور بڑے بڑے ''انقلابی اس وقت گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے تھے۔

- کمیونسٹ پارٹی ہی وہ واحد پارٹی ہے۔جس نے ۱۹۷۳ء کے آئین میں ناکافی صوبائی خود مختاری، ہنگامی حالتوں اور کالے قوانین پر اعتراض کیا تھا۔تاریخ نے اس کے مؤقف کو درست ثابت کر دیا ہے۔
- دنیا کی ہر کمیونسٹ پارٹی کی طرح ہماری کمیونسٹ پارٹی بھی قومی حقِ خود ارادیت کی حامی ہے یعنی کسی بھی کثیر القومی ملک میں اگر کوئی قوم ملک سے الگ ہونا چاہتی ہے تو اس قوم کو الگ ہونے کا حق ہونا چاہیے۔
- پلیجو نے ہمارے متعلق یہ کہنا شروع کیا،''کامریڈ سندھ کو کراچی کے حوالے کرنا چاہتے ہیں،اسی لیے یہ مؤقف اختیار کیے ہوئے ہیں۔کہ کراچی سندھ کا حصہ ہے۔''
- ہم کمیونسٹ، جو قومی حق خود ارادیت کے حامی ہیں اور اس کے لیے لڑتے ہیں قومی حق خود ارادیت تو بہت دور کی بات ہے، چھوٹے سے چھوٹا قومی حق لینے کے لیے اپنی جان دینا فخر کی بات سمجھتے ہیں،ہم علیحدگی کے وکیل نہیں ہیں۔
- ہمارے ملک اور دوسری جگہوں پر یہ رجحان کہ ہماری قوم دوسری قوموں سے برتر ہے، بنیادی طور پر فاشزم کا رجحان ہے۔دنیا کی کوئی بھی قوم نہ کسی دوسری قوم سے برتر ہے اور نہ ہی کوئی دوسری قوم اس سے برتر ہے۔
- اگر ہمیں قومی حقوق لینے ہیں تو مظلوم قوموں اور طبقات کے ساتھ اپنا اتحاد مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ سامراج دشمنی بھی لازماً اپنانا ہوگی۔
- یہاں جو بھی بائیں بازو کا گروپ ہے، وہ بلاواسطہ یا بالواسطہ کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی وقت کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ رہا ہے۔اس لیے اپنے الگ ہونے کے جواز کے طور پر لوگ اپنی بات پارٹی کی مخالفت سے شروع کرتے ہیں۔

۱۶ جنوری ۱۹۸۵ء کو خصوصی فوجی عدالت نے مشہور جام ساقی کیس کا فیصلہ سنا دیا۔ عدالت کے فیصلے کے مطابق مقدمہ میں ملوث ۲ ملزمان مزدور رہنما کمال وارثی، فنکار شبیر شر کو ۷، ۷ سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی اور ۳ ملزمان امر لال، صحافی سہیل سانگی اور ممتاز ادیب شاعر بدر ابڑو کو بری کر دیا گیا۔جبکہ عدالت نے جام ساقی کے خلاف فیصلہ محفوظ رکھا۔عدالت نے جام

ساقی کے بارے میں فیصلہ حیدر آباد جیل میں جہاں وہ نظر بند تھے، سنانا تھا۔ جام ساقی اور ان کے دیگر ساتھیوں کو بغاوت کی سازش، تخریب کاری، فوج کے خلاف نفرت، صوبائی عصبیت پھیلانے کے الزام میں پولیس نے جولائی ۱۹۸۰ء میں گرفتار کیا تھا جبکہ ۲ ملزمان امام علی نازش اور نریش کمار گرفتار نہیں ہو سکے تھے۔

پروفیسر جمال نقوی کی رہائی کے لیے پُرزور مطالبے کیے جا رہے تھے۔ خاندان کے ذرائع کے مطابق جناح ہسپتال میں ان سے ملاقات پر سختیاں بڑھا دی گئی تھیں۔ دورانِ حراست وہ فالج سمیت کئی بیماریوں کا شکار ہوئے۔ مئی اور جون ۱۹۸۵ء کے دوران ان کی رہائی کے لیے متعدد بار مطالبے کیے گئے۔ ستمبر ۱۹۸۵ء میں انہیں ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ضمیر کا قیدی قرار دیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ سوویت باغی سائنسدان اندرئی سخاروف کو ان کے ساتھ ہی ضمیر کا قیدی قرار دیا گیا تھا۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۸۵ء کو اہل خانہ کی غیر حاضری میں نامعلوم افراد نے بلاک ایل، نارتھ ناظم آباد میں واقع ان کے گھر کی تلاشی لی۔ ۴ جنوری کو پروفیسر جمال نقوی اور جبار خٹک کے مقدمے سول عدالت میں منتقل کر دیئے گئے۔ ۷ جنوری کو دونوں نے سندھ ہائی کورٹ میں اپنی نظر بندی کو چیلنج کر دیا۔ ۱۵ مارچ ۱۹۸۶ء کو دونوں حضرات رِہا کر دیئے گئے۔ وہ ۲۹ جولائی ۱۹۸۰ء کو گرفتار ہوئے تھے۔ پروفیسر جمال نقوی نے رہائی کے فوراً بعد نذیر عباسی شہید کے مزار پر حاضری دی اور اقلیتوں کے ایک وفد سے ملاقات کی۔

جام ساقی ایک طویل عرصہ سے قیدِ تنہائی کی اذیت کا شکار تھے۔ کچھ مدت سے ان کی رہائی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ ۴ مئی ۱۹۸۶ء کو محترمہ بےنظیر بھٹو نے انقلابی رہنما جام ساقی کی بگڑتی ہوئی صحت پر گہری تشویش کا اظہار کیا اور حکام کے رویے کی مذمت کی۔ انہوں نے کہا کہ انہیں جام ساقی کی صحت کے بارے میں گہری تشویش ہے، جو گزشتہ آٹھ برس سے قید ہیں، اس وقت جام ساقی جناح ہسپتال، کراچی میں تھے۔ انہیں اوائل ۱۹۸۵ء میں حیدر آباد جیل سے جناح ہسپتال کراچی منتقل کیا گیا تھا۔ ۹ دسمبر ۱۹۸۶ء کو انہیں جناح ہسپتال کراچی سے رِہا کر دیا گیا۔

باب 6

جام ساقی اور ڈی ایس ایف پمفلٹ کیس

جام ساقی نے سیاست کا آغاز طلباء جدوجہد سے کیا تھا۔ اس حوالے سے ان کی طلباء سیاست سے وابستگی کی تفصیلات ہم گذشتہ کسی باب میں کر چکے ہیں۔ لیکن پمفلٹ کیس کی بات کرنے سے پہلے خود ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن (ڈی ایس ایف) کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جب اپریل ۱۹۴۸ء میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان وجود میں آئی تو اسے مختلف عوامی محاذوں کی ضرورت محسوس ہوئی مثلاً کسان مزدور، خواتین، طلباء محاذ وغیرہ۔ یہ پارٹی کے سیاسی کام کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری تھا۔ پارٹی نے پہلے ڈیموکریٹک یوتھ لیگ قائم کی۔ پارٹی کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ پاکستان میں طلباء سیاست کو آگے بڑھانے کے لیے لیگ مفید ثابت نہیں ہو گی۔ چنانچہ طلباء کی خالص تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ راولپنڈی کے کرنل لطیف افغانی، جو جنگ آزادی میں شریک رہے تھے، نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور طلباء کا ایک کمیونسٹ فرنٹ منظم کرنے کے کام میں جُت گئے۔ گورڈن کالج راولپنڈی کے پروفیسر خواجہ مسعود نے اس سلسلے میں لطیف افغانی کی مدد کی۔ تنظیم کو لاہور میں قائم کرنے کا فیصلہ ہوا اور لطیف افغانی، لاہور منتقل ہو گئے۔ وہاں انہوں نے گورنمنٹ کالج کے لیکچرر کی مدد سے تنظیم کا ڈھانچا کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ البتہ خود شوکت منٹو پس منظر میں رہے۔ لاہور کے مختلف کالجوں کے طلباء نے ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن (ڈی ایس ایف) کے نام سے اپنی تنظیم قائم کر لی۔ اس وقت طلباء کی صرف ایک تنظیم حکمران جماعت سے مسلم

سٹوڈنٹس فیڈریشن کام کر رہی تھی۔ ڈی ایس ایف کے اولین عہدیداروں میں لطیف افغانی صدر، مظفر علی نقوی، ایف سی کالج، درجہ چہارم، سیکریٹری بشیر ظفر، ایم اے او کالج درجہء چہارم، کنو ینر، منظر حسین مرزا، میڈیکل کالج لاہور درجہ چہارم اسسٹنٹ کنو ینز اور منصور ملک دیال سنگھ کالج، درجہ چہارم آفس سیکریٹری مقرر ہوئے۔

بانی ارکان میں نعیم اشرف ملک (سابق طالب علم) فضل الرحمان (میڈیکل کالج)، تلاوت شاہ بخاری (سابق طالب علم) محمد لطیف رشی (میڈیکل کالج) انوار العظیم (ایم اے او کالج)، اشرف طاہر (دیال سنگھ کالج) اور امیر احمد (دیال سنگھ کالج) شامل تھے۔ چار ارکان منصور ملک، اختر حسن (دیال سنگھ کالج) فضل الرحمان اور پروفیسر شوکت منٹو پر مشتمل ایک سیل بنایا گیا۔ سی آئی ڈی کی رپورٹوں کے مطابق کمیونسٹ پارٹی کی طرز پر زبردست کام کیا گیا۔ مارچ ۱۹۵۰ء میں لاہور میں شاہ ایران کی آمد کے موقع پر شاہ کے خلاف زبردست مظاہرہ ہوا اور بقول سی آئی ڈی اشتعال انگیز ہینڈ بل تقسیم کیے گئے جن میں شاہ کو امریکی سامراج کا کاسہ لیس اور لبرل قوتوں کا دشمن قرار دیا گیا۔ طے ہوا کہ یہ پوسٹر یونیورسٹی ہال میں تقسیم کیے جائیں جہاں شاہ کو اعزازی ڈگری سے نوازا جانا تھا۔ خفیہ رپورٹ میں بتایا گیا کہ ''ہینڈ بل'' انتہائی اشتعال انگیز تھے اور ان میں حکومتِ پاکستان پر بھی شدید تنقید کی گئی کہ شاہ کی تفریح طبع کے لیے فضول اخراجات کیے گئے تھے۔ پوسٹروں کے عنوانات درج ذیل تھے:

۱۔ امریکی سامراج کا ایجنٹ شاہ ایران

۲۔ شاہ ایران، ایرانی عوام کا دشمن

ظاہر ہے اس کا مقصد حکومت کو رسوا اور شاہ کی نظر میں شرمندہ کرنا تھا۔ حکومت کا رویہ بھی انتہائی مخاصمانہ تھا اور ڈی آئی سی پہلے روز سے ہی لطیف افغانی، نعیم اشرف اور مظفر علی نقوی عرف زبیر نقوی کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ جو ان پوسٹروں کی تیاری اور اشاعت کے ذمہ دار تھے، ان کے گھروں پر چھاپے مار کر تمام پوسٹر اور دیگر مواد قبضے میں کر کے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر بے انتہا تشدد ہوا کہ نعیم اشرف نے معافی مانگ لی چنانچہ اسے چھوڑ دیا گیا۔ مظفر علی نقوی ڈٹ گیا لیکن پھر اس کے والدین کے دباؤ پر اسے بھی لکھ کر دینا پڑا کہ وہ آئندہ سیاست میں حصہ نہیں لے گا۔

اسے بھی رہا کر دیا اور پنجاب یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔لطیف افغانی کے فولادی عزم کو تشدد اور ایذا رسانی کے باوجود دبایا اور جھکایا نہ جا سکا۔

سی آئی ڈی پنجاب کی خفیہ رپورٹ ''کمیونسٹ پارٹی آف ویسٹ پاکستان ان ایکشن'' میں ڈی ایس ایف کی سرگرمیوں کے حوالے سے اور بھی تفصیلات ملتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان پوسٹروں کے لیے کاغذ غنی قریشی نے فراہم کیا تھا جو ''پاکستان ٹائمز'' میں سٹور کیپر کے طور پر کام کرتے رہے تھے اور ان کے مرزا اشفاق بیگ سے قریبی روابط تھے۔ مرزا اشفاق بیگ ٦٦۔جی ماڈل ٹاؤن میں رہائش پذیر تھے۔تحریری مواد سبط حسن کا تھا۔سٹینسل کا کام ایک ٹیکنیکل سیل انجام دیتا تھا جس کے انچارج مرزا اشفاق بیگ تھے۔ سبط حسن اور مرزا اشفاق بیگ دونوں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مرکزی کمیٹی کے رکن بھی تھے۔ مرکز نے کراچی کی آرگنائزنگ کمیٹی کو بھی ہدایات بھیجیں کہ وہ شاہ کے خلاف مظاہرے کا اہتمام کریں اور اس موقع کے لیے پوسٹر شائع کریں۔لیکن کراچی میں کوئی عملی قدم نہ اٹھایا جا سکا۔حکومت نے طاقت سے لاہور کے مظاہرے کو دبا دیا اور کراچی میں ایسا کچھ ہونے نہ دیا۔

حکومت کے جبر و تشدد اور رکاوٹوں کے باوجود ڈی ایس ایف کی سرگرمیوں کو نہ روکا جا سکا۔١٩٥١ء میں سختیوں اور تشدد میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ١٩٥١ء میں نام نہاد راولپنڈی سازش مقدمے کا ڈول ڈالا گیا۔حکومت امریکی سامراج سے دفاعی معاہدوں کی جانب آگے بڑھ رہی تھی اور کمیونسٹ پارٹی، اس کے راستے کی واحد رکاوٹ تھی۔ اسے اور اس کے عوامی محاذوں کو کچلنا ضروری تھا۔ چنانچہ ڈی ایس ایف کی مشکلات میں مزید اضافہ ہو گیا۔تنظیم کو لطیف افغانی اور زبیر صدیقی کی گرفتاریوں سے زبردست دھچکا پہنچا۔اب اس نے طلباء کے مسائل کی بنیاد پر اپنی سیاست کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔١٩٥١ء میں ہی اس یونیورسٹی نے امتحانات کو ملتوی کرنے کے لیے ایک بھرپور مہم چلائی۔ جسے حکومت نے سختی سے کچل دیا۔راولپنڈی سازش کیس کی آڑ میں کمیونسٹوں کی ملک بھر میں گرفتاریوں سے ڈی ایس ایف کی سرگرمیاں مزید سکڑ گئیں۔اسی سال منصور ملک اس کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ پنجاب کے مختلف اضلاع میں ڈی ایس ایف کی شاخیں قائم کرنے کی کوشش کی گئیں۔لیکن سوائے گجرات کے اور کہیں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ گجرات میں کامیابی قربان

طاہر کی کاوشوں کا نتیجہ تھی لیکن جلد ہی قربان طاہر کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

۱۹۵۱ء کے اختتام تک ڈی ایس ایف کے ارکان کی تعداد بہت کم تھی۔ کم ارکان اور حکومت کی مخالفت کے باوجود ڈی ایس ایف ایک مضبوط قوت تھی۔ پاکستان کے سیاسی معاملات کے ساتھ ساتھ ڈی ایس ایف میں موجود طلباء کی ہمدردیاں ایران اور مصر کے عوام کے ساتھ تھیں۔ پاکستانی طلباء نے ان کے حق میں کئی مظاہرے کیے۔ دو مظاہرے ریس کورس روڈ پر برطانوی مشن کے سامنے بھی ہوئے۔ ان مظاہروں میں ڈی ایس ایف کے ساتھ دیگر طلباء تنظیموں نے بھی حصہ لیا۔

علاوہ ازیں تمام طلباء تنظیموں نے مصر اور ایران کے حق میں برطانوی سامراج مخالف متحدہ محاذ تشکیل دیا۔ متحدہ محاذ کے قیام میں میاں افتخار الدین کے صاحبزادے عارف افتخار، جو اس وقت گورنمنٹ کالج کے طالب علم تھے، نے کافی اہم کردار ادا کیا۔

حکومت کی طرف سے اس بات پر زور دیا جانے لگا تھا کہ طلباء کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ حالاں کہ تحریک پاکستان کے دوران طلباء کے سیاسی کردار کو اہمیت دی تھی۔ حکومت سے متصادم ہونے والے طلباء کو تلقین کی جاتی تھی کہ پاکستان بن گیا ہے، اس لیے اب طلباء کے سیاست میں حصہ لینے کا کوئی جواز نہیں رہا۔ جو طلباء اس نصیحت پر عمل سے انکار کرتے، انہیں اوّل تو تشدد کر کے خاموش کرا دیا جاتا یا پھر انہیں خریدنے کی کوشش کی جاتی۔

روزنامہ ''مساوات'' کے سیاسی ایڈیشن مورخہ ۷ استمبر ۱۹۷۶ء کو ''پاکستان کی طالب علم تحریکیں'' کے عنوان سے ایک تفصیلی رپورٹ شائع کی گئی جس میں کراچی میں ڈی ایس ایف کے منظم ہونے اور ۸ جنوری ۱۹۵۳ء کی تحریک کی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ ہم روزنامہ 'مساوات' کے شکریے سے بعض اقتباسات نقل کریں گے، دسمبر ۱۹۵۱ء میں کراچی میں ڈی ایس ایف منظم ہوئی۔ ۱۹۵۲ء تک اس تنظیم میں لڑکیاں بھی شامل ہو چکی تھیں۔ انہوں نے چندہ جمع کرنے اور دیگر سرگرمیوں میں لڑکوں کے شانہ بشانہ کام شروع کر دیا۔ اس وقت مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن غیر موثر ہو چکی تھی اور جماعت اسلامی کی قائم کردہ طلباء تنظیم مذہبی پراپیگنڈے کی حد تک محدود تھی، اس لیے ڈی ایس ایف کے سامنے کھلا میدان تھا۔

عظیم جنوری تحریک

جنوری ۱۹۵۲ء میں حکومت نے ملک میں تعلیم کی ترقی کے چھ سالہ منصوبے کا اعلان کیا جس میں پرائمری تک تعلیم کو مفت اور لازمی قرار دینے اور فیسوں میں پچاس فیصد کمی کرنے کی سفارش کی گئی تھی لیکن حکومت اپنے اعلان کردہ اس پروگرام سے لاپرواہو گئی۔ اس کی وجہ سے ۱۱ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ڈی ایس ایف نے تھیوسوفیکل ہال میں اپنے پہلے کونسل سیشن میں اعلان کیا کہ حکومت کی سرد مہری سے تنگ آ کر اب وہ براہِ راست طلباء کو ان کے مسائل سے آگاہ کرے گی تاکہ طلباء کے مطالبات منوائے جاسکیں۔ اس مقصد کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے تحریک چلائی جائے گی۔ کونسل سیشن میں اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ طلبا میں مذہب کے نام پر کسی تفریق کو گوارا نہیں کیا جائے گا۔ اجلاس میں ان مذہبی طالب علم تنظیموں کی بھی مذمت کی گئی جو مذہب کا سہارا لے کر طالب علموں میں تفرقہ ڈالنے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ کونسل سیشن کے بعد پہلے مرحلے میں طالب علم کارکنوں نے اپنے اپنے کالجوں کی یونینوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ طالب علموں کے مطالبات منوانے کے لیے ڈی ایس ایف کے ساتھ مل کر جدوجہد کریں۔ یہ خاصا مشکل کام تھا لیکن طالب علم کارکنوں نے دن رات ایک کر دیا۔ اس طرح سے ۲۵ نومبر ۱۹۵۲ء کو ڈی ایس ایف اور انٹر کالجیٹ باڈی (کالجوں کی یونینوں کے عہدیداروں پر مشتمل تنظیم) کا اشتراکِ عمل ہوا۔ دونوں تنظیموں نے طلباء سے اپیل کی کہ وہ ۴ دسمبر ۱۹۵۲ء کو یوم مطالبات منائیں۔ اس اپیل کے ساتھ ہی سامراج کی ہمنوا طالب علم تنظیمیں حرکت میں آ گئیں انہوں نے طالب علم اتحاد میں رخنہ ڈالنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی پروردہ حکومت نے ایسی تنظیموں کی سرپرستی کی اور طلباء کی یکجہتی اور اتحاد کو ختم کرنے کے لیے بعض طلباء کو خریدا۔ ان طلباء نے طالب علموں کے مفادات کے خلاف سرگرمی سے کام کیا لیکن انہیں اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ ۴ دسمبر کو طالب علموں نے بھرپور انداز میں یوم مطالبات منایا۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہر کالج میں طالب علموں نے الگ الگ جلسے کیے اور کالج یونینوں کی وساطت سے حکومت تک اپنے مطالبات پہنچائے، طلبا نے مطالبہ کیا کہ ملک میں پرائمری تعلیم مفت کی جائے۔ تکنیکی اور اعلیٰ تعلیم کو سستا کیا جائے۔ فیسوں میں پچاس فی صد کمی کی جائے اور فیسیں ماہانہ وصول کی جائیں۔ (یاد رہے کہ اس وقت چھ ماہ کی

فیسیں اکٹھی لی جاتی تھیں)۔طلباء نے تعلیم کے چھ سالہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے اور روزگار کی ضمانت دینے کا بھی مطالبہ کیا۔۴ دسمبر کے یوم مطالبات میں طلباء نے حکومت کو خبردار کیا کہ وہ ایک ماہ کے اندر طلباء کے بنیادی مطالبات تسلیم کرے۔ ورنہ طالب علم اپنے مطالبات کی منظوری کے لیے براہ راست اقدام کریں گے۔

اس یوم مطالبات کا حکومت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ چنانچہ ڈی ایس ایف اور انٹر کالجیٹ باڈی کی اپیل پر ۷ جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی کے طلباء نے یوم مطالبات منایا۔ ہر کالج میں علامتی ہڑتال کی گئی اور طلبا نے جلسے منعقد کیے۔اس کے بعد مختلف کالجوں کے طلباء ڈی جے کالج میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ پروگرام کے مطابق طلباء کو ڈی جے کالج سے دستور ساز اسمبلی تک جانا تھا جو اس کالج سے تقریباً ایک میل دور تھی۔طلبا نے اراکین اسمبلی اور وزیر تعلیم کو پیش کرنے کے لیے یادداشت بھی تیار کر رکھی تھی۔ پولیس نے کالجوں میں اجلاس ہونے دیئے لیکن جب طالب علموں کا مشترکہ جلوس دستور ساز اسمبلی کی جانب بڑھ رہا تھا، تو پولیس نے کسی اشتعال کے بغیر جلوس پر جگہ جگہ لاٹھی چارج کی اور آنسو گیس پھینک کر اسے منتشر کرنے کی کوشش کی۔فریئر روڈ پر تین مرتبہ زبردست لاٹھی چارج کیا گیا، جس سے کئی طلباء زخمی ہو گئے۔اس موقع پر انتظامیہ کے افسروں نے طالب علموں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے رہنماؤں کو بات چیت کے لیے بھیجیں لیکن جیسے ہی یہ رہنما جلوس سے آگے گئے، انہیں گرفتار کر لیا گیا۔گرفتار ہونے والوں میں ڈی ایس ایف کے صدر محمد سرور اور سات دوسرے طالب علم شامل تھے۔ان گرفتاریوں سے طلباء میں اشتعال پیدا ہو گیا۔طلباء لاٹھیاں اور اشک آور گیس کھاتے مختلف راستوں سے وزیر تعلیم کی سرکاری رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ مسلح پولیس نے وزیر تعلیم کی رہائش گاہ کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔تقریباً تین ہزار طلباء نے وزیر تعلیم کی رہائش گاہ کو گھیر لیا اور دیر تک وہ یہاں مظاہرہ کرتے رہے۔ مظاہرہ کے بعد طالب علم رہنماؤں کو رہا کر دیا گیا۔ وزیر تعلیم ''ناسازیٔ طبع'' کے باوجود طالب علم رہنماؤں سے ملنے پر آمادہ ہو گئے۔ وزیر تعلیم اور طالب علم رہنماؤں کے درمیان دو گھنٹے تک ملاقات جاری رہی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ رات گئے دونوں طالب علم تنظیموں نے اعلان کیا کہ پولیس کی زیادتیوں کے خلاف مظاہرہ کرنے کے لیے کل ڈی جے کالج سے طلباء پھر جلوس نکالیں گے۔

اگلے روز یعنی ۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی کے طالب علموں نے زبردست جلوس نکالا۔ ان میں بے پناہ جوش و جذبہ پایا جاتا تھا۔ انفنسٹن سٹریٹ پر پولیس نے اس پُر امن جلوس پر لاٹھی چارج کیا اور آنسو گیس چھوڑی جس سے متعدد طلباء زخمی ہو گئے۔ اس موقع پر وزیر داخلہ آئے اور انہوں نے طلباء سے خطاب کرنے کی کوشش کی کہ گیس کے ایک بم سے ان کی بیمہ شدہ نئی گاڑی میں آگ لگ گئی۔ سرکاری طور پر یہ مؤقف اختیار کیا گیا تھا کہ کار کو طالب علموں نے آگ لگائی ہے، جس کے بعد وزیر داخلہ وہاں سے چلے گئے۔ اس کے چند منٹوں بعد پولیس نے طلباء اور عوام پر فائرنگ شروع کر دی جس سے سترہ افراد شہید اور اڑھائی سو افراد زخمی ہو گئے۔ طلباء کی ان قربانیوں کے نتیجے میں اگلے روز یعنی ۹ جنوری کو حکومت نے کئی ایک مطالبات تسلیم کر لیے۔ کالج کی فیس ماہانہ وصولی کی جانے لگی اور فیس چالیس روپے سے کم کر کے ساڑھے بارہ روپے ماہانہ کر دی گئی۔ بعد میں وزیر تعلیم کو بھی تبدیل کر دیا گیا۔ لاہور اور راولپنڈی میں طلباء نے اس تحریک کی حمایت کی اور مطالبات کے حق میں قراردادیں منظور کیں۔ ڈھاکہ میں طلباء نے مظاہرے کیے۔ کیوں کہ وہ خود بھی ایسے ہی مسائل سے دوچار تھے۔

روزنامہ مساوات کے تجزیے کے مطابق اس تحریک میں عوام نے طلباء کا بھرپور ساتھ دیا۔ قومی اخبارات نے بھی طلباء کی جدوجہد کو عوام سے روشناس کرایا اور اس طرح طالب علم تحریک کے سلسلے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اس تحریک میں بھی طلباء کا کردار درمیانے طبقے کا ہی رہا۔ گو اس تحریک نے کراچی کے شہریوں کو متاثر کیا لیکن اس وقت تک طبقاتی شعور کی وہ سطح نہیں تھی کہ عوام کھل کر اس تحریک میں شامل ہوتے اور طلباء کا بھرپور ساتھ دیتے۔ دوسرے اس تحریک کے نعرے بھی سیاسی نہیں تھے۔ تاہم اسے جس سیاست کی حمایت حاصل تھی، وہ بھی پاکستان کے عوام میں مقبول نہیں ہو سکی تھی کیوں کہ اس وقت کے ترقی پسند سیاستدانوں نے قومی تضاد کو یکسر نظر انداز کر رکھا تھا۔ اور ہندوستان سے تضاد کو اپنی نظر میں نہ رکھنے کی وجہ سے مجموعی طور پر عوام میں ان کی سیاست نہیں پہنچ سکی تھی۔ اس وجہ سے اس تحریک کو ملک کے عوام الناس کی بھرپور حمایت حاصل نہ ہو سکی۔ اور یہ تحریک آخری تجزیے میں حکمران طبقوں کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

۱۹۵۳ء کی طالب علم تحریک کے بعد حکومت نے طلباء میں انتشار پھیلانے کے لیے

تخریبی سرگرمیاں شروع کر دیں اور طالب علموں میں حکومت کے حامیوں کا ایک گروہ پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ابوبکر احمد علیم اور کمشنر کراچی اے ٹی نقوی نے نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے ایک تنظیم بنوائی جس کو اسلامی جمیعت طلباء کی بھی حمایت حاصل تھی۔ اس تنظیم کو حکومت کی جانب سے روپیہ پیسہ دیا گیا اور اس تنظیم نے اپنی طالب علم دشمن سرگرمیاں شروع کر دیں۔ درمیانہ طبقہ چوں کہ طبقاتی لحاظ سے کمزور طبقہ ہوتا ہے اس لیے حکمران طبقوں کے لیے اس کے کچھ حصے کو خریدنا آسان ہوتا ہے۔ اس طرح یہ حصہ اپنے ہی طبقے کی تحریک کو سبوتاژ کرتا ہے۔ اس صورتِ حال میں طالب علموں نے محسوس کیا کہ کُل پاکستان بنیادوں پر طالب علموں کی تنظیم بنائی جائے جس کے لیے کراچی کے ڈی ایس ایف اور انٹر کالجیٹ باڈی کے طالب علم کارکنوں نے کوششیں شروع کر دیں۔ ڈی ایس ایف کے پندرہ روزہ جریدے ''سٹوڈنٹس ہیرالڈ'' نے ملک بھر کے طلباء کے اتحاد کی ضرورت کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کراچی کے ترقی پسند طالب علم کارکنوں نے کنونشن کے لیے دس ہزار روپے سے زائد فنڈ جمع کیا۔ یہ فنڈ طلباء نے اپنے جیب خرچ اور درمیانے طبقے کے دوسرے لوگوں سے جمع کیا اور اس طرح دسمبر ۱۹۵۳ء میں کراچی کے کٹرک ہال میں ملک بھر کی طالب علم تنظیموں کا پہلا نمائندہ اجلاس شروع ہوا۔ مندوبین کو نگار ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ کنونشن میں مغربی پاکستان کے تمام بڑے شہروں کے علاوہ مشرقی پاکستان سے بھی مندوبین شریک ہوئے۔ یہ مندوبین ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس لیگ کے صدر قمر الزمان اور ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس یونین کے صدر عبدالمتین تھے۔ کنونشن کے پہلے اجلاس میں کمشنر کراچی نے غنڈے بھیج کر مندوبین پر حملہ کرا دیا۔ لیکن طلباء نے غنڈوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اگلے روز یہ کنونشن پاکستانی چوک کے ایک سکول کی عمارت میں منعقد ہوا۔ انتظامیہ کے غنڈوں نے یہاں بھی حملہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بہت سے مزدور کارکن طالب علموں کی مدد کے لیے پہنچ گئے جنہیں دیکھ کر غنڈے بھاگ گئے اور اس طرح سے یہ کنونشن کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ کنونشن میں آل پاکستان سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے قیام کا اعلان کیا گیا جس کا صدر پنجاب کے مندوب عالی رضوی اور سیکریٹری کراچی کے محمد سرور کو بنایا گیا۔ اس تنظیم میں بھی ترقی پسند طالب علم حاوی تھے اور وہ اسے ترقی پسند بنیادوں پر چلانے کے خواہاں تھے۔ کنویشن کے کچھ عرصہ بعد کراچی کے طلباء کے ایک وفد نے

پنجاب کا دورہ کیا جہاں ان کا زبردست استقبال کیا گیا اور یہ تنظیم پنجاب میں بھی جگہ جگہ منظم ہونے لگی اور اس طرح سے طالب علم برادری کا اتحاد آگے بڑھنا شروع ہو گیا۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک سرکاری حلقے مستقل یہ پراپیگنڈا کرتے رہے کہ طلباء کی ترقی پسند تنظیمیں پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی ذیلی شاخیں ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں جب پاکستان کمیونسٹ پارٹی کو خلاف قانون قرار دیا گیا تو اس کے ساتھ ہی آل پاکستان سٹوڈنٹس آرگنائزیشن اور ڈی ایس ایف بھی خلاف قانون قرار دے دی گئیں اور دیگر ترقی پسند رہنماؤں کے ساتھ مشہور طالب علم کارکنوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں ڈاکٹر محمد سرور، محمد اختر، جمال نقوی، عابد زبیری، حسن ناصر، منہاج برنا اور مرزا محمد کاظم شامل تھے۔ ڈی ایس ایف کے غیر قانونی قرار دیئے جانے کے بعد نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کا واحد مقصد ڈی ایس ایف کی مخالفت کرنا تھا۔ ۱۹۵۵ء تک یہ تنظیم اس قدر کمزور ہو گئی کہ ایک طے شدہ فیصلے کے مطابق ترقی پسند طالب علموں نے اس تنظیم میں شامل ہو کر اس پر قبضہ کر لیا۔ اور پہلے ہی کونسل سیشن میں دو ترقی پسند طالب علم کارکن عبدالودود اور صبغت اللہ قادری، این ایس ایف کے جنرل سیکریٹری اور جوائنٹ سیکریٹری منتخب کر لیے گئے۔ صدر ایک غیر مؤثر طالب علم کو بنایا اور یوں این ایس ایف طلبا کی واحد ترقی پسند تنظیم بن گئی۔ ۱۹۵۶ء کے آخر تک کراچی میں این ایس ایف طلباء کی سب سے زیادہ مؤثر تنظیم بن چکی تھی اور اس کے ارکان تقریباً تمام اہم کالجوں کی یونینوں کے عہدیدار منتخب ہو چکے تھے۔

کالعدم ڈی ایس ایف اور آل پاکستان سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا دوسرا نام اب این ایس ایف ہی تھا جس میں دیگر ترقی پسند طلبا بھی شامل ہوتے چلے گئے۔ ۵۸۔۱۹۵۵ء کے دوران این ایس ایف کے باعث ہر سال منانے کے لیے دو اہم دن تھے۔ ۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کی مشرقی پاکستان کے طلباء کی تحریک کا دن اور ۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو ڈی ایس ایف کی کراچی کی تحریک کا دن۔

اس درمیانی عرصہ میں طلباء کی جدوجہد تعلیمی اداروں میں بہتر حالات تعلیم کے حصول تک محدود رہی۔ ۱۹۵۶ء کے آخر میں طلبا نے ڈاؤ میڈیکل کالج کے طلباء کی حمایت میں مظاہرہ کیا۔ دوسرے مطالبات کے علاوہ طلباء کا یہ مطالبہ بھی تھا کہ جامعہ کراچی اپنے اس فیصلے کو واپس لے جس کے مطابق کالج میں داخلہ لینے والے ہر طالب علم کو اس بات کا عہد کرنا پڑتا تھا کہ وہ ملک وملت سے

وفادار رہے گا۔ طلباء کے نزدیک یہ عہد نامہ توہین آمیز بات تھی۔ تین ماہ کی جدوجہد کے بعد ۱۹۵۷ء کے اوائل میں یہ فیصلہ واپس لے لیا گیا۔ طلبا کے مطالبات منوانے کے لیے اس عرصہ میں ڈاؤ میڈیکل کالج کے این ایس ایف یونٹ نے ایک بار بھوک ہڑتال بھی کی۔

ڈی ایس ایف (DSF) نے نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن (NSF) کی شکل میں اپنا سفر جاری رکھا اور ایوب مارشل لاء کا ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن جبر کے اس دور یں انتشار اور دھڑے بندی کو نہ روک سکی۔ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۹ء تک تمام مختلف ترقی پسند طلباء تنظیموں اور دھڑوں نے اکٹھے ہوکر بخوشی پاکستان فیڈرل یونین آف سٹوڈنٹس (PFUS) بنائی جس کے روح رواں نذیر عباسی تھے۔ ۱۹۷۸ء میں نذیر عباسی نے اس یونین کو واحد ترقی پسند طلباء تنظیم میں تبدیل کرنے کے لیے پاکستان بھر میں کوشش کی لیکن رجعتی ضیا مارشل لاء نے نذیر عباسی کو گرفتار کر کے ۱۹۸۰ء کو خفیہ اذیت خانہ میں تشدد کر کے شہید کر دیا، لیکن ان کے ساتھیوں کی جدوجہد جاری رہی۔ اور ۸ جنوری ۱۹۸۲ء کو پشاور میں ''پاکستان فیڈرل یونین آف سٹوڈنٹس'' کا کنونشن منعقد ہوا جس میں پاکستان کے ترقی پسند طلباء کی تنظیم ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن کا دوبارہ قیام عمل میں آیا۔ ڈی ایس ایف عالمی سطح پر انٹرنیشنل یونین آف سٹوڈنٹس (IUS) اور ورلڈ فیڈریشن آف ڈیموکریٹک یوتھ (WFDY) سے مل کر نوجوانوں اور طالب علموں کی عالمی تحریک سے مربوط ہوگئی۔

جن دنوں جام ساقی پر خصوصی فوجی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا، انہی ایام میں ڈی ایس ایف کے ایک پمفلٹ کے حوالے سے ایک اور مقدمہ بھی چل رہا تھا۔ اس میں گھنشام پرکاش سمیت ڈی ایس ایف کے دیگر رہنما بھی ملوث تھے۔ جام ساقی اس مقدمے میں بطور گواہ صفائی پیش کیے۔ ان کا تحریری بیان ڈی ایس ایف کی تاریخ کے حوالے سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ جام ساقی اپنے مقدمے کے ساتھ ساتھ ڈی ایس ایف کے نوجوان ساتھیوں کا بھی دفاع کر رہے تھے، جن میں گھنشام داس اس لیے بھی اہم ہیں کہ جام ساقی نے ذاتی حیثیت میں ان کا بھرپور دفاع کیا۔ اپنے بیان میں جام ساقی نے گھنشام کی ذاتی گواہی کے ساتھ ساتھ، انہوں نے نظریہ پاکستان، صوبوں کے درمیان نفرت، فوج کے خلاف نفرت، مارشل لاء کے مقصد اور گھنشام کے کردار پر بھی سیر حاصل بحث کی۔ بیان کے آخر میں اے پی پی کی جرح کو بھی بیان کا حصہ

بنایا گیا ہے۔ہم ذیل کے صفحات میں ان کے بیان کے بعض اہم اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔

''میری ذاتی معلومات کے مطابق گھنشام داس ایک وطن پرست شخص ہے۔ وہ اعلیٰ اخلاقی کردار کے مالک ہیں۔گزشتہ کئی سالوں یعنی ۱۹۷۶ء سے میں ان سے بالواسطہ واقف ہوں اور ۱۹۸۳ء سے جب وہ جیل میں مجھ سے ملے تھے، میں انہیں براہِ راست جانتا ہوں۔گھنشام پر پاکستان کی سلمیت اور استحکام کے خلاف کارروائی کرنے اور پاکستانی فوج کے خلاف اور صوبوں کے مابین نفرت پھیلانے کے الزامات عائد کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر میں ان کی پوزیشن کی وضاحت نکتہ بہ نکتہ کروں گا۔''

نظریہء پاکستان کے سوال پر جام ساقی نے سیر حاصل بحث کی۔اپنی بحث کا آغاز انہوں نے نظریہ پاکستان کے لغوی معنی سے کیا اور کہا:

''آکسفورڈ ڈکشنری میں نظریہ کی تعریف کی گئی ہے۔''علم ادراک خیالی قیاس آرائی۔ کسی خاص طبقہ یا فرد کا اپنا مخصوص طرزِ فکر۔کسی معاشی یا سیاسی تھیوری یا نظام کی بنیاد پر نقطہءنظر''۔ چنانچہ تصورات سائنس معلومات، ایجادات اور اختراعات کی نوعیت ہمیشہ بین الاقوامی ہوتی ہے۔ نظریات کو کبھی بھی کسی خاص ملک یا جغرافیائی خطہ تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو ساری انسانیت کی میراث ہوتے ہیں۔دنیا میں تقریباً ۱۷۰ ممالک ہیں۔لیکن کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں ملے گا جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اس ملک میں ''نظریہ امریکہ'' یا نظریہ سعودی عرب'' رائج ہے۔اگر سادہ لوح شخص یہ کہے کہ اسلام ''نظریۂ پاکستان'' ہے تو اس سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اسلام ایک کائناتی مذہب ہے (سارے دوسرے مذاہب اور نظریات کی مانند) اور لاکھوں کی تعداد میں ایسے مسلمان ہیں جو اسلام کو ''نظریۂ پاکستان'' نہیں مانتے۔ان کا عقیدہ ہے کہ یہ ایک بین الاقوامی مذہب ہے اور وہ خود بھی اس کا ایک جزو ہیں۔مزید برآں خود ہمارے ملک میں لاکھوں کی تعداد میں مذہبی اقلیتیں موجود ہیں جو اسلام کو نہیں مانتے ہوئے بھی ہمارے ملک کا حصہ ہیں۔

میرے اور میرے دوست کے خلاف ایک مقدمہ میں مس بے نظیر بھٹو (پی پی پی کی ایکٹنگ پریزیڈنٹ) نے میری صفائی میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کی پہلی پانچ دفعات ہی نظریہ پاکستان ہیں۔اسی طرح علامہ سید محمد شاہ امروٹی نے، (ایکٹنگ سیکریٹری جمیعت

علمائے پاکستان) نے کہا تھا کہ کسی ملک کا ''نظریہ'' اس کا اپنا آئین ہوتا ہے۔ چنانچہ پاکستان کا نظریہ ۱۹۷۳ء کا اس کا آئین ہے پس جو شخص غیر آئینی طریقہ پر اس میں کسی بھی قسم کی ترمیم کرتا ہے یا اسے منسوخ کرتا ہے یا اسے معطل کرتا ہے وہ نظریہ پاکستان کو مجروح کرتا ہے۔

میر غوث بخش بزنجو (پی این پی کے صدر) نے میری صفائی میں گواہی دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''۱۹۴۰ء کا ریزولیوشن ہی نظریہ پاکستان ہے کیوں کہ اسی ریزولیوشن کے مطابق ساری وفاقی وحدتیں خود مختار اور اقتدار اعلیٰ کے اختیارات کی حامل تسلیم کی گئی تھیں۔ یہ ریزولیوشن عوام کا معاہدہ عمرانی ہے اور صرف یہی ریزولیوشن نظریہء پاکستان کہا جاسکتا ہے۔

عبدالولی خان (این ڈی پی کے صدر) نے میرے دفاع میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ کسی بھی قانون یا حقیقتاً زیر عمل دستاویز میں کسی نظریہ کی تعریف بیان نہیں کی گئی ہے۔ اپنے مخالفین کو زک پہنچانے کے لیے اسے ہمیشہ مبہم رکھا جاتا ہے اور 'نظریہ پاکستان' ایسی مبہم اصطلاح ہے جس کی کوئی واضح اور غیر مبہم تعریف نہیں کی جاسکتی۔ یہ اصطلاح یحییٰ خان کی وضع کی ہوئی ہے۔ وہی یحییٰ خان جسے سپریم کورٹ نے غاصب قرار دیا تھا۔ جب بھی فوجی جنتا ملک کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت میں ناکام ہوجاتی ہے تو نظریاتی سرحدیں گڑھ کر ان کے تحفظ کا دعویٰ کرنے لگتی ہے۔

میرے خیال میں یہ نظریہ ہمیشہ طبقاتی ہوتا ہے۔ دوسرے طبقات یا ساری دنیا بھی انہیں قبول کرتی، تب بھی نظریہ کی حیثیت باقی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر اشتراکیت پرولتاری طبقہ کا نظریہ ہے۔ لیکن آج پاکستان میں تقریباً سارے ہی محب وطن اور محنت کش طبقہ کے افراد اسے مانتے اور تسلیم کرتے ہیں پاکستان کے عوام نے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء کے آزاد اور منصفانہ انتخابات میں اپنے سماجی اور معاشی نظام کے طور پر اشتراکیت کے حق میں ووٹ دے کر اپنے نظریہ کو واضح کر دیا ہے۔ چنانچہ پاکستانی عوام کے لیے (اگر کوئی) نظریہ پاکستان ہے تو وہ اشتراکیت کا نظریہ ہے اور جو شخص اس کی مخالفت کرتا ہے وہ غداری کے جرم کا مرتکب ہے۔ گھنشام پرشاد نے ۱۹۷۳ء کے آئین کی مخالفت کی ہے نہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کی اور نہ تو اس نے ایک منتخب شدہ حکومت کا تختہ الٹا کر اپنی ذاتی مرضی کو ہم پر مسلط کیا ہے۔ مزید برآں انہوں نے اشتراکیت کی مخالفت بھی نہیں کی ہے جو پاکستان کے عوام کی رائے عامہ ہے۔ پس انہیں نظریہ پاکستان کی مخالفت کرنے کا مجرم نہیں گردانا

جا سکتا۔''

صوبوں کے درمیان نفرت پھیلانے کے الزام پر بحث کرتے ہوئے جام ساقی نے اس طرح وضاحت کی:

''پاکستان واحدانی مملکت ہے نہ ہی واحدانی مملکت کی حیثیت سے اس کی سالمیت برقرار رہ سکتی ہے۔ یہ چار صوبوں پر مشتمل ہے۔ ڈسٹرکٹ اور ضلعوں کی مانند ہمارے صوبے محض انتظامی وحدتیں نہیں ہیں۔ پاکستان قومیتوں پر مشتمل ریاست ہے۔ ہمارے صوبے تہذیبی اور قومی وحدتیں ہیں۔ یہ صوبے پاکستان نے تخلیق نہیں کیے۔ جبکہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کے ذریعے صوبوں نے پاکستان بنایا اور یہ فیصلہ کیا کہ وفاقی وحدتیں خود مختار اور اقتدارِ اعلیٰ کی مالک ہوں گی۔ چنانچہ مرکزی حکومت کو کون سے اختیارات دیئے جائیں۔ یہ فیصلہ کرنے کا اختیار مرکز کو نہیں بلکہ صوبوں یا قومیتوں کو ملنا چاہیے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی جرمنی نے چند ہفتوں ہی کی مدت میں بہت سی ریاستوں کو نیست و نابود کر دیا۔ لیکن سوویت یونین نے جہاں ہر قوم کو مرکز سے علیحدہ ہو جانے کا حق حاصل ہے نہ صرف برسوں تک ڈٹ کر نازیوں کا مقابلہ کیا بلکہ نازی فوج کو واپس برلن تک دھکیل دیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کئی قومیتوں پر مشتمل ریاستوں میں اگر قومیت کو حق خود ارادیت حاصل ہو تو ایسی ریاستیں بہت استوار اور پائیدار ثابت ہوں گی۔

بدقسمتی سے ہماری فوج کے ایک بڑے حصہ کا تعلق صرف پنجاب سے ہے چنانچہ جب بھی پاکستان میں مارشل لاء نافذ ہوتا ہے، چھوٹے صوبوں کے جذبات پنجاب کے خلاف ابھر جاتے ہیں اور چاروں صوبوں کے درمیان بھائی چارگی کی فضا تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ۱۹۴۰ء کے ابتدا ہی میں ڈاکٹر امبرکار نے یہ پیش بینی کر لی تھی اور برطانوی حکومت کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا تھا کہ صرف چند علاقوں سے فوجیوں کی بھرتی مارشل لاء کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ مارشل لاء تو وحدانی طرز حکومت سے بھی بدتر ہے کیوں کہ مارشل لاء میں اقتدار کا منبع فرد واحد ہوتا ہے جو اپنی ذات کے سوائے کسی دوسرے کی نمائندگی نہیں کرتا۔ (افراد کی بجائے) اقتدار کا منبع غیر منتخب ادارہ ہو تو ایسی صورت میں بھی قومیتیں اپنے حقوق سے محروم ہو جاتی ہیں۔ یہاں میں پُر زور طریقہ پر اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ مارشل لاء کی مخالفت سے میرا مطلب ایسے حکومتی جتھ سے ہے جو اپنے مفادات

اور گھناؤنے عزائم کی تکمیل کے لیے پوری فوج ہی کو استعمال کر رہا ہے۔ صوبوں کو کچلنے کے لیے بھی یہ فرد واحد یا حکومتی جتھ فوج کو استعمال کر رہا ہے۔ اب تو یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ جون ۷۷ء تک منتخب شدہ وزیراعظم اور پی این اے نے متفقہ طور پر جنرل محمد یحییٰ خان سے بلوچستان سے فوجی کارروائی ختم کر کے، فوج واپس بلا لینے کا مطالبہ کیا لیکن انہوں نے ڈھٹائی کے ساتھ اس مطالبہ کو رد کر دیا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ پورے پاکستان میں اور خاص طور پر سندھ میں جبر و تشدد کی مدد سے حکومت کی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو فوج بدنام ہو رہی ہے اور دوسری طرف صوبے ایک دوسرے سے بدظن ہو رہے ہیں۔'' بحث کو سمیٹتے ہوئے جام نے کہا:

''چنانچہ جو شخص بھی قومیتوں کے ساتھ ناانصافی اور مارشل لاء کے خلاف آواز بلند کرتا ہے یا قومیتوں کے حقوق کا مطالبہ کرتا ہے وہ درحقیقت ملک کی سالمیت اور استحکام کو تقویت پہنچاتا ہے۔ گھنشام پرشاد نے نہ صرف یہ کہ مارشل لاء نافذ نہیں کیا بلکہ طالب علم رہنما کی حیثیت سے ہر قسم کی ناانصافی کو ختم کرنے کی جدوجہد کرتے رہے ہیں اور اس لیے انہیں صوبوں کے درمیان نفرت پھیلانے کا ذمے دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔''

فوج کے خلاف نفرت پھیلانے کے الزام پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

''لوگوں کے دلوں میں فوج کا وقار ایک طرح سے بہت کم ہو گیا ہے اور اس کی بڑی وجہ خود مارشل لاء کا نفاذ ہے۔ اگرچہ پوری کی پوری فوج مارشل لاء کی کارروائی میں ملوث نہیں ہے۔ فوج کی تنظیم اس طرح ہوتی ہے جہاں سارے فوجی اختیارات اعلیٰ ترین فوجی عہدیدار کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں اور صرف چند افراد ہی ساری فوجی تنظیم پر قابض ہوتے ہیں۔ پھر چند ایسے واقعات بھی ہوئے جو کسی سول حکومت کے دَور میں رونما نہیں ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر بستی بہار راجن پور پنجاب کی متعدد عورتوں کو مادرزاد برہنہ پولیس چوکی تک پریڈ کر کے جانا اور ان کے مردوں کو کتوں کی طرح بھونکتے ہوئے ان عورتوں کے پیچھے چلنے پر مجبور کیا گیا۔ عورتوں کو ننگا نچایا گیا۔ اس واقعہ میں ۴۰ پولیس والے ۴۷ رنگروٹ اور ۷ دوسرے افراد ملوث تھے۔ کیس میں ملوث سارے سرکاری ملازمین ضمانت پر رہا ہو گئے ہیں۔ ان کے مقدمہ کی سماعت بھی سول عدالت میں ہو رہی ہے (ڈان ۲ نومبر ۸۴ء)۔ پھر نواب پور کا واقعہ ہے جس میں دو خواتین کو بری طرح زدوکوب کر کے شہر میں

برہنہ گھمایا گیا۔ جب عوام نے اس واقعہ کے خلاف احتجاج کیا تو جنرل ضیا نے کہا کہ ایسے گھناؤنے جرائم کے مرتکب مجرموں کو سزا دینے کے لیے ملک میں سرے سے کوئی قانون بھی موجود نہیں۔ برخلاف اس کے امداد چانڈیو، شیر محمد منگریو اور محمد خان سولنگی جیسے طالب علم رہنماؤں کو محض جمہوریت کا مطالبہ کرنے پر سات سال کی قید بامشقت اور کوڑوں کی سزا دینے کے لیے ملک میں قانون موجود ہے۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو تھوڑی ریلوے کراسنگ پر کئی طالب علم مارے گئے اور کئی دوسرے زخمی کیے گئے۔ غالباً سندھیوں نے تحریک بحالی جمہوریت کے دوران جس پامردی سے جدوجہد میں حصہ لیا، انہیں اس تشدد کے ذریعے سبق سکھانا مقصود تھا۔ یہ کارروائی ایک بریگیڈیئر اور دوسرے افسران کی موجودگی میں کی گئی یہ واقعات عوام کے دلوں میں کس قسم کے جذبات ابھار سکتے ہیں؟

مزید برآں نام نہاد ریفرنڈم سے پہلے تقریباً ہر سیاسی جماعت کے رہنماؤں کو پارٹی بنیاد پر الیکشن میں حصہ لینے کی پیشکش کی گئی بہ شرط یہ کہ

(۱) کسی فوجی جنرل کو کسی جرم کے ارتکاب کا ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے۔

(۲) جنرلوں یعنی NLC اور فوجی فاؤنڈیشن کی ذاتی یا اجتماعی املاک کو کسی صورت چھیڑا نہ جائے۔

(۳) جو صنعتیں مارشل لاء کے دور میں دوبارہ ذاتی ملکیت میں دے دی گئی ہیں انہیں پھر سے قومیایا نہیں جائے۔

(۴) امریکہ کے ساتھ جن تعلقات کی تجدید ہوئی ہے انہیں برقرار رکھا جائے۔

(۵) افغان مسئلہ حل نہیں کیا جائے تاکہ بھاری دفاعی بجٹ فوج کی غیر ضروری اہمیت اور امریکہ سے دوستی کا جواز مل سکے۔

(۶) پاکستان میں عوام ملکی سیاسی عمل میں حصہ نہ لیں۔

(۷) مندرجہ بالا شرائط پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے جنرل ضیا کو اگلے پانچ سالوں کے لیے صدر تسلیم کیا جائے۔''

اس ساری صورت حال کا سیاسی تناظر بیان کرتے ہوئے جام ساقی نے کہا:

''تقریباً ساری سیاسی جماعتوں نے ان شرائط کو ماننے سے انکار کر دیا۔ لیکن اس کے

باوجود نام نہاد الیکشن کرائے گئے۔ جنرل ضیا اور ان کے ہم رکابوں نے سازش کے ساتھ منتخب شدہ حکومت کا تختہ الٹا تھا۔ پروفیسر غفور نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ PNA کی تحریک جنرل ضیا کے ایما کے مطابق چلائی گئی۔ اپنے بیان کی صداقت کے ثبوت میں ۶ مارچ ۱۹۸۵ء کا جسارت پیش کر رہا ہوں جس میں پروفیسر غفور نے اس حقیقت کو مانا ہے۔ اخبار کے اس تراشہ پر صدر کے دستخط موجود ہیں۔ (دستاویز GG کے ساتھ تراشہ منسلک ہے) جبکہ نوابزادہ نصراللہ کے بیان کے مطابق پی پی اور پی این اے میں سمجھوتہ کا مسودہ مکمل ہو چکا تھا۔

حضور والا، بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ پوری فوج نہیں بلکہ اس کا ایک مختصر سا جتھا اس ساری قابل نفرین کارروائی کا ذمہ دار ہے چوں کہ گھنشام پرشاد پر یہ مندرجہ بالا الزامات سرے سے عائد ہی نہیں کیے گئے ہیں، اس لیے انہیں کسی طور بھی فوج کے خلاف نفرت پھیلانے کا موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

نوجوانوں کی کارکردگی۔ ہمارے طالب علموں کو اس حقیقت کا بخوبی علم ہے کہ وہ قوم کے نوجوان باہمت اور روشن ضمیر سپوت ہیں۔ انہیں اس کا بھی احساس ہے کہ ضروریاتِ زندگی کی ساری لوازمات کے حصول کے لیے وہ اپنی قوم کے مرہون منت ہیں۔ ان کے کپڑے، کتابیں اور تعلیمی اداروں کی عمارتیں قوم کے محنت کش عوام کے خون پسینے کی پیدا کردہ ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک میں ایک طرف تو سامراج نے ان کی فوجی طاقت میں اضافہ کیا اور دوسری طرف سماج کے دوسرے منظم اداروں کو پنپنے کا موقع میسر نہیں ہونے دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان ممالک میں عوام کے سروں پر ہمیشہ مارشل لاء کی تلوار لٹکتی رہتی ہے۔ ہندوستان میں بھی اگرچہ مختلف قومیتیں بستی ہیں لیکن چوں کہ وہاں بہت ساری تنظیموں اور اداروں مثلاً کانگریس کیمونسٹ پارٹی، ٹریڈ یونین کسان سبھائیں، طلبہ کی تنظیمیں وغیرہ موجود ہیں، اس لیے وہاں مارشل لاء کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہاں ہر شخص جانتا ہے کہ اگر مارشل لاء آیا تو ملک کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ ہندوستان ایسے ملک میں جس کی آبادی تقریباً ۷۲ کروڑ ہے، وہاں فوج کی نفری تعداد صرف ۱۰ لاکھ ہے۔ ہمارے یہاں ۹ کروڑ کی آبادی پر فوج کی نفری طاقت ۵ لاکھ سے کچھ اوپر ہی ہے۔ بنگلہ دیش میں اگرچہ ۹ کروڑ کی آبادی پر صرف ۶۰ ہزار نفری فوج ہے۔ لیکن برطانوی سامراج کے چھوڑے ہوئے اثرات اور دوسرے منظم اداروں کے نہ

ہونے کی وجہ سے وہاں بھی مارشل لاء ہے۔ یہ کہنا کہ اشتراکی ممالک میں کوئی فوجی جنرل کسی منتخب شدہ حکومت کا تختہ الٹنے پر قادر نہیں ہوتا، اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ عوام منظم ہیں اور فوجی ڈھانچہ جمہوری بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ بلکہ ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ معمولی سپاہی سے لے کر اونچے افسران تک میں سیاسی شعور اتنا زیادہ پختہ ہوتا ہے کہ کوئی جنرل حکومت پر فوجی قبضہ کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ فوج کے خلاف نفرت پھیلانے کے الزام کی بحث کو ختم کرتے ہوئے طلباء کے کردار کو جرم نہیں، اعزاز قرار دیا۔

مندرجہ بالا حقائق کی رو سے طلباء چوں کہ قوم کے بچے ہیں اور انہیں اپنی قوم کے احسانات کا قرض چکانا ہے۔ اس لیے یہ ان کا فرض بنتا ہے کہ وہ طلباء کی تنظیمیں منظم کریں۔ شہر میں تعلیمی سہولتیں اور تعلیم حاصل کریں اور اپنی مثال کے ذریعے عوام کو منظم ہونے میں معاون بنیں۔ چنانچہ طلباء کی چند تنظیمیں ایسی ہیں جن کا رہنما ہونا جرم نہیں بلکہ اعزاز ہے۔''

جام ساقی نے مارشل لاء کے مقصد پر بھی بحث کی اور مارشل لاء کے تسلط کے پیچھے چھپی ہوئی بدنصیبی کو بے نقاب کیا۔ انہوں نے کہا:

''شروع شروع میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ مارشل لاء کے نفاذ کا مقصد ۹۰ دنوں کے اندر اس کی زیرنگرانی آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کرانا ہے۔ ان ۹۰ دنوں کی مدت ۳۰۰۰ دن گزر چکنے کے بعد بھی اب تک پوری نہیں ہوئی ہے۔ پھر محاسبہ کا بہانہ تراشا گیا۔ لیکن وہ سارے لوگ جنہیں نااہل قرار دیا گیا تھا چوں کہ اب وہ موجودہ حکومت کے حمایتی بن گئے ہیں، اس لیے بے داغ قرار دے دیئے گئے۔ یہ بھی دعویٰ کیا گیا تھا کہ مارشل لاء ملک میں امن وامان قائم کرنے کے لیے نافذ کیا گیا ہے لیکن ملک میں ہونے والے جرائم کے سالانہ اعداد وشمار سے ثابت ہوتا ہے کہ امن وامان کی صورتِ حال کہیں زیادہ خراب ہوگئی ہے۔ موجودہ حکومت نے عدلیہ کا وقار بحال کرنے کا دعویٰ بھی کیا تھا لیکن موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ عدالت جو پہلے کسی حکومت کو جائز یا ناجائز قرار دینے کی اہل تھی، اب ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ کے جاری کردہ احکام کو بھی چیلنج نہیں کرسکتی۔ خواہ یہ سیکنڈ لیفٹیننٹ ایک ٹیبل کو بھینس ہی کیوں نہ قرار دے دے۔ یہ بھی دعویٰ کیا گیا تھا کہ یہ حکومت ملکی معیشت کو سدھارنا چاہتی ہے۔ لیکن آج یہ حال ہے کہ پہلے ہم ۶ بلین ڈالر کے مقروض تھے اور اب ۱۴ بلین

ڈالر کے مقروض ہیں۔ مزید برآں جس وقت موجودہ حکومت نے سول حکومت کا تختہ الٹا تھا۔ اس وقت ملک میں ۱۶ بلین کرنسی نوٹ گردش میں تھے۔ آج ان پاکستانی نوٹوں کی تعداد بڑھ کر ۵۵ بلین ہوگئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ افراط زر نے ضروریات زندگی کی قیمتیں آسمان پر پہنچادی ہیں۔

جہاں تک اسلام کے نافذ کرنے کا دعویٰ ہے تو اس سلسلہ میں کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہوگا۔ چنانچہ مارشل لاء کے قائم رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ذاتی اقتدار کو مستقل قائم رکھا جائے۔ اگر صورت حال یہ ہے تو ہر محب وطن پاکستانی کا فرض بنتا ہے کہ اس حکومت کی مخالفت کرے تاکہ عوام اپنا اقتدار واپس لے سکیں۔ اس لیے اگر گھنشام پرشاد جمہوریت کا مطالبہ کر رہے ہیں تو کوئی جرم نہیں کر رہے۔''

اپنے بیان کے آخر میں جام ساقی نے دوبارہ گھنشام کے کردار کو سراہا اور اس کا بھرپور دفاع کیا۔

''میں اپنی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ گھنشام پرشاد ایک محب وطن شخص ہے۔ ان کا اخلاقی کردار بہت اصلی ہے اور وہ آج تک کسی اخلاقی جرم کے الزام میں ملوث نہیں ہوئے ہیں۔ فوجی جنرلوں میں عام رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ جب ان کی اپنی فوج کے افراد یا کوئی غیرملکی فوج ان کی حکومت کو الٹ دیتی ہے یا وہ خود کسی دوسری حکومت کے حوالہ اپنا کوئی خطہء زمین کر دیتی ہیں تو اس حالت میں وہ اقتدار عوام کے حوالہ کر دیتے ہیں۔

سوویت یا اشتراکی لٹریچر کھلے بازار میں دستیاب ہے۔ اس لیے یہ ناجائز لٹریچر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میں کمیونسٹ ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں لیکن مجھے خصوصی فوجی عدالت نمبر۴ کراچی نے باعزت بری کر دیا ہے۔

میں نے عدالت میں وہ لٹریچر دیکھا ہے جو اس مقدمہ کے سلسلہ میں ضبط کیا گیا ہے اور میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہرگز پاکستان کے خلاف نہیں ہے۔ ہاں حکومت اور مارشل لاء کے خلاف ضرور ہے اور میرے خیال میں حکومت پر تنقید کرنا یا اس کی مخالفت کرنا ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔''

جام ساقی نے اپنا بیان ختم کرتے ہوئے کہا:

''ملزم گھنشام پر گزشتہ دو سال سے مقدمہ چل رہا ہے۔ میں نہ تو DSF کا رکن ہوں نہ اس تنظیم کا عہدیدار۔ میں پروگریسو جیسے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن کا بھی نہ تو رکن ہوں نہ عہدیدار۔ ابراہیم سورد پاکستان کا ایک اچھا شہری ہے۔ میرے ان سے کوئی ذاتی تعلقات نہیں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ لوگ عام طور پر مجھے کامریڈ کی حیثیت سے جانتے ہیں۔''

اپنے بیان میں جام ساقی ۸۲۔۱۹۸۱ء میں امداد چانڈیو، شیر محمد منگریو اور محمد خان سولنگی پر چلنے والے مقدمے اور انہیں دی جانے والی قید اور کوڑوں کی سزا کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اس وقت تک ڈی ایس ایف کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا اور ان طلباء کو قید اور کوڑوں کی سزائیں دی گئیں۔ ان پر بھی مخصوص فوجی عدالت حیدرآباد میں مقدمہ چلایا گیا۔ انہوں نے بھی عدالت میں اپنے طول طویل بیانات ریکارڈ کروائے۔ اس مقدمے کی اہمت کے پیش نظر امداد چانڈیو اور شیر محمد منگریو سے مختصر اقتباسات پیش کرنا چاہیں گے۔

باب 7

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

۹ دسمبر ۱۹۸٦ء کے روز جام ساقی اس طرح رہا ہوئے کہ وہ جناح ہسپتال میں بدستور اپنے بستر پر دراز رہے لیکن ان کے کمرے کے باہر سے قیدی کی پولیس گارڈ ہٹالی گئی۔ اُس صبح جب سندھ ہائی کورٹ کے جسٹس ظہور الحق اور جسٹس سجاد علی شاہ پر مشتمل ڈویژن بنچ نے کامریڈ جام ساقی کے والد جناب محمد بچل کی جانب سے دائر کردہ آئینی درخواست کی سماعت شروع کی تو ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل سندھ محمد علی شاہ ایڈیشنل سیکریٹری داخلہ سندھ غلام عباس سومرو اور سینٹرل جیل حیدرآباد کے سپرنٹنڈنٹ محمد نواز پیش ہوئے۔ انہوں نے عدالت میں بیان دیا کہ وہ جام ساقی کو آج رہا کر رہے ہیں اور ان کے خلاف کوئی دوسرا مقدمہ نہیں. چنانچہ جام ساقی کے وکلاء یوسف لغاری اور بیرسٹر ایس اے ودود نے آئینی درخواست پر زور نہیں دیا۔ صبح گیارہ بجے رہائی کا پروانہ جناح ہسپتال میں کامریڈ جام ساقی کو پہنچادیا گیا اور ان کے کمرے سے پولیس گارڈ ہٹالی گئی۔

جناب محمد بچل کی آئینی درخواست میں سزا پوری ہونے کے باوجود رہا نہ کرنے کے سرکاری اقدام کو چیلنج کیا گیا تھا۔ کامریڈ جام ساقی کو ۱۰ دسمبر ۱۹۷۸ء کو حیدرآباد سے گرفتار کیا گیا تھا بغیر مقدمہ چلائے انہیں ۷ ماہ تک سول اور فوجی اذیت گاہوں میں رکھا گیا اور انہیں ذہنی طور پر مفلوج کرنے کے لیے سخت ذہنی اور جسمانی اذیتیں دی گئیں۔ انہیں ایک سو بیس زہریلے انجکشن لگائے گئے اور اس عرصہ میں ان کی اہلیہ نے حالات سے تنگ آکر خودکشی کرلی جبکہ ان کی ایک بچی کا انتقال ہوگیا۔ بعد میں انہیں چار ماہ تک شاہی قلعہ لاہور میں رکھا گیا۔ اس طویل عرصہ میں سندھ ہائی

کورٹ کے حکم پر پہلی مرتبہ نورالدین سرکی ایڈووکیٹ کو ان سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ جام ساقی کے خلاف حیدرآباد کی خصوصی فوجی عدالت نے بند کمرے میں مقدمہ چلایا۔ انہیں سرخ پرچم نامی رسالہ چھاپنے، تقسیم کرنے، طبقاتی نفرت پھیلانے، مارشل لاء اور امریکی سامراج کے خلاف عوام کو اکسانے کے الزامات میں فوجی عدالت نے دس سال قید بامشقت کی سزا سنائی تھی۔ اسی سلسلہ میں ایک اور الزام میں جام ساقی کے ساتھ نذیر عباسی، پروفیسر جمال نقوی، امام علی نازش، امر لعل، احمد کمال وارثی، شبیر شر، بدر ابڑو، ڈاکٹر جبار خٹک، نرنجن کمار اور سہیل سانگی کے خلاف بھی فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔ ۱۹۸۴ء میں فوجی عدالت نے شبیر شر اور احمد کمال وارثی کے سوا دیگر ملزمان کو بری کر دیا تھا۔ جبکہ ان دونوں کو سات سات سال قید بامشقت کی سزا سنائی تھی۔ تفتیش کے دوران نذیر عباسی پر اتنا تشدد کیا گیا تھا کہ وہ شہید ہو گئے تھے۔ اس مقدمے میں صفائی کے گواہوں کی حیثیت سے پیپلز پارٹی کی شریک چیئرپرسن بے نظیر بھٹو، عوامی نیشنل پارٹی کے سربراہ خان عبدالولی خان، پاکستان نیشنل پارٹی کے سربراہ میر غوث بخش بزنجو، قومی محاذ آزادی کے چیئرمین معراج محمد خان، جمیعت العلمائے اسلام کے مولانا شاہ محمد امروٹی، مزدور کسان پارٹی کے سربراہ فتحیاب علی خان اور 'امن' اخبار کے ایڈیٹر جناب افضل صدیقی کے علاوہ بہت سے ممتاز صحافی، وکلاء اور دانشور پیش ہوئے تھے۔ اس مقدمے میں ان پر سوویت یونین اور افغانستان سے دوستی، کمیونسٹ نظریات کا پرچار کرنے، مارشل لاء حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے اور لوگوں کو اکسانے کے الزامات لگائے گئے تھے۔ ۴۲ سالہ کامریڈ جام ساقی ملک میں طویل ترین مسلسل قید کاٹنے والے سیاسی رہنما تھے، انہیں اقوام متحدہ کی کمیٹی برائے انسانی حقوق اور ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ضمیر کا قیدی قرار دیا تھا۔ ملک بھر میں اور بیرون ملک ان کی رہائی کے لیے مظاہرے ہوتے رہے تھے۔

کامریڈ جام ساقی سے ان کے وکیل یوسف لغاری اور فرنٹ کے کنوینر ممتاز علی بھٹو کے پریس سیکریٹری جاوید جبار میمن نے بھی ملاقات کی۔ عدالت میں مزدور رہنما جاوید شکور، اے این پی کے رہنما امر لعل، اے این پی سندھ کے سیکریٹری اطلاعات زبیر الرحمٰن، کراچی کے جوائنٹ سیکریٹری جمال بلوچ بشیر، حبیب اللہ، غلام اکبر اور ڈی ایس ایف سندھ کے جنرل سیکریٹری علی حسن چانڈیو سمیت کئی سیاسی شخصیات اور طالب علم رہنما موجود تھے۔ یہ لوگ عدالت سے جناح ہسپتال

گئے اور کامریڈ جام ساقی کو رہائی پر مبارک باد دی۔ کامریڈ جام ساقی کے والد محمد بچل کی جانب سے دائر کردہ آئینی درخواست میں یہ موقف اختیار کیا گیا تھا کہ کامریڈ جام ساقی کی سزا اس سال پوری ہو چکی ہے اور انہیں غیر قانونی طور پر قید رکھا جا رہا ہے۔ سندھ ہائی کورٹ نے آئینی درخواست سماعت کے لیے منظور کرتے ہوئے ایڈووکیٹ جنرل سندھ اور حیدر آباد جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو نوٹس جاری کیا اور رپورٹ طلب کی تھی۔ حکومت کی طرف سے یہ موقف اختیار کیا گیا کہ وفاقی حکومت کے ایک حکم کے تحت قیدیوں کو مذہبی اور قومی تہواروں پر قید میں دی جانے والی رعایت کا اطلاق کامریڈ جام ساقی پر نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان کی قید کی مدت ابھی پوری نہیں ہوئی۔ عدالت نے اس سلسلے میں مکمل اعداد و شمار پیش کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس دوران اٹارنی جنرل اور ایڈووکیٹ جنرل سندھ کی تبدیلی کے باعث آئینی درخواست کی سماعت تعطل کا شکار رہی۔ جب سندھ ہائی کورٹ کی ڈویژن بنچ نے سماعت کی تو اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل سندھ محمد علی شاہ ایڈیشنل سیکریٹری داخلہ سندھ غلام عباس سومرو اور حیدر آباد سینٹرل جیل کے سپرنٹنڈنٹ محمد نواز پیش ہوئے اور انہوں نے بیان دیا کہ جام ساقی کو اسی روز رِہا کیا جا رہا ہے اور اس سلسلے میں جام ساقی سے رہائی کے پروانے کی تعمیل کرائی جا رہی ہے۔ ہائی کورٹ کے باہر ان کے وکیل یوسف لغاری نے اخباری نمائندوں سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ کامریڈ جام ساقی کی رہائی کے فیصلہ سے دو ہزار سیاسی قیدیوں کو فائدہ پہنچے گا۔ جو طویل عرصہ سے جیلوں میں ہیں۔

جناح ہسپتال کے سپیشل وارڈ میں کارکنوں اور اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے کامریڈ جام ساقی نے سندھ کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی اور کہا کہ حکومت، فوج کو کسی نہ کسی بہانے سندھ میں رکھنا چاہتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ سندھ میں ڈاکوؤں کے جو سرغنہ ہیں ان میں سے بیشتر یا تو ریٹائیرڈ فوجی ہیں یا بھگوڑے فوجی ہیں اور انہیں افغان مہاجروں سے بڑے پیمانے پر جدید ترین اسلحہ مہیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اب تو ان ڈاکوؤں کے جو سرغنہ ہیں، ان کے انٹرویو اخبارات اور جرائد میں بھی باتصویر شائع ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ملک کے مختلف شہروں میں ہونے والے فسادات بھی حکومت خود کرا رہی ہے۔ ان فسادات کا مقصد کیا ہے عوام اچھی طرح جانتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ جہاں کہیں بھی فساد ہوتے ہیں تو ان کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ

کوئی گاڑی بھرے بازار میں بم پھینک کر فرار ہو جاتی ہے اور اس کے بعد خود بخود ہر طرف آگ لگ جاتی ہے۔

بی بی سی نے جام ساقی کی رہائی سے متعلق تفصیلی خبر نشر کی اور بتایا کہ پاکستان میں سب سے زیادہ مدت تک قید کیے جانے والے کمیونسٹ رہنما جام ساقی کو آج صبح حکومت سندھ نے رہا کر دیا۔ انہیں ۱۹۷۸ء میں مارشل لاء حکام نے حیدر آباد سے گرفتار کیا تھا اور ۱۹۷۹ء میں ایک خصوصی فوجی عدالت نے انہیں دس سال قید با مشقت کی سزا سنائی تھی۔

پاکستان ورکرز فیڈریشن کے صدر عوامی نیشنل پارٹی کے رہنما اور جام ساقی کے قریبی دوست ڈاکٹر اعزاز نذیر نے رہائی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ کامریڈ جام ساقی کی گرفتاری اور قید بنیادی طور پر غیر قانونی تھی اور اس کا کوئی جواز نہ تھا تاہم مارشل لاء کے نام نہاد خاتمے کے بعد ملک کے ہائی کورٹس غالباً خود کو کچھ آزاد باور کرنے لگے ہیں اور رہائی کا یہ حکم بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ تاہم انہوں نے کہا کہ اس کیس کے دو سزا یافتگان شبیر شر اور کماوارثی ہنوز جیل میں ہیں جب کہ دیگر بہت سے سیاسی کارکن اور رہنما بھی جیلوں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ ڈاکٹر اعزاز نذیر نے ان تمام کی رہائی پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ملک میں جمہوریت کی بحالی اس کی بقاء اولین شرط ہے۔

۱۰ دسمبر کو انہوں نے روزنامہ امن کو ایک طویل انٹرویو دیا اور کہا کہ جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد میں عوام کی بھرپور اور عملی شرکت کے بغیر جمہوریت کی بحالی ممکن نہیں اور ایم آر ڈی کو اس ضمن میں اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کرنا ہوگا۔ انہوں نے کہا حکمرانوں کی نظر میں کمیونسٹ ہونا ایک بڑا جرم ہے لیکن مجھے اتنا طویل عرصہ قید میں رکھنے کی دو تین وجوہ اور بھی ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی بنگال میں پاکستانی فوج نے جب عوام کے خلاف ظالمانہ کارروائی کا آغاز کیا تو مغربی بازو کے سارے ہی سیاستدان خاموش رہے۔ میں واحد سیاسی شخصیت تھا جس نے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ فوجی جنتا کے لیے میری یہ سرگرمیاں سخت خطرناک تھیں۔ پھر ۱۹۷۷ء میں جب پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف سازش پر عمل درآمد کا آغاز ہوا تو ملک کے سارے ہی سیاستدان پاکستان قومی اتحاد (پی این پی) سے جا ملے جب کہ ہم پی این اے میں نہیں گئے بلکہ اس سارے ہنگامے کو ہم نے فوج کی سازش قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس کھیل کا مقصد ملک پر مارشل لاء مسلط کرنا ہے۔ ذوالفقار

علی بھٹو اس وقت سامراج سے کٹے ہوئے تھے چنانچہ ہم نے پی این اے کے مقابلے میں بھٹو کی حمایت کی۔

فوجی جنتا یہ بات بھی نہیں بھولی۔ مجھے طویل عرصہ قید میں رکھنے کی ایک اور اہم وجہ یہ تھی کہ میرے مقدمے میں ملک کے سارے ہی لیڈر میرے حق میں گواہی دینے آئے اس بنا پر فوجی حکمرانوں کا یہ خیال اور تقویت پکڑ گیا کہ جام ساقی ذاتی طور پر سب سے ملتا رہتا ہے اور کہیں یہ متحدہ محاذ نہ بنالے جب کہ یہ حکمران لوگوں کو آپس میں لڑاتے رہتے ہیں تاکہ خود اقتدار پر ڈٹے رہیں۔ میری طویل اسیری میں کمیونسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ ان تین عوامل کو بھی بڑا دخل تھا۔ اس سوال کے جواب میں کہ بائیں بازو کے بعض عناصر یہ کہتے ہیں کہ ملک میں کمیونسٹ پارٹی کا کوئی وجود نہیں۔ کامریڈ جام ساقی نے کہا، دنیا بھر میں بایاں بازو مزدور طبقے کی مختلف تہوں، مختلف پرتوں سے جنم لیتا ہے۔ ہمارے ملک کا بایاں بازو ان لوگوں پر مشتمل ہے جو کل کمیونسٹ پارٹی میں تھے اور بعد میں یا تو نکال دیئے گئے یا مختلف وجوہ کی بنا پر خود ہی گھر بیٹھ گئے۔ یہی لوگ بعد ازاں حالات کچھ سازگار دیکھ کر یا کسی اور وجہ سے دوبارہ میدان میں آگئے ہیں۔ اب اگر یہ لوگ تسلیم کر لیں کہ کمیونسٹ پارٹی موجود ہے تو پھر انہیں یہ وضاحت بھی کرنا پڑے گی کہ پھر وہ اس پارٹی سے باہر کیوں ہیں۔ جام ساقی نے بتایا کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا حتمی پروگرام سوشلزم ہے تاہم اس مرحلے پر پارٹی نے قومی جمہوریت کا پروگرام پیش کیا ہے۔ اس پروگرام کے اہم نکات یہ ہیں: سامراج سے آزادی کا حصول، قومی حقوق کی بحالی، جاگیرداری کا مکمل خاتمہ، بنیادی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینا، سامراجی سرمایہ ضبط کرنا اور صنعتوں کے کنٹرول میں مزدوروں کو شامل کرنا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کمیونسٹ پارٹی ملک کی بائیں بازو کی قوتوں، قوم پرستوں، جمہوری طاقتوں اور محب وطن سامراج دشمن عناصر کو متحد کرنے کی کوششیں کر رہی ہے۔ پارٹی اس کوشش کی افادیت کے بارے میں لوگوں کو قائل کرنے کی مہم چلا رہی ہے۔ اس ضمن میں اولین کوششیں ہی توقعات سے بڑھ کر کامیاب ثابت ہوئیں اور عوامی نیشنل پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ محب وطن جمہوریت پسند اور سامراج دشمن عناصر اور کمیونسٹوں کی مشترکہ کوششوں سے وجود میں آنے والی یہ پارٹی ملک کی جمہوری سیاسی تاریخ میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

جام ساقی نے فوج کے کردار کے حوالے سے کہا کہ پاکستانی فوج لشکر کشی اور آپریشنز کی عادی ہوگئی ہے۔ وہ ایک افسانوی دیو کی مانند ہے جو ہر وقت اپنے آقا سے کام کا مطالبہ کرتا رہتا ہے اور کام نہ ملنے کی صورت میں آقا ہی کو کھا جانے کی دھمکی دیتا ہے۔ فوج کی قیادت فوج کو مصروف رکھنے کے لیے اسے کسی نہ کسی کام میں لگائے رکھتی ہے کیوں کہ اگر اسے مصروف نہ رکھا گیا تو اس کے ذہن میں یہ خیال آسکتا ہے کہ اس کی قیادت عیش کر رہی ہے۔ چنانچہ فوج کو پہلے مشرقی بنگال میں کام دیا گیا، پھر بلوچستان میں آپریشن کیا گیا اور اب سندھ میں آپریشن ہو رہا ہے۔ صوبہ سرحد کی باری آخر میں آئے گی۔

مزید برآں پاکستانی فوج برٹش انڈیا آرمی کا ایک تسلسل ہے جو بنیادی طور پر ہندوستان کی نوآبادی میں امن و امان قائم کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس نوآبادیاتی فوج یعنی برٹش انڈیا آرمی میں ۴۰ فی صد فوجی پنجابی تھے جب پاکستان بنا اور اسے اس کے حصے کی فوج ملی تو اس میں ۶۰ فی صد پنجابی تھے۔ بعد میں یہ تناسب اور بگڑ گیا اور پنجابی نفری مزید بڑھ گئی۔ اس تناسب کے ساتھ اس فوج سے اور کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

جام ساقی نے طبقاتی کشمکش کے حوالے سے کہا: ''ملک میں طبقاتی کشمکش مزید تیز ہوگئی۔ بائیں بازو کی قوتیں بتدریج متحد ہو رہی ہیں، بائیں بازو سے لوگوں نے توقعات وابستہ کرنا شروع کر دی ہیں۔ اب بائیں بازو کو کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ ملک میں سرمایہ داری اپنی بگڑی ہوئی شکل میں تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ بیرونی سرمایہ بھی پھیل رہا ہے اور یہ عوامل طبقاتی کشمکش کو تیز تر کر رہے ہیں۔ دیہات میں بھی سرمایہ دارانہ رشتے جنم لے رہے ہیں۔ زمیندار بٹائی کے پرانے طریقہ کی جگہ اجرت پر کھیت مزدور رکھ رہے ہیں۔ پرانے سماجی رشتے بدل کر میکانکی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ یہ امر بھی طبقاتی کشمکش کر تیز تر کر رہا ہے۔''

انہوں نے کہا، ''ہماری آبادی کی اکثریت دیہات میں ہے اور کسانوں پر مشتمل ہے جب تک اس آبادی کو حرکت میں نہ لایا جائے، سامراج دشمن جمہوری جدوجہد کامیاب نہیں ہوسکتی۔ دیہات میں سیاسی شعور بڑھ رہا ہے۔ کسان طبقہ بیدار ہو رہا ہے۔ فوجی جنتا بھی اس حقیقت سے واقف ہے اور اس نے اسی بنا پر سندھ میں آپریشن شروع کیا ہے۔ سندھ کے وہ دیہات خصوصی طور

پر فوج کا نشانہ ہیں جہاں کے عوام نے ۱۹۸۳ء اور پھر ۱۹۸۶ء کی سیاسی تحریکوں کے دوران زیادہ سرگرمی اور جذبے کا مظاہرہ کیا۔ اپنے حقوق کے لیے مزدور آج بھی لڑتے ہیں۔ تاہم لڑائی کی شدت اب وہ نہیں جو مارشل لاء سے پہلے تھی۔ مارشل لاء کے تشدد نے ساری ہی آبادی کو غیر فعال کیا۔ مزدور تنظیموں پر حکمرانوں نے وحشیانہ حملے کیے جس سے تنظیمیں کمزور پڑیں۔ چنانچہ مزدور طبقہ بھی متاثر ہوا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ تنظیم اور اجتماع کی شکل میں لوگ خوف زدہ نہیں ہوتے جبکہ افراد خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ مزدور تحریک مجموعی طور پر آگے بڑھی ہے۔ مارشل لاء کی ''بی'' ٹیم جماعت اسلامی ٹریڈ یونین کو حرام قرار دیتی تھی مگر اب وہ بھی مزدور یونینیں بنانے پر مجبور ہے۔''

جام ساقی نے مزید کہا: ''سندھ میں ڈاکوؤں کے تمام گروہوں کا سرغنہ فوج کا ایک بھگوڑا افسر بتایا جاتا ہے، جو اپنا نام طاہر نقاش بٹ بتاتا ہے۔ تاہم ضروری نہیں یہ افسر واقعتاً بھگوڑا ہو، بات کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔ یہ شخص سندھ میں ڈاکوؤں کے تمام بڑے اور چھوٹے گروہوں کے درمیان رابطے کا کام کرتا ہے اور تمام گروہ اس کا احترام کرتے ہیں۔ لطف کی بات ہے کہ سندھ میں سب کو معلوم ہے کہ یہ شخص تمام گروہوں کا سربراہ ہے لیکن اب تک کی اطلاعات کے مطابق نہ تو اس کے خلاف کہیں کوئی ایف آئی آر درج ہے اور نہ کہیں اس کا نام اخبارات وغیرہ میں نظر آتا ہے۔''

جام نے کہا کہ افغان مسئلہ اس روز حل ہو جائے گا جس دن پاکستان کے حکمران اپنے ملک کے مفادات کو سامراجی مفادات پر ترجیح دینے لگیں گے۔ ہمارے حکمران افغانستان میں مداخلت بند کر دیں اور افغان بھگوڑوں کو واپس بھجوا دیں تو یہ مسئلہ آج حل ہو جائے گا۔

کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے بعد سندھ اپنے ہی دریا کے پانی کو ترس جائے گا۔ دریائے سندھ سوکھ جائے گا۔ تاہم اس ڈیم کے منصوبے کو منسوخ کرنا نہ تو جنرل ضیا کے بس میں ہے اور نہ جونیجو کے کیوں کہ اس ڈیم کا منصوبہ امریکہ نے تیار کیا ہے تاکہ پنجاب کو خوش رکھا جا سکے جو سامراج کے منصوبوں پر عمل درآمد کرنے والی فوج کو افرادی قوت فراہم کرتا ہے۔ پاکستانی فوج، امریکہ کے ۲۳ دوست ممالک میں خدمات سرانجام دے رہی ہے اور امریکہ اس فوج کو بہر صورت مطمئن رکھنا چاہتا ہے اور ہر قیمت پر کالا باغ ڈیم تعمیر کرنا چاہتا ہے۔

خود پر ہونے والے تشدد کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے جام ساقی نے کہا، '' مجھے

گرفتاری کے بعد ابتدائی دو ماہ میں خوب مارا پیٹا گیا۔ مونچھوں، قلموں اور بازوؤں کے بال نوچے گئے اور مسلسل کئی کئی دن جگائے رکھا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اذیت دینے والے اہلکار ڈاڑھی کے بال یہ کہہ کر نہیں کھینچتے تھے کہ ڈاڑھی سنت ہے۔ مجھے روزانہ چار کے حساب سے ایک ماہ میں ۱۲۰ انجکشن لگائے گئے جن کے بارے میں بعض افسروں کا کہنا تھا کہ یہ انجکشن سچ بولنے پر مجبور کردیتے ہیں اور سوڈیم پینتھال کے انجکشن ہیں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ یہ انجکشن انسان کو دل شکستہ کرنے، اس کا حوصلہ توڑنے اور اسے مایوسی کی مستقل کیفیت سے دوچار کردینے والی ادویات کے تھے۔ یہ انجکشن لگنے کے بعد شدید چکر آتے تھے اور ڈپریشن محسوس ہوتا تھا۔

کنفیڈریشن کے حامی فرنٹ کا پروگرام ابھی ادھورا اور غیر واضح ہے۔ سامراج، خارجہ پالیسی اور معاشی پروگرام وغیرہ جیسے مسائل پر فرنٹ ابھی خاموش ہے جب تک یہ امور واضح نہ ہوں، اس وقت تک فرنٹ کی جانب اپنے رویے کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ہمیں قومی حقوق ملنا چاہئیں۔ تاہم اگر یہ قوم پرست حضرات قومی حقوق کے ساتھ سامراج دشمن پروگرام میں بھی شریک ہو جائیں تو یہ بڑی کامیابی ہوگی۔ ہم اسے کوئی نقصان نہیں سمجھیں گے۔

مہاجر قومی موومنٹ کو زیرِ بحث لاتے ہوئے جام ساقی نے کہا کہ ''میرے خیال میں مہاجر اب مہاجر نہیں رہے۔ انہیں اب یہیں رہنا ہے۔ انہیں اور کسی جگہ نہیں جانا اب وہ اس دھرتی کے باسی ہیں۔ قومیت کے حوالے سے میری رائے میں وہ یا تو سندھی نیشنل ازم کی راہ اختیار کر سکتے ہیں یا پھر ایک ثقافتی اقلیت کے طور پر اپنا حصہ مانگ سکتے ہیں۔''

جام ساقی ابھی ہسپتال میں ہی تھے جب انہوں نے کراچی کے خونریز فسادات میں زخمی ہونے والے افراد کی جناح ہسپتال میں عیادت کی۔ جام ساقی تمام زخمیوں سے فرداً فرداً ملاقات کے لیے ہسپتال کے مختلف وارڈوں میں گئے۔ انہوں نے زخمیوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ملک کے مختلف حصوں میں اٹھنے والی عوام کی جمہوری جدوجہد کو سبوتاژ کرنے اور محنت کش طبقات کی یکجہتی کو کچلنے کے لیے حکمران طبقہ سازشوں کی ذریعہ عوام کو آپس میں لڑا کر کراچی کو ایک اور بیروت میں تبدیل کر رہا ہے۔ انہوں نے کراچی کے عوام اور محنت کشوں سے اپیل کی کہ وہ سامراجی سازشوں سے خبردار رہتے ہوئے اپنے اصل دشمن کو پہچاننے کی کوشش کریں جو مزدوروں کے ہاتھوں

خوداس کے طبقے کے افراد کا خون کرواتا ہے تا کہ اپنے مذموم مقاصد پورے کر سکے۔

ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد کامریڈ جام ساقی اپنے گاؤں اور سندھ کے دیگر علاقوں میں گئے جہاں ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ انہوں نے اپنے خطابات میں شہید نذیر عباسی کی عظیم قربانی کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا اور سندھی عوام اور سندھ کے سیاسی کارکنوں کی جدوجہد کو بھرپور طور پر سراہا۔ انہیں ملک بھر، خصوصاً پنجاب کا دورہ کرنے کی دعوت دی جارہی تھی۔ چنانچہ ۱۹ فروری ۱۹۸۷ء کو جب وہ سکھر سے لاہور ریلوے سٹیشن پہنچے تو وہاں موجود سیاسی کارکنوں، مزدوروں، طالبعلموں اور خواتین نے ان کا نہایت ہی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ جام ساقی جو سندھی ٹوپی اور اجرک پہنے ہوئے تھے۔ وہ جب ریلوے سٹیشن سے باہر آئے تو وہاں موجود سیکڑوں کارکنوں نے سرخ جھنڈے لہرا کے ان کا انتہائی گرم جوشی سے استقبال کیا اور نعرے لگائے۔ ان کے استقبال کے لیے ملک محمد قاسم، راؤ عبدالرشید، شیخ رفیق احمد، سید افضل حیدر، اعتزاز احسن، چوہدری لیاقت حسین اور دیگر کئی سیاسی رہنما موجود تھے۔ جام ساقی کے ہمراہ پروفیسر جمال نقوی، امداد چانڈیو، اور دیگر ہاری رہنما بھی لاہور آئے۔ جام ساقی جب لاہور سٹیشن پر پہنچے تو بائیں بازو کی متعدد تنظیموں نے ان کا خیر مقدم کیا اور امریکہ کے خلاف نعرے لگائے۔ مظاہرین نے امریکی جھنڈوں کو آگ لگائی۔ جو نعرے لگائے گئے، وہ یہ تھے تنھنجو ساتھی منھنجو ساتھی جام ساقی جام ساقی، انقلابی انقلابی جام ساقی وغیرہ۔ اس موقع پر پیپلز پارٹی کی طرف سے سینئر وائس چیئرمین شیخ محمد رشید کو جلوس کے دوران جام ساقی سے ملوانے کے لیے خصوصی اہتمام کیا گیا اور بائیں بازو کی تنظیموں نے جام ساقی کے ساتھ بابائے سوشلزم شیخ رشید کے نعرے بھی لگائے جب کہ ملک قاسم کے گرد جمع ہو کر اے این پی اور مزدور یونینوں کے کارکنوں نے اسلامی جمعیت طلبہ کے جلسہ میں ان کے تقریر کرنے کے خلاف نعرہ بازی بھی کی۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے جلسہ میں راؤ رشید کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے اے این پی کے ایک لیڈر نے راؤ رشید سے کہا، ''چن کتھاں گزاری آئی رات وے۔'' پیپلز پارٹی کی بعض خواتین کارکنوں نے بینظیر کے ساتھ جام ساقی کا نعرہ بھی لگایا لیکن دوسری طرف بعض کارکنوں نے یہ نعرے بھی لگائے، ''بینظیر افغان مجاہدین کی حمایت بند کرو۔'' جام ساقی نے ریلوے سٹیشن کے باہر پنجابی زبان میں تقریر کی۔ ریلوے

سٹیشن پر تقریر کرتے ہوئے جام ساقی نے کہا کہ آج میں پنجاب کے جن بھائیوں کے درمیان کھڑا ہوں یہ وہ پنجابی نہیں ہیں جو سندھ میں تشدد کرنے جاتے ہیں بلکہ یہ وہ عوام ہیں جو بلھے شاہ کے پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں پنجاب کے غیرت مند عوام کے محبت اور خلوص کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

دریں اثنا جام ساقی استقبالیہ کمیٹی کے صدر اور بزرگ سیاست دان محمود علی قصوری کی طرف سے اپنے اعزاز میں دیئے گئے استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے جام ساقی نے عوام پر زور دیا کہ وہ ملک میں جمہوریت کی بحالی کے لیے جدوجہد کریں۔ انہوں نے کہا کہ دیگر صوبوں کے عوام کی نظریں پنجاب پر ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ جمہوریت کے لیے چلائی جانے والی جدوجہد کی قیادت پنجاب کرے۔ انہوں نے کہا کہ جمہوریت کی بحالی کے لیے پنجاب اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

اگلے روز ۲۰ فروری کو سیاسی اسیران رہائی کمیٹی نے انہیں استقبالیہ پیش کیا۔ فرید کوٹ پارک میں اپنے اعزاز میں دیئے گئے استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے انقلابی رہنما جام ساقی نے کہا کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پاکستان کے عوام نے سوشلزم کے حق میں ووٹ دے کر ثابت کر دیا تھا کہ یہی نظریۂ پاکستان ہے۔ اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے۔ مذاہب کو جغرافیائی حدود میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ جماعت اسلامی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جب پاکستان بنانے کے لیے تحریک چل رہی تھی تو یہ جماعت پاکستان کی مخالفت کرتی تھی مگر اب وہ پاکستان اور نظریہ پاکستان کی چیمپئن بنی ہوئی ہے۔ جام ساقی نے کہا کہ جب تک ہمارے ملک سے امریکہ کو نکال باہر نہیں کیا جائے گا، یہاں حقیقی جمہوریت، عوام کی حکمرانی اور بنیادی حقوق بحال نہیں ہو سکیں گے۔ پاکستان کو بچانے کے لیے ناگزیر ہو گیا ہے کہ ملک بھر کے غریب مزدور، کسان، دانشور اور طالب علم متحد ہو جائیں، تمام علاقوں کے مظلوم طبقات ایک دوسرے کے دکھ درد کو محسوس کریں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس ملک میں ظالموں، چوروں اور لٹیروں کی برادری متحد ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے مظلوموں کو بھی متحد ہونا پڑے گا۔ ملک میں فوج کا کردار بھی پولیس کی طرح کا ہے۔ انگریزوں نے برصغیر کے لوگوں کو دبا کر رکھنے کے لیے فوج بنائی تھی۔ پاکستانی فوج بھی اب تک اپنے ہی عوام کو کچلنے کا کردار ادا کر رہی ہے۔ قوم پر مسلط حکمرانوں نے اپنے مفادات کے لیے پاکستان کی سلامتی کو داؤ پر لگا دیا

ہے۔حکمرانوں نے کراچی میں امریکہ کو اڈا دے دیا ہے، گوادر پہلے ہی امریکہ کو دے رکھا ہے۔اب بلوچستان میں ۴۶ مقامات پر امریکہ کو اڈے دیئے جا رہے ہیں۔ جام ساقی نے اپنے دورۂ پنجاب کے مقصد کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہم آپ کے پاس ان سب لوگوں کو سلام کرنے آئے ہیں جو قبروں میں ہیں مگر پھر بھی زندہ ہیں اور انہیں بھی جو ہمارے ساتھ جدوجہد میں شریک ہیں۔ہمیں کچلنے والی نوکر شاہی بھی پنجاب کی پیدا کردہ ہے، اسی پنجاب میں ہماری رہائی کے لیے جدوجہد کرنے والی کمیٹی بھی قائم ہوئی۔ آزادی، جمہوریت اور حقوق کے لیے قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔اب ہمیں بھی وہ قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ پاکستان کو بنے ہوئے ۴۰ سال ہو گئے ہیں مگر عوام کو اب تک یہ معلوم نہیں کہ آئین اور ووٹ کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر حکومت افغانستان کے ساتھ براہِ راست معاملات طے کرلے تو افغان مہاجرین کے ساتھ ہیروئین اور کلاشنکوف سے بھی ہماری جان چھوٹ سکتی ہے۔فوج کی مداخلت اور بالادستی کا ذکر کرتے ہوئے جام ساقی نے کہا کہ جناب بھٹو نے ایک جلسہ عام میں کہا تھا کہ میں حمود الرحمان کمیشن رپورٹ شائع کرنا چاہتا ہوں مگر جرنیل ایسا نہیں چاہتے ہیں۔ میں جام ساقی کو رِہا کرنا چاہتا ہوں لیکن جرنیل نہیں چاہتے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ جرنیلوں سے زمینیں چھین کر عوام میں تقسیم کی جائیں، زرعی اور صنعتی اصلاحات کی جائیں۔ سیاسی اسیران رہائی اور امداد کمیٹی کے کردار کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جب تک جمہوریت کی جدوجہد کامیاب نہ ہو، کمیٹی کو قائم رہنا چاہیے۔

ملک قاسم نے تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جام ساقی کا یہاں آنا پنجاب کی عزت افزائی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات غلط ہے کہ ظالم صرف پنجابی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ظالموں کی ایک نسل ہے جو پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان میں بھی پائی جاتی ہے۔ چوں کہ پنجاب کی آبادی زیادہ ہے، اس لیے یہاں ظالم بھی زیادہ ہو سکتے ہیں۔مگر جونیجو، پیر پگاڑا، کھوڑو، ارباب اور جام صاحب لسبیلہ تو پنجابی نہیں ہیں جب تک سندھی، پنجابی، پٹھان اور بلوچ ایک جان نہیں ہوں گے، نہ پاکستان باقی رہ سکتا ہے اور نہ عوام کو حقوق مل سکتے ہیں۔

عوامی شاعر حبیب جالب نے اس موقع پر اپنی نظمیں سنائیں۔تقریب سے امداد چانڈیو اور سیاسی اسیران کمیٹی کے سیکریٹری چوہدری لیاقت حسین وڑائچ نے بھی خطاب کیا۔ ملک معراج

خالد، رفیق احمد شیخ، پرویز صالح، افضل حیدر، عبدالرشید قریشی، حسین نقی، حفیظ قریشی، میاں احسان الحق، بیگم عابدہ ملک، نرگس اعوان، عارف خان اور پنجاب اسمبلی کے رکن فضل حسین راہی نے بھی شرکت کی۔ پیپلز پارٹی کے مرکزی سیکریٹری اطلاعات رفیق احمد شیخ نے اس رات جام ساقی کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ جام ساقی نے پیپلز پارٹی کے رہنما شیخ رشید احمد کی رہائش گاہ پر جا کران سے ملاقات بھی کی۔

جام ساقی کا دورہء پنجاب، نہ صرف اہل پنجاب کے لیے بلکہ خود کامریڈ جام ساقی کے لیے انتہائی یادگار رہا۔ انہوں نے لاہور میں اور بھی کئی تقریبات سے خطاب کیا۔ وہ قصور، راولپنڈی اور پنجاب کے دیگر شہروں میں بھی گئے۔ لاہور میں انجمن جمہوریت پسند خواتین نے بھی ان کے اعزاز میں استقبالیہ دیا، جس میں طاہرہ مظہر علی، نسیم شمیم اشرف ملک اور انجمن کی دیگر خواتین پیش پیش تھیں۔ اپنے خطاب میں انہوں نے پنجاب کی انقلابی خواتین کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ لاہور میں ہی عالمی پنجابی کانگریس نے کامریڈ جام ساقی کے دورہء پنجاب کو سندھ، پنجاب یکجہتی کا مظہر قرار دیا۔ جام ساقی نے کہا کہ گذشتہ اور موجودہ مارشل لاء کے تاریک دور میں بعض پنجابی ادیبوں نے جس جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کیا ہے، وہ پنجاب کے عمومی ماحول کے تناظر میں انتہائی قابلِ قدر ہے۔ انہوں نے ڈسٹرکٹ بار کونسل قصور کے قانون دانوں سے بھی خطاب کیا۔

جام ساقی ۲ مارچ کو راولپنڈی پہنچے جہاں انہوں نے اپنے تین روزہ قیام کے دوران مختلف تقریبات سے خطاب کیا۔ ایم آر ڈی کی رکن جماعتوں اور ٹریڈ یونینوں کی دعوت پر وہ ان کے اجلاس میں بھی شریک ہوئے۔ کامریڈ جام ساقی نے ان کارکنوں کے گھروں پر جا کر تعزیت کی جنہیں مارشل لاء کے دور میں بحالی جمہوریت کی تحریک میں حصہ لینے پر پھانسیاں دی گئی تھیں۔ کامریڈ جام ساقی کی سیاسی سرگرمیوں میں تیزی اور شدت آتی گئی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ عوام پر بڑھتا ہوا ظلم اور سماجی ناانصافیوں میں مسلسل اضافہ خود پاکستان کی سلامتی کا سوال پیدا کر سکتا ہے۔

۱۰ اپریل ۱۹۸۷ء کو عثمان پارک، لیاری میں ایک بڑے جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے جام ساقی نے لیاری کو پاکستان کا سٹالن گراڈ قرار دیا۔ ان کی تقریر سے قبل وہاں امریکی پرچم کو نذرِ آتش کیا گیا اور فلک شگاف نعرے لگائے گئے۔ جام ساقی نے کہا کہ اگر اب ملک میں سماجی

تبدیلی نہ آئی تو پھر جغرافیائی تبدیلی آئے گی اسے کوئی نہیں روک سکے گا۔ لہٰذا بہتر ہے کہ قومیتوں کے حقوق تسلیم کر کے یہاں سماجی تبدیلی کی راہ ہموار کی جائے تا کہ ملک کو بچایا جا سکے۔ انہوں نے کہا کہ اب یہ فارمولا پرانا ہو چکا ہے کہ چار محکموں کے سوا باقی محکمے صوبوں کے حوالے کر دیئے جائیں۔ نئے حالات کے پیش نظر یہ ۳۰ سالہ پرانا فارمولا بیکار ہو چکا ہے اب قوموں کو حق خود ارادیت دینا ہوگا اور ان کی آزاد یونین بنانی ہوگی۔ جام ساقی نے لیاری کو پاکستان کا سٹالن گراڈ قرار دیا اور بحالی جمہوریت کے لیے لیاری کے جیالے عوام کو شاندار خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ جب تک عوامی دباؤ نہیں بڑھے گا، اس ملک میں انتخابات ہرگز نہیں ہوں گے خواہ ۱۹۹۰ء کیوں نہ گزر جائے۔ اگر آج عوام انتخابات کرانے کے لیے اپنا دباؤ بڑھا دیں تو اسی سال ۸۷ء ختم ہونے سے پہلے پہلے انتخابات ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ ملک جنرلوں کے لیے نہیں بنایا گیا۔ انہوں نے پاکستان قائم کرنے کے لیے ٹینک نہیں چلائے۔ پاکستان آسمان سے نہیں آیا بلکہ صوبہ سرحد، پنجاب، بلوچستان اور سندھ کے عوام نے مل کر آپس میں ایک معاہدہ کیا تھا اور ملک بنانے کے لیے جدوجہد کی تھی۔ پاکستان بنانے میں ان جنرلوں نے کوئی کردار ادا نہیں کیا لیکن یہ ملک بنانے والوں سے پوچھتے ہیں کہ وہ حکومت کو کتنے اختیارات دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا آخر ہمارے بنگالی بھائی بھی تو اپنے حقوق ہی مانگ رہے تھے لیکن انہوں نے انہیں ان کے حقوق نہ دیئے اور ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔ اب اگر ہم پاکستان میں رہیں گے تو برابر کی حیثیت سے رہیں گے یہاں سامراج اور ان کے دلالوں نے اس وقت تک کوئی آئین نہ بننے دیا جب تک کہ ۵۶ء میں بنگالیوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے اور ون یونٹ مسلط کرنے کے ساتھ ساتھ بڈ بیر میں امریکی ہوائی اڈے کے لیے مزید دس سال کی توسیع حاصل نہ کر لی۔ افغانستان پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہمارے حکمران ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے ہیں کیوں کہ افغانستان میں قومی جمہوری انقلاب آ چکا ہے جو اگر ایک بار آ جائے تو پھر کبھی واپس نہیں ہوتا۔ مسلح افواج کی تعداد کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ ہندوستان کی آبادی ۸۰ کروڑ اور فوج ۱۰ لاکھ ہے لیکن ہماری آبادی ۹ کروڑ اور فوج چھ لاکھ ہے۔ ہمارا گھر تو بہت چھوٹا ہے، ہم اتنے چوکیدار نہیں رکھ سکتے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر فوج میں چاروں صوبوں کے افسر اور جوان ہوتے تو یہاں بار بار مارشل لاء نہیں لگ سکتا تھا اور اگر ہمارے امریکہ کے ساتھ

تعلقات نہ ہوتے تو بھی ہم مارشل لاء سے محفوظ رہتے، ہمارا اسی فیصد بجٹ دفاع کے لیے ہے یہ بہت بڑی ناانصافی ہے۔ یہ فوج ملک کے لیے ہے، ملک فوج کے لیے نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ بہت سارے جنرل ریٹائر ہو رہے ہیں لیکن ضیاالحق ریٹائرمنٹ کی عمر کو نہیں پہنچتا ہمیشہ 'بالی عمریا' میں ہی رہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں جونیجو کے خلاف کچھ کہنا نہیں چاہتا کیوں کہ میں 'تارا مسیح' کی سطح تک نہیں جانا چاہتا۔

جام ساقی نے کہا کہ اس وقت ۸۰ لاکھ افراد بے روزگار ہیں۔ انہوں نے اپنے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ صوبہ سندھ میں انتقال آبادی کی روک تھام ہونی چاہیے، خواہ پرمٹ سسٹم کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو۔ انہوں نے کراچی میں امریکی بحری بیڑہ کی آمد پر بھی کڑی تنقید کی اور کہا کہ اس کا مطلب عوام کو صرف یہ بتانا ہے کہ تمہیں کچلنے کے لیے امریکہ بھی ہمارے ساتھ ہے لیکن اب جنرل ضیاالحق اپنے پیروں سے زمین سرکتی ہوئی محسوس کر رہے ہیں۔ انہوں نے کراچی اور سندھ کے دیگر علاقوں میں ہونے والے حالیہ خونی فسادات کو حکومت کی سازش قرار دیا اور کہا امریکہ چاہتا ہے کہ کراچی کو فری پورٹ بنا کر یہاں بحری اڈا بنایا جائے تاکہ اس کے فوجی فلپائن کی طرح یہاں عیاشیاں کر سکیں۔ سرمایہ دار بھی اس سازش میں ملوث ہیں کیوں کہ اگر کراچی ''فری پورٹ'' ہو گیا تو انہیں ٹیکس نہیں دینا پڑے گا۔ جام ساقی نے صنعتی اداروں میں ٹھیکیداری نظام کی مذمت کی اور کہا کہ جب تک ہم متحدہ نہ ہوں گے اپنے حقوق حاصل نہ کر سکیں گے۔ اور یہاں سے سامراج کو بھگائے بغیر کبھی جمہوریت نہیں آسکتی۔ جام ساقی نے نویں ترمیمی بل اور شریعت بل پر بھی سخت الفاظ میں تنقید کی۔ اسی اجلاس میں قومی محاذ آزادی کے چیئرمین معراج محمد خان نے کہا پورا ملک امریکی سامراج کی گرفت میں ہے جس کی وجہ سے یہاں کے عوام بے انتہا مسائل کا شکار ہیں۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ حکمرانوں کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ہماری سرحدیں غیر محفوظ ہیں۔ افغان حکومت کے خلاف حکومت کی جارحانہ پالیسی کی وجہ سے آئے دن بمباری ہو رہی ہے اور بھارت کی فوج اب بھی بڑی تعداد میں پاکستانی سرحدوں پر موجود ہے۔ انہوں نے کہا، لیکن یہ صدی محکوم اقوام کی آزادی کی صدی ہے، اسی لیے پاکستان میں بھی جلد ہی مظلوم طبقات انقلاب لانے میں کامیاب ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان کی حکومت کو فی الفور تسلیم کیا جائے اور سامراج سے فوجی معاہدے ختم

کیے جائیں۔ سندھ پر مزید جبر و تشدد برداشت نہیں کیا جائے گا اور سندھ کی جو زمینیں نوکر شاہی کو الاٹ کی گئی ہیں، وہ یہاں کے کسانوں میں تقسیم کی جائیں۔

عوامی نیشنل پارٹی کراچی کے صدر علاؤالدین خان نے کہا کہ اے این پی جبر اور طبقاتی استحصال کے خلاف جدوجہد کر رہی ہے اور وہ اس جدوجہد میں جام ساقی کو بھی اپنے مکمل تعاون کا یقین دلاتی ہے۔

۱۹ اگست ۱۹۸۷ء کو شہید نذیر عباسی کی ساتویں برسی کے موقع پر ڈی ایس ایف کے زیر اہتمام خیر پور میں ایک بڑے اجتماع کا اہتمام کیا گیا جس میں کامریڈ جام ساقی بھی شریک ہوئے۔ ان کا خطاب حاصل جلسہ تھا۔ جام ساقی نے کہا کہ پاکستان نوآبادیاتی نظام کا شکار ہے جسے فوجی ٹولے بھی شکارگاہ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں اور یہ ملک امریکی سامراجیوں کے شکنجے میں بری طرح جکڑا جا چکا ہے جام ساقی نے کہا کہ اس ملک کی فوج نے سابقہ مشرقی پاکستان میں ۳۰ لاکھ بنگالیوں کا قتل عام کیا اور اس طرح مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور پھر فوج نے بلوچستان میں تین مرتبہ بلوچیوں کی نسل کشی کے لیے فوجی کارروائی کی۔ ملتان میں کھلے عام مزدوروں پر گولیاں برسائی گئیں۔ اور اب سندھ میں سندھیوں کا قتل عام کیا جا رہا ہے۔ پورے سندھ کو فوجی چھاؤنیوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ جام ساقی نے کہا کہ شہید نذیر عباسی وہ انقلابی کارکن تھا جسے فوجیوں نے کوئٹہ کے ٹارچر کیمپوں میں اذیتیں دیں۔ فوجیوں نے شہید نذیر عباسی کو بتا دیا تھا کہ اگر اس نے انقلابی سیاست کی راہ نہ چھوڑی تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ سندھ ہائی کورٹ میں شہید نذیر عباسی کا حلفیہ بیان آج بھی موجود ہے۔ انہوں نے کہا کہ شہید نذیر عباسی جیسے انقلابی ہمارے دوست ہیں اور ہمارے کامریڈ ساتھی ہیں۔ زکواۃ پر پلنے والے مولوی ہرگز ہمارے دوست نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ شہید نذیر عباسی چھوٹی سی عمر میں مرکزی کمیونسٹ پارٹی کے رکن بن چکے تھے۔ ایشیا بھر میں یہ پہلی مثال ہے۔ کمیونسٹ رہنما جام ساقی نے کہا ۱۹۵۴ء میں ملک میں پہلی مرتبہ فوجی ٹولے اور امریکی سامراج نے اپنے ناپاک قدم جمائے تھے اور اس وقت پہلی مرتبہ کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگائی گئی تھی لیکن ملک بھر کے ترقی پسند ساتھیوں نے نیشنل عوامی پارٹی بنالی۔ انہوں نے کہا کہ یہ میرا ایمان ہے کہ اگر نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی نہ لگتی تو بھٹو کو پھانسی

کبھی نہ ہوتی۔فوجی حکمرانوں کو یہ خوف تھا کہ نیشنل عوامی پارٹی اقتدار میں آجائیگی۔انہوں نے برملا طور پر اس بات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سول حکومت ہی بےنظیر بھٹو کی زندگی کی ضمانت دے سکتی ہے۔دوسری صورت میں ان کی زندگی خطرے میں رہے گی اور فوجی ٹولہ انہیں بھی کہیں زندگی سے دور نہ کردے۔ جام ساقی نے کہا کہ پاکستان میں کئی قومیں آباد ہیں۔ اگر ان قوموں کو حقِ خودارادیت نہیں مل جاتا تو وہ علیحدگی کی راہ اپنائیں گی۔اگر اس ملک کو برقرار رکھنا ہے تو اسے رضاکارانہ طور پر قائم رکھا جاسکتا ہے۔بندوق اور جبر کے زور پر اس ملک کو باقی رکھنا مشکل ہے۔ امریکہ، پاکستان کو بیروت بنانا چاہتا ہے۔اب سنا جارہا ہے کہ محرم میں شیعہ سنّی فسادات کرانے کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔لوگ اس بات سے خبردار رہیں۔جب سے فوجی ٹولہ اقتدار میں ہے۔سندھ کو فوجی تسلط میں دے دیا گیا ہے۔ پنوں عاقل، موہنجوداڑو اور تھر جیسے علاقوں میں فوجی چھاؤنیاں قائم کی جارہی ہیں اور سندھی لوگوں کی نسل کشی کے انتظامات کیے جارہے ہیں۔انہوں نے کہا کہ فوجی ٹولے نے ہی ملک کو توڑا ہے۔اب بھی ملک توڑنے میں فوجیوں کا ہاتھ ہوگا۔

جام ساقی نے سندھ میں ملازمتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سندھ میں فوجیوں کے رشتے داروں کو نوکریاں دی جاتی ہیں اور دوسری صورت میں جناب رشوت علی کے طفیل نوکریاں ملتی ہیں۔ انہوں نے الزام عائد کیا کہ سندھ کے وزیر اعلیٰ سید غوث علی شاہ اور ان کا لڑکا سید شبیر شاہ بھاری رقمیں لے کر سندھیوں کو نوکریاں دیتے ہیں۔ جام ساقی نے کہا کہ اسلام جیسا سیکولر مذہب اس دنیا میں کوئی اور نہیں ہے یہ روایتی ملاؤں کا مذہب نہیں ہے۔ جام ساقی نے اپنی تقریر میں کہا کہ ۱۹۹۰ء تک فوجی ٹولہ انتخابات نہیں کرائے گا۔ابھی تو ۹۰ دن کا وعدہ بھی پورا نہیں کیا گیا۔انہوں نے کہا کہ عوام کو اپنا طریقہ کار اپنا کر انقلاب لانا ہوگا۔ ورنہ فوجی ٹولے سے جان چھڑانا مشکل ہے۔انہوں نے کہا کہ ہمارے فوجی امریکہ کے مفادات کے لیے ۲۳ ملکوں میں ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے جاگیرداری نظام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جاگیردار کون ہیں جن کے پاس لاکھوں ایکڑ اراضی ہے۔انگریزوں سے وفاداری کے صلے میں انہیں یہ اراضی ملی ہے۔انہوں نے کہا کہ فوجی ٹولے اور نوکر شاہی ٹولے کے سہارے پر جاگیردار لاکھوں ایکڑ اراضی پر قابض ہیں۔

دریں اثنا شہید نذیر عباسی کی ساتویں برسی کے موقع پر ڈی ایس ایف کے مرکزی صدر

امداد چانڈیو نے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ شہید نذیر عباسی کو تشدد اور اذیت کے ذریعے شہید کیا گیا۔ شہید حسن ناصر کی طرح اس کی لاش عزیزوں کو نہیں دی گئی۔ اور انہیں سخی حسن کے قبرستان میں چوری چھپے دفن کر دیا گیا۔ نذیر عباسی کے خون کو چھپانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن آج شہید نذیر عباسی کی تنظیم ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن زندہ ہے۔ یہ ایک تحریک ہے جسے آمریت کچل نہیں سکتی۔ انہوں نے کہا کہ شبیر شر، احمد کمال وارثی اور گھنشام پرکاش جیلوں میں بند ہیں۔ انہوں نے کہا کہ شہید نذیر عباسی کے کامریڈ ساتھیوں کو کوڑوں کی سزائیں دی گئیں۔ اور ہمارے ساتھیوں کے لیے پھانسی گھاٹ سجائے گئے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت پورا ملک سینٹرل جیل بن چکا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان جمہوریت کے ذریعے رضا کارانہ طور پر تو قائم رہ سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ ملک مختلف قومیتوں، مختلف زبانوں کا ملک ہے۔ پاکستان پر حکومت کرنے کے حقدار صرف اور صرف غریب عوام ہیں، فوجی ٹولہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ سندھ کے قومی وجود کو ختم کرنے کے لیے فوجی آپریشن کیے جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم خوشحال خان خٹک کا سرحد، بھگت سنگھ اور دادا امیر حیدر اور بلھے شاہ اور خواجہ غلام فرید کے پنجاب کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور سرائیکی زبان اور سرائیکی صوبے کے قیام کو تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ڈی ایس ایف مضبوط مرکز کی حامی نہیں ہے۔ اور نہ ہی ہمیں مضبوط مرکز کی ضرورت ہے۔ امداد چانڈیو نے مہاجر قومی موومنٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ سندھ میں جو بھی آباد ہے وہ سندھی ہے خواہ وہ اردو ہی کیوں نہ بولتا ہو۔ انہوں نے کہا کہ مہاجروں کو چاہیے کہ وہ یوپی سی پی کو بھول جائیں اور سندھ کی ثقافت، تہذیب اور تمدن کو اپنائیں۔ انہوں نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ سندھ کو دو قومی صوبہ ہرگز نہیں بننے دیا جائے گا اور ہم سندھ کو دو قومی صوبہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔ ہم مہاجر صوبے کو ماننے پر ہرگز تیار نہیں ہیں۔ ہم کراچی کو سندھ سے علیحدہ نہیں ہونے دیں گے۔ جلسہ سے لیاقت علی شر ایڈووکیٹ لالہ شاہ محمد درانی، مولا بخش، علی حسن جمالی اور محمد خان سولنگی نے بھی خطاب کیا۔

ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن کنونشن سے خطاب کرتے ۱۳۱کتوبر ۱۹۸۷ء کو جام ساقی نے کہا کہ طلباء کو چاہیے کہ وہ قومی حقوق بشمول حقِ خود ارادیت کے حصول کے لیے جدوجہد کو مربوط کریں کیوں کہ آج اس ملک کو اس کی انتہائی ضرورت ہے۔ وہ آج اردو آرٹس کالج میں ڈیموکریٹک

سٹوڈنٹس فیڈ ریشن (علی حسن چانڈیو گروپ) کے سہ روزہ کونسل سیشن کے پہلے افتتاحی اجلاس سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ڈی ایس ایف ایک انقلابی تنظیم ہے جس نے اپنا رشتہ نہ صرف طلبہ تحریک بلکہ مزدور تحریک سے بھی استوار کر رکھا ہے۔ انہوں نے ڈی ایس ایف کے کارکنوں پر زور دیا کہ وہ طلبا کے مسائل پر زیادہ سے زیادہ متحرک ہونے کے ساتھ دیگر مظلوم طبقات کے مسائل پر بھی توجہ دیں۔ انہوں نے ڈی ایس ایف کے نومنتخب عہدیداروں کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ یہ نوجوان طالب علم طبقاتی معاشرے کے خاتمے میں اور قومی جمہوری انقلاب کے مرحلے میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں گے۔ ڈی ایس ایف کے نومنتخب چیئرمین علی حسن چانڈیو نے کہا کہ طلبا کو اپنی جدوجہد کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ مربوط کرنی چاہیے کیوں کہ طلبا انقلابی کردار تو ادا کر سکتے ہیں لیکن تنہا انقلاب نہیں لا سکتے۔ انہوں نے سندھ میں فوجی آپریشن، معصوم افراد کا ڈاکوؤں کے نام پر قتل عام کرنے، کالا باغ ڈیم تعمیر کرنے، بلوچستان میں امریکی اڈے قائم کرنے، پنجاب میں بموں کے دھماکوں اور ترقی پسندوں کی گرفتاری کی مذمت کی۔ انہوں نے کہا کہ کنونشن نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ڈی ایس ایف پہلے سے کہیں زیادہ مظبوط، منظم اور متحرک ہے اور اس کے توڑنے کی سازش کرنے والوں کو منہ کی کھانا پڑے گی۔ انہوں نے کہا کہ ڈی ایس ایف کا اوّلین فریضہ یہ ہوگا کہ ہم تمام جمہوری ترقی پسند محبِ وطن طلباء تنظیموں کا ایک مضبوط اتحاد قائم کر کے طلبا تحریک اور سامراج دشمن جمہوری تحریک کو پروان چڑھائیں۔ قومی محاذ آزادی کے جنرل سیکریٹری اقبال حیدر نے کہا کہ میں ڈی ایس ایف کے ساتھیوں کو اپنے سے الگ نہیں سمجھتا کیوں کہ ہمارا دشمن ایک ہے۔ اس لیے ہمیں متحد ہو کر جدوجہد کرنی چاہیے۔ کونسل سیشن کے اختتامی اجلاس میں ریلوے ورکرز یونین کے منظور رضی، ورکرز فیڈریشن کے سینئر نائب صدر جاوید شکور، ڈیموکریٹک لیبر فیڈریشن کے ملک انور، سندھ ہاری کمیٹی کے جوائنٹ سیکریٹری مسرور چانڈیو کے علاوہ این ایس ایف کے مرکزی رہنما محمد فاروق، پی ایس ایف کے خورشید احمد، این ڈی ایس او کے نور آشکانی، نیشنل یوتھ کے فیاض، ڈیموکریٹک یوتھ آرگنائزیشن کے ملک ناصر اور وطن دوست سٹوڈنٹس فیڈریشن کے مرکزی رہنما منان بروہی نے بھی شرکت کی۔ تقریب کے مہمان خصوصی کامریڈ جام ساقی نے ڈی ایس ایف کے نومنتخب عہدیداروں سے حلف لیا۔ ڈی ایس ایف کے مرکزی کونسل سیشن کے موقع پر انٹرنیشنل یونین

آف سٹوڈنٹس کے سیکریٹریٹ ورلڈ فیڈریشن آف ڈیموکریٹک یوتھ کے مرکزی سیکریٹریٹ، آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن، سٹوڈنٹس فیڈریشن آف انڈیا، آل انڈیا یوتھ فیڈریشن، بنگلہ دیش سٹوڈنٹس یونین، نیپال سٹوڈنٹس آرگنائزنگ کمیٹی آف ڈی ایس ایف سوویت یونین، آرگنائزنگ کمیٹی آف ڈی ایس ایف چیکوسلواکیہ، آرگنائزنگ کمیٹی آف ڈی ایس ایف بلغاریہ اور آرگنائزنگ کمیٹی آف ڈی ایس ایف سویڈن نے مبارک باد کے پیغامات بھیجے جو پڑھ کر سنائے گئے۔

اس سے ایک ماہ قبل ۲۹ ستمبر کو جام ساقی نے سندھ ہاری کمیٹی کے مرکزی کنونشن کی بھی صدارت کی جس میں پیپلز پارٹی کے رہنما شیخ محمد رشید نے کہا کہ امریکہ، بھٹو کا قاتل ہے۔ انہوں نے کہا کہ جاگیرداری کو ختم کیے بغیر ملک میں جمہوریت نہیں آسکتی۔ قومی محاذ، آزادی کے سربراہ معراج محمد خان نے کہا کہ میں سندھی ہوں، سندھ کی خدمت کرتا رہوں گا۔ اور یہ کہ سندھ اور پاکستان کو امریکی اڈا بننے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ کنونشن نے جام ساقی سمیت سندھ ہاری کمیٹی کی سینٹرل کمیٹی کے تیس ارکان کا بھی انتخاب کیا۔ اجلاس سے ڈاکٹر اعزاز نذیر، ارباب غلام حسین اور دیگر نے بھی خطاب کیا۔

۲۲ جنوری ۱۹۸۸ء کو کامریڈ جام ساقی عظیم پشتون رہنما خان عبدالغفار کی آخری رسوم میں شرکت کے لیے جلال آباد (افغانستان) تشریف لے گئے۔ جہاں انہوں نے انقلابی افغانستان کے صدر ڈاکٹر نجیب اللہ سے خصوصی ملاقات بھی کی۔ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مرکزی کمیٹی کے رکن اور ہاری رہنما جام ساقی نے اس ملاقات کے بعد اپنے اخباری بیان میں کہا کہ افغانستان کی موجودہ قیادت (جنوری ۱۹۸۸ء) مسئلہ افغانستان کو اسی سال حل کرنا چاہتی ہے۔ افغانستان کی انقلابی حکومت نے پاکستان کے روشن خیال اور انصاف پسند عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنے حکمرانوں پر نظر رکھیں جو امریکہ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں اور اس مسئلے کو حل کرنے میں مخلص نہیں ہیں۔

جلال آباد میں دونوں رہنماؤں کی ملاقات نصف گھنٹے تک جاری رہی جس میں افغان صدر نے جام ساقی سے کہا کہ وہ انہیں اور پاکستان کے دیگر اہم رہنماؤں کو افغانستان آنے کی دعوت دیں گے تاکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ ہمارا ملک کس طرف جا رہا ہے۔ ترقی و

خوشحالی کی جانب، یا جیسا کہ سامراجی اور امریکی ذرائع پراپیگنڈہ کر رہے ہیں، تباہی اور انتشار کی طرف؟ جام ساقی نے بتایا کہ ڈاکٹر نجیب نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ مسئلہ افغانستان اسی سال طے ہو جائے۔ تاہم انہیں اندیشہ ہے کہ امریکہ کی پٹھو پاکستانی حکومت ایسا ہرگز نہیں چاہے گی۔ چنانچہ انہوں نے پاکستانی عوام سے اپیل کی کہ وہ حکومت پر کڑی نگاہ رکھیں اور اسے امریکہ کے ہاتھ میں ہرگز نہ کھیلنے دیں۔ ڈاکٹر نجیب نے جام ساقی کو بتایا کہ پاکستانی حکمران امریکی مفادات کو عزیز رکھتے ہیں۔ اور امریکی دباؤ کی وجہ سے افغانستان میں مداخلت بند نہیں کرتے۔

جام ساقی نے یہ انکشاف بھی کیا کہ جس دن خان عبدالغفار کا انتقال ہوا اور انہیں تدفین کے لیے جلال آباد لے جانے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ اسی روز سے پشاور کے قریب تمام افغان مہاجر بستیوں اور کیمپوں کے اردگرد پاکستانی فوجیوں کے پہرے لگا دیئے گئے تاکہ کہیں وہ بھی قافلے میں افغانستان نہ چلے جائیں۔ ڈاکٹر نجیب نے اس ملاقات میں اس یقین کا اظہار کیا کہ ''پاکستانی عوام افغان حکومت کے مؤقف کے حامی ہیں لیکن سامراجی قوتیں نہیں چاہتیں کہ یہ مسئلہ حل ہو۔''

دو انقلابی رہنماؤں کی ملاقات اب ماضی بعید کا حصہ بن چکی ہے۔ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے۔ سامراجی قوتوں نے پاکستان کو استعمال کرتے ہوئے افغانستان کی انقلابی قوتوں کو تباہ کر دیا اور آج تک اس مسئلے کو حل نہیں ہونے دیا۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اگر افغان حکومت پر سامراجی حملوں میں پاکستان شریک نہ ہوتا تو آج دونوں ملکوں کے حالات کتنے مختلف ہوتے۔

۱۹۸۸ء بڑی تبدیلیوں کا سال تھا۔ جونیجو حکومت کا خاتمہ، جنرل ضیا کی ہلاکت، سیاسی تبدیلی کے جلو میں عام انتخابات اور پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کا قیام لیکن ۱۹۸۸ء کے اوائل میں جام ساقی کی پوری توجہ سندھ کے معاملات کی طرف تھی۔ ۱۶ مارچ ۱۹۸۸ء کو اپنے ایک اخباری بیان میں کامریڈ جام ساقی نے رسول بخش پلیجو اور مولانا وصی مظہر ندوی پر شدید تنقید کی اور کہا کہ وہ دونوں جرنیلوں کے ایما پر سندھ میں سندھی مہاجر فساد کرانے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ ملک میں چوتھے مارشل لاء کی راہ ہموار کی جائے۔ انہوں نے کہا کہ اگر چوتھا مارشل لاء لگایا گیا تو اس کے نتائج انتہائی تباہ کن ہوں گے۔ خاص طور پر سندھ کی حد تک حالات اتنے بے قابو ہو جائیں گے کہ انہیں کنٹرول نہیں کیا جا سکے گا۔ مارشل لاء کے نتیجے میں علاقے میں تبدیلی بھی ممکن ہے۔ انہوں نے کہا کہ

رسول بخش پلیجو سندھ دشمن قوتوں کے آلہ کار ہیں اور جرنیلوں سے ان کے گہرے مراسم ہیں۔ اسی طرح مولانا وصی مظہر ندوی ایک مخصوص گروہ کے مفاد کے لیے عوام کو گمراہ کرنے کے مشن پر کام کررہے ہیں۔ پلیجو اور ندوی دونوں اپنے آقا جرنیلوں کی ہدایت پر سندھ مہاجر فساد کرانے کی تیاری کررہے ہیں تاکہ سندھ کے عوام کو اس طرح الجھا کر جرنیلوں کے مفاد کا تحفظ کیا جاسکے۔ سندھ کے عوام پلیجو اور ندوی جیسے عوام دشمن عناصر سے ہوشیار ہیں اور اتنا شعور رکھتے ہیں کہ اپنے دوست اور دشمن میں امتیاز کرسکیں۔ سندھ کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے اور سندھ کے نوجوانوں کو ظلم و جبر سے بچانے، کالا باغ ڈیم جیسی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ باشعور سندھی عوام پلیجو ندوی سازش کو ناکام بنائیں۔ سندھی مہاجر فساد کرانے کی ہر سازش کا مقابلہ کریں اپنے عظیم اتحاد اور محبت کو ہر قیمت پر قائم رکھیں۔ جو لوگ فوج کے آلہ کار ہیں اور اپنے ناپاک عزائم کے لیے دھرتی سے غداری کرتے ہیں تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرتی۔ ایک سوال کے جواب میں جام ساقی نے کہا کہ حکمران مسلم لیگ، جنرل ضیا اور پلیجو جیسے رہنماؤں کے مقابلے میں پیپلز پارٹی ایک بہتر سیاسی جماعت ہے جس کے رہنما اور کارکن عوام کے حقوق کے لیے قربانیاں دینے سے کبھی گریز نہیں کرتے۔ مئی میں اوجڑی کیمپ کا سانحہ رونما ہوا۔ چند ماہ بعد جنرل ضیا نے خود اپنے مقرر کردہ وزیر اعظم جونیجو کی حکومت برطرف کردی۔ ۱۷ اگست کو جنرل ضیا کی ہلاکت سے پورا سیاسی منظر نامہ تبدیل ہوگیا۔ پھر انتخابات اور بے نظیر بھٹو کی بیس ماہ کی حکمرانی۔ اس دوران جام ساقی کا خود انتخابات میں حصہ لینا قابل ذکر واقعات ہیں۔

لیکن اس سے کچھ عرصہ قبل اکتوبر ۱۹۸۷ء میں ان کی زندگی میں ایک اہم موڑ آیا۔ جب انہوں نے دوسری شادی کی۔ سکھاں کی المناک موت کے بعد وہ کم وبیش آٹھ سال زنداں کی دیواروں کے پیچھے، بقول فیض گاتے رہے تھے:

کب یاد میں تیری یاد نہیں
کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں
اب ہجر کی کوئی رات نہیں

لیکن رہائی کے بعد وہ اچانک تنہا ہو گئے۔ جیل میں پارٹی کارکنوں کے ساتھ ساتھ دیگر لوگ بھی ان کی ملاقات کے لیے آیا کرتے۔ ان میں کامریڈ رکن الدین قاسمی اور ان کی صاحبزادی اختر سلطانہ بھی تھیں۔ یہ جدوجہد کے دوران جنم لینے والی محبت تھی۔ کامریڈ قاسمی کی صاحبزادی زندگی کی باقی جدوجہد میں جام کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئیں۔ وہ آج تک جام کا ساتھ دے رہی ہیں۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو دونوں باضابطہ طور پر رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ سکھاں سے جام کے بچے بختاور اور سجاد ظہیر ہیں، جبکہ دوسری بیگم سے ان کے چار بچے سارنگ، سروان اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان کی ایک بیٹی اور بھی ہے، امرتا۔ ''امرتا کو ہم نے گود لیا ہے۔'' جام ساقی بتانے لگے، ''چھوٹی امرتا کے والدین اسے ہسپتال میں ہی چھوڑ کر جا رہے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر نے میری بیوی سے بات کی کہ عورت بچی کو نہیں لے جانا چاہتی کیوں کہ اس کے شوہر نے کہا تھا کہ اگر پھر لڑکی پیدا ہوئی تو وہ اس کو مار ڈالے گا اور اسے طلاق دے دے گا۔ میری بیوی نے امرتا کو گود لے لیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے فون کیا تو مجھے لگا قدرت ہمیں امرتا دے رہی ہے۔ یہ کتنی خوش نصیبی کی بات ہے۔ یوں میرے سات بچے ہوئے اور اکیلی امرتا میرے سات بیٹوں جیسی ہے۔ میری بچیوں کے شوہروں نے مجھے بہت بہت چاہت دی ہے۔ میرا ساتھ دیا ہے جبکہ میں نے انہیں سیاسی تربیت اور مسائل ہی دیئے ہیں، ان کے دل بہت بڑے ہیں۔''

جام ساقی نے ۱۹۷۰ء کے بعد ۱۹۸۸ء میں دوبارہ تھرپارکر سندھ اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا اور مقبولیت کے باوجود نظام نے انہیں دوبارہ شکست سے دوچار کیا۔ ان کے مقابلے پر پیپلز پارٹی کے امیدوار حاجی غلام محمد نے ۱۱۸۶۲ ووٹ حاصل کر کے کامیابی حاصل کی۔ حاجی صاحب کے مقابلے میں باقی تمام آزاد امیدوار تھے۔ ارباب غلام رحیم ۷۶۴۶ ووٹ لے کر دوسرے نمبر پر رہے جبکہ آزاد امیدوار جام ساقی نے ۱۰۵۲ ووٹ لے کر تیسری پوزیشن حاصل کی۔ باقی پانچ امیدواروں میں سے شاید ہی کسی نے تین ہندسوں میں ووٹ لیے ہوں۔ ان میں سے تین علاقے کے پیر تھے۔ اس انتخاب کا ٹرن آؤٹ ۴۷.۹ فیصد رہا۔ کل رجسٹرڈ ووٹوں کی تعداد ۴۴۳۲۲ تھی جبکہ ۲۱۲۴۶ ووٹ کاسٹ کیے گئے۔ جائز قرار دیئے جانے والے ووٹ ۲۲۸۵۰ تھے جبکہ مسترد شدہ ووٹوں کی تعداد ۳۹۶ تھی۔ اس میں سے تین امیدواروں نے ۳۵ یا اس سے بھی کم ووٹ حاصل

کیے۔

دسمبر ۱۹۹۰ء میں بے نظیر بھٹو کی جمہوری حکومت کا تختہ الٹا تو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے حالات دگرگوں تھے۔ مئی ۱۹۸۹ء میں تیسری کانگریس شرافی گوٹھ میں انعقاد کے بعد پارٹی اقلیت اور اکثریت میں بٹ گئی تھی۔ ایک دھڑے نے قومی انقلابی پارٹی کے نام سے اپنا الگ راستہ چُنا۔ جبکہ دوسرا دھڑا کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی صورت میں منظم ہوا۔ پھر مزدور کسان پارٹی کے ساتھ مل کر کمیونسٹ مزدور کسان پارٹی کا وجود عمل میں آیا، جو کچھ عرصہ چل کر ختم ہوگیا۔ ۹۰ کی دہائی عالمی کمیونسٹ تحریک میں بھی بھونچال لے کر آئی۔

۱۹۹۰ء میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی چوتھی کانگریس منعقد ہوئی۔ اس کی روداد خود کامریڈ جام ساقی سے سنتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ معاملہ کافی حساس اور نازک ہے۔

''پارٹی کا یہ دستور تھا کہ ہر کانگریس میں قراردادیں پیش کی جاتی تھیں اور جس قرارداد کو سب سے زیادہ ووٹ ملتے تھے، وہ آئندہ کی حکمت عملی کرتی تھی۔ کامریڈ امام علی نازش کی طرف سے پیش کی جانے والی قرارداد کثرت رائے سے منظور ہوگئی۔ ظاہر ہے پارٹی کا طرزِ عمل اس کی روشنی میں ہی طے ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں جو قرارداد کامریڈ رمضان اور کامریڈ جمال نقوی نے پیش کی تھی، ناکام ہوگئی۔ اس قرارداد کے مطابق اب چھپ کر سیاست کرنے کی بجائے اوپن گراؤنڈ سیاست کی ضرورت تھی۔ کامریڈ نازش نے مجھ سے کہا کہ کامریڈ جام پارٹی کے جنرل سیکریٹری اب آپ بن جائیں۔ میں نے کہا: قرارداد آپ کی کامیاب ہوئی، آپ میں سے ہی کوئی بنے۔ میں مرکزی کمیٹی کا ممبر رہوں گا۔ اس پر کامریڈ امام علی نازش نے کہا کہ ''آپ جانتے ہیں کہ اگر آپ جنرل سیکریٹری نہ بنے تو پارٹی نہیں چل سکے گی۔'' یوں میں پارٹی کا جنرل سیکریٹری بن گیا۔ حالاں کہ قرارداد کامریڈ (نازش) والوں کی کامیاب ہوئی تھی مگر جنرل سیکریٹری مجھے بنادیا گیا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے تیتر اور بٹیر کو ملایا گیا ہو۔ آگے چل کر ۱۹۹۱ء میں جب سوویت یونین میں فوجی ردِّ انقلاب آیا تو میں نے اس کے خلاف بیان دیا کہ روسی عوام فوجیوں کو برداشت نہیں کریں گے اور یہ اُلٹ ہوجائے گا۔ کامریڈ امام علی نازش نے اگلے دن بیان جاری کیا کہ یہ جنرل سیکریٹری کی ذاتی رائے ہے، پارٹی کی رائے نہیں، جبکہ پارٹی کا یہ دستور رہا ہے کہ جنرل سیکریٹری کی رائے پارٹی کی

رائے ہوتی ہے۔ یوں ہمارے اختلافات کھل کر سامنے آ گئے اور میں نے پارٹی سے استعفیٰ دے دیا۔''

جام ساقی نے اپنا استعفیٰ ۱۴ ستمبر کو پیش کیا۔ استعفے کی خبر ''سرخ پرچم'' (جلد۔۲، شمارہ ۳۱۔۳۲) کے صفحہ اوّل پر جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی۔ استعفیٰ کے متن کا لب لباب یہ تھا کہ ''سینٹرل کمیٹی میں موجود سخت گیر اور قدامت پرست ارکان کی ہٹ دھرمی اور مسلسل مزاحمت کے باعث، میں پارٹی کے ڈھانچے اور پروگرام میں وہ اصلاحات لانے میں کامیاب نہ ہو سکا جس کا وعدہ میں نے پارٹی کی چوتھی کانگریس میں کیا تھا۔''

متن کے مطابق، ''میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے جنرل سیکریٹری کے عہدے اور مرکزی کمیٹی کی رکنیت سے مستعفی ہوتے وقت اس امر پر اپنے گہرے دکھ کا اظہار کرتا ہوں کہ سینٹرل کمیٹی میں موجود سخت گیر اور قدامت پرست ارکان کی ہٹ دھرمی اور مسلسل مزاحمت کے باعث میں پارٹی کے ڈھانچے اور پروگرام میں وہ اصلاحات لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا جس کا تذکرہ میں نے پارٹی کی چوتھی کانگریس کے دوران کیا تھا۔

اپنے تجربے کی بنیاد پر اب میں اس حقیقت کا برملا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ کمیونسٹ پارٹی کا انتہائی جامد، غیر لچکدار اور سخت مرکزیت کا حامل تنظیمی ڈھانچہ، ارتقائی عمل کے نتیجے میں رونما ہونے والی انقلابی تبدیلیوں کو اپنے اندر سمونے اور نئے معروضی تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھالنے کی صلاحیت سے یکسر عاری ہے بلکہ اس کی مزاحمت بھی کرتا ہے۔ سوویت یونین کی قانونی حکومت کے خلاف ناکام فوجی بغاوت میں سوویت کمیونسٹ پارٹی کے کردار، کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی مرکزی کمیٹی کے زیادہ تر ارکان کی اس ضمن میں مجرمانہ خاموشی اس افسوسناک حقیقت کی ایک واضح مثال ہے۔

سوشلسٹ ملکوں میں رونما ہونے والے عوامی انقلاب اس بات کا مظہر ہیں کہ اگر تمام ممکنہ ذرائع کو بروئے کار لا کر ریاستی اقتدار پر قبضہ کر کے پرولتاریہ کی آمریت کے نام پر ایک پارٹی کی اجارہ داری قائم کر دینے سے نہ صرف سماج میں جمود طاری ہو جاتا ہے بلکہ اس عمل کے ذریعے ایک ایسی بدترین ڈکٹیٹرشپ کے قیام کی راہ ہموار ہو جاتی ہے جسے بالآخر عوام کی نفرت اور غیض

وغضب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آمریت ایک مخصوص نظام حکومت ہے جسے آسمانی صحیفوں یا انقلابی نظریوں کے ذریعے بھی تقدس یا قانونی جواز فراہم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات اب کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر ثابت ہو چکی ہے کہ جمہوری آزادی اور بنیادی انسانی حقوق سماجی ارتقاء اور معاشی ترقی میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں اور انہیں محض کسی مخصوص نظام کی پیداوار قرار دے کر مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ جمہوریت انسانی بنیادی حقوق، سیکولرزم وغیرہ فرقہ واری اور روشن خیالی، صنعتی نظام کے جز ولاینفک ہیں، سیکولرازم اور ان کی طبقاتی توجیہ وتشریح نہیں کی جاسکتی۔

صنعتی نظام نے مختلف طبقات اور پیداواری رشتوں کو جنم دیا تھا۔ نوآبادیاتی نظام نے مختلف طبقات قومی آزادی کی تحریکیں بعدازاں دو عظیم طاقتوں کے درمیان سرد جنگ بھی اس نظام کی پیداوار تھی۔ لیکن دنیا اب اپنے ارتقائی عمل کے نئے مرحلے میں داخل ہو رہی ہے۔ سائنسی اور ٹیکنیکی انقلاب کے نتیجے میں پرانے دور صنعتی دور کا سماجی، معاشی اور سیاسی ڈھانچہ ہر جگہ شکست وریخت سے دوچار ہے اور پوری دنیا اس وقت انقلابی تبدیلیوں کی لپیٹ میں ہے۔ پرانے نظام نے جن دو سپر طاقتوں کو پیدا کیا تھا وہ خود کو تیزی سے نئے نظام کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کرسکیں۔ اور معاشی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئیں۔ لہٰذا انہوں نے مجبوراً سرد جنگ اور اسلحے کی دوڑ ختم کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اپنے آپ کو مکمل معاشی تباہی سے بچاسکیں۔ سائنسی اور ٹیکنیکی انقلاب نے جس نئے اور زیادہ ترقی یافتہ نظام کو پیدا کیا ہے اس کی نوعیت عالمگیر اور بین الاقوامی ہے۔ دنیا کا کوئی ملک اس نظام کے معاشی اور سیاسی مرکزی دھارے سے الگ رہ کر تیزی سے ترقی کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

ہم خود کو سماجی سائنسدان اور انقلابی کہتے ہیں اس لیے یہ ہمارا تاریخی فریضہ تھا کہ ہم اس نئے انقلاب کی جدلیات کو سمجھ کر اس کے علمبردار بنتے اور سچے انقلابی اور عوام دوست ہونے کی کسوٹی پر پورے اترتے۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میری پارٹی کے سخت گیر اور قدامت پرست عناصر نے خود کو تبدیل کرنے کی بجائے نئی تبدیلیوں کی مزاحمت کرنے کی راہ اختیار کی ہے۔ یہی وہ مقام ہے کہ جہاں سے میری اور ان کی راہیں جدا ہوتی ہیں۔ میں ایک ایسے جمہوری سماج کے قیام کی خاطر اپنی جدوجہد جاری رکھوں گا جس میں بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ قومیتوں کو مکمل قومی حقوق حاصل ہوں، تیز رفتار معاشی ترقی کو اوّلین ترجیح دی جائے تاکہ محنت کش

عوام میں اس ترقی کے ثمرات کو منصفانہ طور پر تقسیم کیا جا سکے۔

اس جدو جہد کو تیز کرنے کی خاطر ملک کے اندر تمام جمہوری طاقتوں کو یکجا اور متحد کرنا ضروری ہے تا کہ سرد جنگ کے دور میں ملک کے اندر تشکیل پانے والے سیاسی اور معاشی ڈھانچے کو تبدیل کر کے اسے نئے عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جا سکے۔ میں مزدوروں، ہاریوں اور تمام محنت کش طبقات اور محب وطنوں کے حقوق کی خاطر اپنی جدو جہد جاری رکھوں گا اور سندھ میں قومی اتفاق رائے اور ملک بھر میں جمہوری اتفاق رائے کے لیے کام کروں گا۔

مجھے اپنے بیشتر دوستوں کے خلوص پر کوئی شبہ نہیں ہے البتہ میں ان میں ایسے انقلابی شعور، فہم اور ادراک کی کمی پاتا ہوں جس کی اس مرحلے پر ملک اور عوام کو سخت ضرورت ہے لیکن مجھے امید ہے کہ آپ میں سے جو سوچنے والے ہیں۔ وہ جلد یا بدیر یہی نتائج نکالیں گے اور اس وسیع جمہوری اور عوامی سیاست میں شامل ہو جائیں گے جو غالباً ہمارے کمیونسٹ ملاؤں کی نظر میں بورژوا سیاست ہے۔''

فوجی ردِ انقلاب کوئی معمولی واقعہ نہ تھا، نہ اس کا کوئی عاجلانہ ردِ عمل، جو اس استعفے کی صورت میں ظاہر ہوا، مناسب ہی تھا۔ اس پر کامریڈ نازش امرہوی کا ردِ عمل سائنسی تجزیے کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے سینٹرل سیکریٹریٹ اور سینٹرل کمیٹی کے ممبر کامریڈ امام علی نازش نے ایک اخباری بیان میں سوویت یونین میں لیننسٹ کمیونسٹ پارٹی انہدام کو بیسویں صدی کا شدید المناک واقعہ قرار دیتے ہوئے اس پر اپنے دکھ اور احتجاج کا اظہار کیا۔

کامریڈ نازش نے کہا ہے کہ نام نہاد پُر اسرار ٹُو کا سہارا لے کر عظیم لیننسٹ پارٹی کو جمہوریت کے دعویداروں نے غیر جمہوری طریقے سے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ جو سوشلزم کی جگہ سرمایہ داری کی واپسی کے خلاف تھی۔

کامریڈ امام علی نازش نے کہا کہ سوویت یونین میں سوشلزم ناکام نہیں ہوا بلکہ سوشلزم کو اصلاحات کے ذریعے سرمایہ داری میں تبدیل کرنے کی کوششیں ناکام ہوئیں۔ عظیم سوویٹ کمیونسٹ پارٹی کی عظیم تاریخ جس میں زارازم کا خاتمہ کرنے کے بعد ۱۹۱۷ء کا انقلاب آیا، جس نے تمام تر رکاوٹوں، سازشوں اور گھیراؤ کے باوجود جہالت، بے روزگاری کا خاتمہ کیا۔ ایک پسماندہ ملک کو

مختصر مدت میں دنیا کی دوسری بڑی طاقت اور یورپ کی سب سے بڑی طاقت میں تبدیل کر دیا۔ جس نے انتہائی عظیم الشان قربانیاں دے کر دنیا کو فاشزم اور نازی ازم سے نجات دلائی جس نے تمام نوآبادیات میں نہ صرف آزادی کی روح پھونکی بلکہ آزادی حاصل کرنے میں مدد بھی کی، اسے دنیا کے محنت کش عوام کے ذہنوں سے محو نہیں کیا جا سکتا۔

کامریڈ امام علی نازش نے لینن کے دیس میں جمہوریت کے نام پر پارٹی، اس کے بانیوں اور اس کے نظریے کے خلاف کھلی غنڈہ گردی اور الزام تراشیوں کی مہم کی شدید مذمت کی۔

کامریڈ نازش نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمیں ایمانداری کے ساتھ یہ تسلیم کرنا چاہیے اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اپنے دور اقتدار میں پارٹی سے لاتعداد غلطیاں اور زیادتیاں ہوئیں۔ جمہوریت کو راستے سے ہٹایا گیا۔ غیر جمہوری طریقے اختیار کیے گئے۔ جمہوریت جو سوشلزم کی روح ہے اس سے انحراف کیا گیا۔ اسے ٹھیک کیا جانا چاہیے تھا۔ یہ ضروری تھا۔ لیکن ٹھیک کرنے کے نام پر نظریے اور اس کے وجود کی نفی یہ ایک کھلی سازش ہے۔

آخر میں کامریڈ نازش نے کہا کہ سوویت یونین کا جو کچھ بھی ہو دنیا کا مقدر سوشلزم ہے۔ بالخصوص نئے نوآبادیاتی نظام کے شکار ترقی پذیر ممالک کے عوام مارکس، لینن اور ان تمام دوسرے کمیونسٹوں، ترقی پسند ہیروں کی جنہوں نے محنت کش عوام کے کاز کے لیے قربانی دی، ان کے ورثے کی حفاظت کریں گے۔ اور اپنی جدو جہد کو استحصالی نئے نوآبادیاتی نظام اور امریکی برانڈ نیو ورلڈ آرڈر کے خلاف جدو جہد کریں گے۔

کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان ''سرخ پرچم'' کے اسی شمارے کے اداریے اور مرکزی کمیٹی کی سیاسی قرارداد کا متن بھی شائع ہوا۔ اداریے میں پیش کردہ تجزیے کے مطابق کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اداریے کے تفصیلی متن میں کہا گیا:

''نام نہاد جمہوریت پسند روسی نسل پرستوں نے فیڈریشن کی حدود میں کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین پر پابندی عائد کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کے اصل عزائم کیا ہیں؟ یہ پابندی اس نام نہاد بغاوت کے بعد عائد کی گئی ہے جس کی پارٹی نے مخالفت کی تھی۔ نام نہاد بغاوت جس کی آڑ میں روسی نسل پرستوں کو عالمی ذرائع ابلاغ کے ذریعے ہیرو بنایا گیا۔ سوویت یونین کے ریاستی

اور انتظامی ڈھانچہ کو توڑا گیا اور پارٹی پر پابندی عائد کی گئی۔ یہ شرمناک گٹھ جوڑ اور سازش کا حصہ ہے۔

کمیونسٹ پارٹی اپنی ۲۷ویں کانگریس کے بعد رضا کارانہ طور پر اقتدار پر اپنی مکمل بالادستی کے تصور سے دستبردار ہوگئی تھی۔ اس سلسلہ میں آئین میں موجود پارٹی کے خصوصی کردار سے متعلق دفعہ حذف کردی گئی اور نئی سیاسی پارٹیاں بنانے کی اجازت دے دی گئی اور دو سال قبل سپریم سوویت کے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کرائے گئے اور کئی ریاستوں میں غیر کمیونسٹ پارٹیوں کے امیدواروں نے کامیاب ہوکر اپنی حکومتیں تشکیل دیں۔ یا اقتصادی اور انتظامی ڈھانچوں پر بھی کافی حد تک رضا کارانہ طور پر دستبردار ہوچکی تھی۔ سوویت سماج میں کمیونسٹ پارٹی کی کوششوں سے رونما ہونے والی یہ جمہوری تبدیلیاں بین الاقوامی طور پر امن، ترقی اور جمہوریت کی سوشلسٹ تحریکوں کے لیے سازگار فضا پیدا کر رہی تھیں۔ سماجی انصاف اور امن کے پروگرام کی عالمگیریت کے مقابلہ میں جدید نوآبادیاتی ڈھانچا خود کو ڈھالنے کا اہل نہ تھا۔ اس لیے روسی نسل پرستوں، مافیا اور کرپٹ بیوروکریسی کے گٹھ جوڑ سے بغاوت کا ڈرامہ رچایا گیا اور اس کے نتیجہ میں سوویت یونین میں انتہائی افسوس ناک واقعات رونما ہوئے۔ اس نازک مرحلے پر کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین نے دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے روسی نسل پرستوں کے فاشسٹ عزائم کو روک دیا ہے اور خانہ جنگی کی فضا پیدا نہیں ہونے دی۔

اس صورت حال کے پوری تیسری دنیا پر گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔ امریکی فوجی سیاسی اور اقتصادی دہشت گردی کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ بالخصوص مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کی صورتِ حال پر اس کے سنگین اثرات مرتب ہونے کے خدشات ہیں۔ خلیج کی جنگ اور اس کے بعد رونما ہونے والے واقعات کا تسلسل اس امر کی غماضی کرتا ہے، یہ خطہ اب براہِ راست امریکی حکمت عملی کے تابع ہے۔ مشرق وسطیٰ میں امن کوششوں میں امریکہ نے اقوام متحدہ کے کردار کو جس طرح سے ثانوی حیثیت دی ہے۔ وہ نیو ورلڈ آرڈر کی پشت پر موجود ذہنیت اور مفادات کو پوری طرح آشکارا کرتی ہے۔ اس سے مشابہ صورتِ حال لاطینی امریکہ اور براعظم افریقہ میں بھی موجود ہے۔

کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان یہ واضح مؤقف رکھتی ہے کہ براہِ راست سوویت پارٹی

کے خلاف سرگرمیاں اور اقدامات صرف اینٹی کمیونسٹ سوچ کی اغماض نہیں ہیں بلکہ ان میں پوری دنیا کو امریکہ کے سیاسی، معاشی، جغرافیائی اور فوجی مفادات کے تابع کرنے کا بنیادی مقصد موجود ہے۔ امریکہ کو خدشہ ہے کہ سوویت یونین اور مشرقی یورپ میں سرمایہ دارانہ طرز پیداوار کے احیاء میں ناکامی سے بہت جلد سوشلسٹ تحریکوں کے لیے از سرِ نو ہمدردی کی لہر ابھرے گی یورپ کی فوجی تقسیم ختم ہونے سے یہ خدشہ بھی موجود ہے۔ یہ نئی سوشلسٹ تحریکیں جو جمہوری آزادیوں اور سماجی انصاف کے نئے اور ترقی یافتہ تصورات اپنے اندر جذب کیے ہوئے ہوں گی کو روکنے کے لیے کوئی دیوارِ برلن موجود نہیں ہے چنانچہ امریکہ سوشلسٹ تحریک کے اس بحرانی دور میں پیدا شدہ صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مفاد میں اپنے ہی پیدا کیے ہوئے یا سامراجی عہد کے ورثہ سے ملے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے لیے سرگرم ہو چکا ہے اور یہی نیو ورلڈ آرڈر ہے۔

کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین پر پابندی اور اسے توڑنے کا عمل صرف کمیونسٹوں کے لیے افسوس ناک نہیں ہے بلکہ عالمی سامراج دشمن جمہوری اور پسماندہ اقوام میں سماجی ترقی کی خواہشمند قوتوں کے لیے بھی تشویش کا باعث ہے۔ ان حالات میں ایک طرف عالمی کمیونسٹ تحریک اور بالخصوص ترقی پذیر ممالک کی کمیونسٹ تحریکوں کے درمیان باہمی تعاون کو انتہائی وسیع کرنا ضروری ہو گیا ہے تو دوسری طرف کمیونسٹ تحریکوں کو اپنے عوام کی طبقاتی سماجی اور جمہوری جدوجہد کو خیالات اور طریقہ کار میں وسعت پیدا کر کے منظم شکل اختیار کرنا ہوگی۔''

اداریے میں پیش کردہ تجزیے کی اہمیت اپنی جگہ لیکن مرکزی کمیٹی کی سیاسی قرارداد ایک ایسی دستاویز ہے جس سے جام ساقی کے استعفے کی بیان کردہ وجوہات کا موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ ہم اس کے ابتدائی حصے کو یہاں دہرانا چاہیں گے۔

قرارداد ۱۴۔۱۵ ستمبر کو کراچی میں منظور کی گئی۔

''عالمی کمیونسٹ تحریک کے بحرانی دور میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا یہ اجلاس کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ سوویت یونین کی صورت حال، سی پی ایس یو پر پابندی، عالمی علاقائی فوجی سیاسی اقتصادی بحران، پاکستان میں شدید سیاسی، اقتصادی، سماجی کشمکش اور پاکستان میں بائیں بازو کی جدوجہد کے حوالے سے نئے سوالات نے پاکستان کے مزدور طبقہ اور محنت کش عوام کو اور

سماجی سیاسی پروگرام کی نمائندہ قوت کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کو ایک نازک دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔اس نازک صورتِ حال میں منعقدہ اجلاس میں پارٹی کے سیکریٹری جنرل کامریڈ جام ساقی نے اپنا استعفیٰ پیش کیا جسے دس گھنٹے کی طویل بحث کے بعد منظور کیا گیا۔مرکزی کمیٹی نے کامریڈ امام علی نازش کو پارٹی کا قائم مقام سیکریٹری جنرل منتخب کر لیا ہے۔مرکزی کمیٹی فوجی آمریتوں اور پاکستان کے مزدور طبقہ کی نجات کے لیے کامریڈ جام ساقی کی بہادرانہ جدو جہد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اس امر کا اظہار کرتی ہے کہ کامریڈ جام ساقی کی جدو جہد پارٹی کا عظیم اثاثہ ہے۔مرکزی کمیٹی اس پر اپنے گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ کامریڈ عالمی کمیونسٹ تحریک کے ایک بحرانی دور میں انحراف پسندی کی جس لہر کا شکار ہوئے ہیں وہ پارٹی اور اس کی نظریاتی اور سماجی اساس کے لیے نقصان دہ ہے۔

N B

عالمی کمیونسٹ تحریک سوویت یونین کے بحران کے بعد شدید نظریاتی بحران سے گزر رہی ہے۔مارکسی لیننسٹ فکر کی ماہیت اور جوہر اور عصری مسائل کے ساتھ ان کے تعلق کا سوال کمیونسٹ تحریک میں تنظیمی بحران کا بھی موجب بنا ہے۔ہماری پارٹی میں تمام اختلافی رجحان اپنے پورے دباؤ کے ساتھ موجود ہیں۔سابق سیکریٹری جنرل کامریڈ جام ساقی کا استعفیٰ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ جنہوں نے مرکزی کمیٹی میں یہ شرط رکھی تھی کہ سوویت میں بغاوت کی مذمت کرتے ہوئے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کو ختم کر کے ایک لبرل ڈیموکریٹک پارٹی بنا دی جائے تو وہ استعفیٰ واپس لینے کے لیے تیار ہیں۔مرکزی کمیٹی نے متفقہ طور پر اس شرط کو مسترد کر دیا۔

موجودہ نظریاتی بحران سے پروان چڑھنے والے انحراف پسند مؤقف اختیار کیے ہوئے ہیں کہ طبقاتی جدو جہد اور سماجی انصاف کا سوال اٹھانا بے معنی ہے۔بورژوا سماجی ترقی آج کی ضرورت ہے نئے سامراج کا وجود ختم ہو چکا ہے۔مارکسزم سماجی سائنس کی بجائے عقیدہ پرستی ہے۔ امریکی نیوورلڈ آرڈر آج حقیقی انسان دوست مؤقف ہے۔مزدور طبقہ ختم ہو چکا ہے۔لہٰذا اس کی پارٹی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔اس نوعیت کے پیٹی بورژوا رجحانات کا عکاس انحراف پسندوں کا یہ مؤقف سماجی طبقات، عالمی تقسیم محنت اور پسماندہ اقوام کے مسائل پر پردہ ڈالنے کی ایک شرمناک اور عوام دشمن کوشش ہے۔مرکزی کمیٹی واضح کرتی ہے کہ مارکسزم تاریخی مادیت کے ذریعے سماجی

نشوونما کے قوانین اور ان کے رخ کا مطالعہ کرتا ہے اور اپنے سماجی کردار میں مارکسٹ فلسفہ دنیا کے کروڑوں پسماندہ عوام، مظلوم طبقوں اور محکوم قوموں کی نجات اور ان کی امنگوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ جب تک محنت خریدنے اور محنت فروخت کرنے والوں کا فرق موجود ہے۔ طبقاتی جدوجہد اپنی ترقی کی سطح کے مطابق موجود رہے گی۔ کمیونسٹ سماج کا ظہور طرز پیداوار کی ایک ایسی سطح پر ممکن ہے جو انتہائی ترقی یافتہ آلات کار پر مبنی ہوگا۔ جدید سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی کی سطح کمیونسٹ سماج کی جانب بڑھتا ہوا قدم ہے۔''

قرارداد کے آخر میں چند اہم وضاحتیں کی گئیں جن کے مطابق مرکزی کمیٹی نے داخلی تنظیمی صورتحال اور فرنٹوں بالخصوص مزدور اور طلبا محاذ کی سرگرمیوں پر تفصیلی غور کیا ہے اور ممبران سے اپیل کرتی ہے کہ وہ آئین کے مطابق اداروں کو فعال رکھنے، فنڈز اور پبلی کیشنز کی باقاعدگی کے لیے اپنی ذمہ داریاں پوری کریں۔ فرنٹوں اور دیگر طبقاتی جمہوری اور سماجی سرگرمیوں کے ذریعے عوام کے مختلف حصوں سے رابطے بڑھائیں۔ مرکزی کمیٹی از سرنو یاد دلاتی ہے کہ چوتھی کانگریس کے فیصلوں کے مطابق پارٹی میں موجود موقع پرستی کے کسی رجحان کی کوئی گنجائش نہیں۔ تاہم پارٹی ہر قسم کی نظریاتی بحثوں جو پاکستان میں سماجی تبدیلی کے عمل کو آگے بڑھانے کے لیے ہوں، کا خیر مقدم کرتی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی اپنے منتخب اداروں اور داخلی رویوں کے ذریعے خود کو ایک مکمل جمہوری تنظیم میں تبدیل کر چکی ہے۔ پارٹی ممبران کو اداروں کے ذریعے سرگرمیوں کو بڑھانا چاہیے تاکہ پارٹی میں انارکی کی فضا پیدا نہ ہو۔

مرکزی کمیٹی نے سینٹرل سیکریٹریٹ میں توسیع کرتے ہوئے کامریڈ عاشق ہمدانی اور کامریڈ شبیر سولنگی کو اس کا رکن منتخب کیا ہے۔

مرکزی کمیٹی کے سابق رکن پروفیسر جمال نقوی کو سندھ کے مشیر داخلہ عرفان اللہ مروت کے استقبالیہ میں شرکت پر ڈسٹرکٹ کمیٹی کراچی کی جانب سے شوکاز نوٹس جاری کرنے پر ڈسٹرکٹ کمیٹی کو فیصلہ کرنے کا مجاز قرار دیا ہے۔

کمیونسٹ پارٹی سے استعفے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جام ساقی سیاسی عمل سے باہر ہو گئے ہیں۔ یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ وہ سیاسی عمل میں دائیں بازو کے پیروکار بن گئے ہیں۔ البتہ کمیونسٹ

پارٹی کی تحریف پسندی پر تنقید قابلِ غور تھی۔ اس لیے کہ کمیونسٹ پارٹی پر تنقید میں وہ کافی آگے بڑھ گئے تھے۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے اس بات کی وضاحت کی کہ کیسے وہ ایک فعال کمیونسٹ بنے اور پھر کیسے وہ سٹالن ازم کی تنگ نظری اور خامیوں کو سمجھ پائے۔ انہیں جرمنی، سویڈن، ڈنمارک اور برطانیہ جانے کا موقع ملا۔ برطانیہ میں دو نوجوان کمانڈر انہیں کہا کرتے، ''ہمارے لیڈر خشک کتابوں کی طرح ہیں جبکہ آپ زندگی سے بھرپور ہیں۔''

۱۹۹۱ء کا فوجی ردِ انقلاب ان کے لیے آخری دھچکا ثابت ہوا۔ چنانچہ سوویت ریاست کے انہدام کے بعد وہ پارٹی سے مستعفی ہو گئے۔ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان ان واقعات کی وضاحت کرنے سے قاصر تھی۔ پارٹی کے ایک رہنما نے پارٹی کا نقطۂ نظر نہیں بلکہ اپنا ذاتی نقطہ نظر پیش کیا:

''میں نے سوچا جو پارٹی ان واقعات کی وضاحت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔''

ان دنوں کامریڈ جام ساقی نے سٹالن واد سے سخت بیزاری کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ سٹالن واد نے سوشلزم کو جتنا نقصان پہنچایا، اتنا نقصان تو سامراج بھی نہیں پہنچا سکے تھے۔

''جب میں ۱۹۹۰ء میں روس گیا تو میں نے وہ جگہ دیکھی جہاں لینن کو ان کے آخری دنوں میں رکھا گیا تھا۔ بیوروکریسی نے انہیں پارٹی اور باقی دنیا سے کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ جب میں نے مزید پڑھا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ لینن اور ٹراٹسکی ایک دوسرے سے بے حد قریب تھے اور یہ کہ لینن نے زندگی کے آخری دنوں میں سٹالن کو پارٹی سے باہر کرنے کی کوشش کی جب ایک موقع پر لینن کی بیوی کروپسکایا نے سٹالن کے روّیے کی شکایت کی تو سٹالن نے براہِ راست دھمکی دی تھی۔''

کامریڈ جام ساقی نے ان حالات سے یہ غلط یا درست نتیجہ بھی اخذ کیا کہ پاکستان کمیونسٹ پارٹی نے کبھی بھی ایک عوامی جماعت بننے کی کوشش نہ کی۔

''ایسا اس لیے بھی تھا کہ کمیونسٹوں نے زیرِ زمین سرگرمیوں پر بہت زیادہ زور دیا۔ وہ زیرِ زمین سرگرمیوں میں اتنے گہرے دفن ہو گئے کہ کارکن انہیں دیکھ تک نہ سکتے تھے۔ غالباً پولیس کے چند لوگ ہی جانتے تھے کہ وہ کہاں ہیں۔ انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کو چھوڑنے کے بعد IMT اور

کامریڈ لال خان کو جوائن کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

کامریڈ لال خان نے سوشلسٹ انقلاب کے لیے لوگوں کو بہت بڑی تعداد میں متحد اور منظم کرنا شروع کر دیا ہے۔ سٹالن واد کمیونسٹ پارٹی اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو کبھی جمع نہیں کر سکتی تھی۔ لال خان کو جوائن کرنے کا میرا فیصلہ درست تھا اور میں زندگی میں پہلی بار خود کو اتنا جوان اور پُرامید محسوس کر رہا ہوں۔''

یہ ۱۹۹۲ء کے اوائل کے دن تھے۔ کامریڈ جام ساقی کا کہنا تھا کہ'' کمیونسٹ پارٹی کی صفوں میں بہت اچھے لوگ تھے لیکن پارٹی ایک خفیہ کلب بن کر رہ گئی تھی۔''

پارٹی سے استعفے کے چند روز بعد ہی کامریڈ جام ساقی کا رویہ معذرت خواہانہ ہو گیا تھا۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۹۱ء کو انہوں نے وہ تمام ''تلخ الفاظ'' واپس لینے کا اعلان کر دیا جو انہوں نے کسی فرد یا پارٹی کے خلاف ادا کیے تھے۔ روزنامہ فرنٹیر پوسٹ کے مطابق، ''ایک صوفی سندھی رہنما جام ساقی نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ معاشرے کے تمام حلقوں میں محبت اور امن کا پرچار کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ متحارب بلاکوں کی سیاست کی اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ دور استدلال اور مکالمے کا دور تھا۔''

نومبر ۱۹۹۱ء میں وہ ''جمہوری تحریک'' (JT) کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔ ۱۲ نومبر کو بینظیر بھٹو نے ''جمہوری تحریک'' کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے سندھ میں بحالی امن کے لیے یوم انسانی حقوق (۱۰ دسمبر) کے موقع پر نکلنے والے امن مارچ کی حمایت بھی کی۔ جمہوری تحریک کے ایک ترجمان نے ایک اخباری بیان جاری کیا، جس کے مطابق جام ساقی نے بلاول ہاؤس میں بے نظیر بھٹو سے ایک ملاقات کی۔ دونوں رہنماؤں نے سندھ میں امن کی بحالی اور دیگر سیاسی امور پر تبادلۂ خیال کیا۔ جام ساقی نے بے نظیر کو جمہوری تحریک کے امن مارچ کے مقاصد سے آگاہ کرتے ہوئے، ان کی پارٹی کے تعاون کی درخواست کی۔ بے نظیر نے امید ظاہر کی کہ امن مارچ سندھ میں امن کی بحالی اور صوبے میں معاشرے کے مختلف حلقوں کے درمیان بھائی چارے کی فضا قائم کرنے میں کامیاب رہے گا۔ انہوں نے پارٹی کے تعاون کا بھی یقین دلایا۔

امن مارچ کا اعلان دراصل جام ساقی نے ۱۲ اکتوبر کو ایک پریس کانفرنس میں کیا تھا۔ یہ

مارچ پنجاب، سندھ کے بارڈر سے پیدل کراچی تک نکالا جانا تھا۔ ۱۲ اکتوبر کو سندھ کے نوجوان یومِ غیرت کے طور پر مناتے تھے۔ ستمبر ۱۹۷۸ء میں ڈاکٹر شیریں سومرو کی فوجیوں کے ہاتھوں زیادتی کا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس کے خلاف سندھ یونیورسٹی، لیاقت یونیورسٹی اور انجینئرنگ یونیورسٹی کے طلباء نے ایک زبردست جلوس نکالا۔ جلوس کے آگے ایک فوجی ٹرک آ گیا۔ فائرنگ کے نتیجے میں ایک فوجی جوان مارا گیا جس پر علی حیدر شاہ، قادر بخش جتوئی، سرفراز میمن اور دوسو طلباء کے خلاف مقدمہ درج کر لیا گیا۔ اگلے سال ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو طلباء نے یومِ غیرت منایا۔ تب سے سندھ میں طلباء ۱۲ اکتوبر کو یومِ غیرت مناتے رہے ہیں۔

جام ساقی نے اسی دن اپنی پریس کانفرنس منعقد کی۔ ۱۹۹۱ء میں جام صادق کی رسوائے زمانہ حکومت تھی۔ سندھ میں بدامنی عروج پر تھی۔ کراچی میں ایم کیو ایم اور اندرون سندھ ڈاکوؤں کا راج تھا۔ حالات اس طرح کے تھے کہ رات کو کوئی گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ کامریڈ جام ساقی نے اپنی پریس کانفرنس میں جو مطالبات کیے ان میں ڈاکوؤں کو عام معافی دینے اور عام لوگوں کو اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار فراہم کرنے کے مطالبے بھی تھے۔ ایک مطالبے میں انعامی، نیلامی اور سرکاری زمینیں ہاریوں میں مفت تقسیم کرنے کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا۔

۳ دسمبر ۱۹۹۱ء کو تنظیمی کمیٹی کے ارکان رمضان اور دیگر نے کہا کہ جام ساقی کی طرح ۱۰ دسمبر کو شروع کیے جانے والے امن مارچ کا مقصد سندھ کی مختلف سیاسی پارٹیوں اور سماجی تنظیموں کو ایک واحد پلیٹ فارم پر جمع کرنا تھا۔ اس اثنا میں ایک اور انقلابی رہنما رسول بخش پلیجو، خود اپنے ویژن کے مطابق ایک لانگ مارچ کا اعلان کر چکے تھے جو ۶ دسمبر کو سکھر سے شروع ہونا تھا۔ اگرچہ انہوں نے جام ساقی کے لانگ مارچ کی حمایت بھی کر رکھی تھی لیکن ۳ دسمبر کو ہی عوامی تحریک کے جنرل سیکریٹری نظام الدین بلوچ نے اعلان کیا کہ لانگ مارچ کے تمام انتظامات مکمل ہیں۔ مارچ میں عوامی تحریک کے طلباء و مزدور محاذ اور سندھیانی تحریک بھی شرکت کرے گی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ پلیجو صاحب نے تو جام ساقی کے امن مارچ کی حمایت کر رکھی ہے تو نظام بلوچ نے کہا کہ دونوں جلوس راستے میں ایک ہو کر ایک دوسرے کے استحکام اور حمایت کا باعث بن سکتے ہیں۔ نظام بلوچ کا کہنا تھا کہ سندھ پر ایم کیو ایم کی ننگی تلوار لٹک رہی ہے اور تعلیم یافتہ نوجوان ملازمتوں سے محروم ہیں۔

۶ دسمبر کو جمہوری تحریک کے سربراہ جام ساقی نے کہا کہ پاکستان کے وجود کا انحصار، جمہوریت پر ہے اور اگر اس ملک میں جمہوریت کو نہ پنپنے دیا گیا تو یہ ملک باقی نہیں رہے گا۔

انگریزی روزنامہ فرنٹیئر پوسٹ کو انٹرویو دیتے ہوئے جام ساقی نے کہا کہ پاکستان میں اب مختلف قومیتیں صرف اس صورت میں اکٹھی رہ سکتی ہیں جب ہر قومیت کو اپنے صوبے میں مکمل صوبائی خودمختاری کا حق ملے۔ اور وہ اپنے وسائل کی خود مالک ہو۔

سندھ کی صورتِ حال کے حوالے سے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کامریڈ جام ساقی نے کہا کہ سندھ میں زندگی مکمل عدم استحکام کا شکار ہے۔ جام ساقی، جنہیں اب ''امن کا راہی'' کہا جاتا ہے کیوں کہ انہوں نے صوبے میں امن، ہم آہنگی اور سیاسی اتفاق رائے کے لیے پیش قدمی کی ہے۔ جہاں تک صوبے میں ڈاکوؤں کی سرگرمیوں کا مسئلہ ہے، جام کی رائے میں سات عوامل اس صورتِ حال کے ذمہ دار تھے۔

۱۔ ہر زمیندار کے پاس لاکھوں ایکڑ اراضی تھی لیکن لاکھوں ہاریوں کے پاس ان کی اپنی ایک انچ زمین بھی نہیں تھی۔ ایسے معاشرے میں جرائم کا اضافہ کوئی حیران کن بات نہیں ہے۔

۲۔ صوبے میں پولیس ڈاکوؤں کی پرورش ایک صنعت بن گئی ہے۔ پولیس کی زیادتیوں کے شکار غریب لوگ ڈاکو کے علاوہ اور کیا بن سکتے تھے۔

۳۔ جاگیرداروں نے اپنے مخالف جاگیرداروں کو خوف زدہ رکھنے کے لیے خود ڈاکوؤں کی ایک قوت پیدا کی۔

۴۔ ڈاکوؤں کی سرگرمیوں میں اضافے سے بے روزگاری نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا۔

دیگر عوامل میں افغان جنگ کے نتیجے میں ہتھیاروں کی آسان دستیابی اور سندھی عوام کو ان کی جمہوریت پسندی کی سزا دینے کے لیے ڈاکوگردی کو مصنوعی طریقے سے اجاگر کیا جانا بھی شامل تھا۔ سندھی عوام نے ضیا آمریت کے خلاف شدید مزاحمت کی، اس لیے بھی انہیں معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ایک صحافی نے جام سے سوال کیا کہ سندھ میں باقی صوبوں کے مقابلے میں سیاسی جبر کیوں ہے۔ جام کا جواب تھا کہ سندھ میں باقی صوبوں کے مقابلے میں زیادہ سیاسی بیداری ہے اور حکمران یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ اس سیاسی بیداری کے عمل کو آسانی سے نہیں روک سکتے اس لیے وہ سیاسی جبر کے ذریعے سیاسی بیداری کو روکنا چاہتے ہیں۔

جام ساقی نے اس تاثر کو غلط قرار دیا کہ کمیونزم کا نظریہ نا کام ہو گیا ہے۔ ان کے لفظوں میں ''حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم دنیا میں آج تک کہیں متعارف ہی نہیں ہوا۔ دراصل سوویت یونین میں ۱۹۲۱ء میں سوشلزم کو متعارف کرانے کی کوشش کی گئی تھی۔ جب لینن نے کہا کہ معاشرہ جمہوریت اور صنعت کاری کے بغیر کام نہیں کرسکتا تو اس بیان کے ردِعمل میں ایک کمیونسٹ ملاّ نے لینن پر گولی چلا دی۔ تب معاملات نہ سدھر سکے۔ لینن بیمار پڑ گئے اور عملاً سٹالن کے قیدی بن گئے۔ لینن کے بعد سوشلزم کا فلسفہ پروان نہ چڑھ سکا۔'' جام ساقی کے ان خیالات پر کوئی رائے زنی کیے بغیر، ہم امن مارچ کی طرف واپس آتے ہیں، جو اس وقت جام کا ایجنڈا تھا۔ جام نے الزام لگایا کہ حکومت ان کے عمل مارچ میں رکاوٹیں پیدا کر رہی ہے۔

۱۰ دسمبر کو لانگ مارچ کا آغاز ہوا۔ سندھ، پنجاب سرحد پر پنجاب کی طرف سے مارچ شروع ہوا۔ مارچ کرنے والے ایک ریڑھی لیے ہوئے تھے جس پر قرآن شریف، گیتا، بائبل اور ''شاہ جو رسالو'' رکھے ہوئے تھے۔ پنجاب کی جانب پنجاب پولیس اور سندھ کی طرف سندھ پولیس کے علاوہ رینجرز بھی موجود تھیں۔ شاہ لطیف کے ابیات سے مارچ شروع ہوا۔ امن مارچ شام کو ڈہرکی پہنچا جہاں کھانے اور رات ٹھہرنے کا انتظام تھا بھٹو برادران (اختیار بھٹو، ڈاکٹر ظفر اور لیاقت بھٹو) نے کافی بڑی تقریب منعقد کرائی۔ ادیبوں، شاعروں اور شہریوں کی بڑی تعداد اس میں شامل تھی۔ وہیں ڈاکو کمانڈو شیخ کی دعوت ملی کہ تمام قافلہ اس کے ہاں کھانا کھائے۔ جام ساقی نے شرط رکھی کہ اگر وہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کریں کہ آئندہ جرائم نہیں کریں گے تو وہ کھانا کھانے کے لیے تیار ہیں۔ ڈاکوؤں نے جواب دیا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو پولیس اور وڈیرے دونوں میں انہیں ہلاک کر دیں گے۔ ڈاکوؤں کے اور گروہوں نے اجرک پہنانے کی پیشکش کی۔ جام کا وہی جواب تھا۔ بے نظیر بھٹو نے پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو پیغام بھیجا کہ وہ ہر جگہ جام ساقی اور ان کے ساتھیوں کا

استقبال کریں۔ استقبال کرنے والوں میں مقابلہ شروع ہو جاتا کہ وہ جلوس کو کھانا کھلائیں گے۔ جلوس میں کوئی پجیرو یا دوسری گاڑی نہیں تھی۔ جام کی قیادت میں سب لوگ پیدل چل رہے تھے۔ سکھر پہنچتے پہنچتے پاؤں سُوج گئے۔ خیر پور پہنچے تو جام کی چپل ٹوٹ گئی جس پر مشہور شاعر منصور میرانی جام کے لیے جاگرز لے آئے۔ قافلے کے ساتھ بستروں کا ایک ٹرک بھی تھا لیکن اتنی میز بانی کے بعد اکثر بستر کھولنے کی نوبت تک نہ آئی۔

خیر پور سے نکلے تو جام کو پیغام ملا کہ اپنی ذات کے لیے، جو کچھ چاہیے، لے لو اور اپنے مطالبوں سے دستبردار ہو جاؤ۔ ظاہر ہے، جام نے اس کا جواب نفی میں ہی دینا تھا۔ ۷ دسمبر کو لانگ مارچ کاروان کے رہنما جام ساقی نے خیر پور کے مقام پر ایک بیان میں کہا کہ اسٹیبلشمنٹ دروغ بیانی، فراڈ اور بددیانتی کے مرض کا شکار ہو چکی ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی سندھ نیشنل پارٹی، جیے سندھ پروگریسو پارٹی اور سندھ ساگر پارٹی کے کارکنوں کے پر ہجوم جلسے سے خطاب کرتے ہوئے جام نے کہا کہ حکمران جمہوری اخلاقیات اور سیاسی قدروں کو فراموش کر چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سندھ عوام سے ان کی خودمختاری کا حق چھین لیں۔ انہوں نے سندھ کو یرغمال بنالیا ہے۔ ان کا ناپاک اتحاد سندھی ثقافت اور معیشت کو برباد کرنے کے درپے ہے۔ خیر پور سے پہلے ٹنڈو کرم آباد کے مقام پر عوامی تحریک (ناریجو گروپ) کی طرف سے امن مارچ کرنے والوں نے جام ساقی اور ان کے امن مارچ کا پرجوش استقبال کیا۔ خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر حبیب الرحمان بھٹو نے کہا کہ حکمران تبدیلی کی ہواؤں کو محسوس نہیں کر رہے جس نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

دسمبر کے آخری ہفتے میں جام کا امن جلوس سندھ کے عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مزار پر پہنچا جنہوں نے زندگی بھر محبت اور امن کا پیغام دیا تھا۔ جام کے امن کارواں نے شاہ کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائی۔ یہاں بتایا گیا کہ بے نظیر بھٹو حیدر آباد میں کاروان کا خیر مقدم کریں گی اور جلوس اپنے پروگرام کے مطابق ۱۰ جنوری ۱۹۹۲ء کو کراچی پہنچ جائے گا۔

۲۹ دسمبر کو جب جام ساقی اور ان کا کاروان حیدر آباد کے قریب بھاؤ ڈیرو، ٹنیاری اور ہاتری کے مقامات پر پہنچا تو انہوں نے مختلف اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کا کوئی مہذب معاشرہ، خواتین، بچوں اور بزرگوں کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کو برداشت نہیں

کرسکتا۔ یہ بات انہوں نے سیاسی حریفوں کے رشتہ داروں پر کیے جانے والے تشدد کی اطلاعات کے تناظر میں کہی۔ اس سے واضح طور پر سرکاری حکام کی نااہلی ظاہر ہوتی ہے۔ انہوں نے سرکاری کارندوں کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا کہ وہ عوام کی خدمت کرنے کی بجائے ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ انہوں نے خبردار کیا کہ صورت حال ہمیشہ ایسی نہیں رہے گی اور ظالموں کے دن گنے جا چکے ہیں۔

جام ساقی نے ساٹھ سالہ بوڑھے خادم پٹھان کے قتل پر اپنے ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مقتول کو غلط طور پر الذوالفقار کے ساتھ ملوث کیا گیا تھا۔ انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ تمام سیاسی قیدیوں بشمول ڈاکٹر قادر مگسی اور منظور وسان کو جیل میں طبی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

ابھی کاروان حیدرآباد میں ہی تھا کہ ۳۱ دسمبر کو قافلہ سالار جام ساقی کے والد محمد بچل انتقال کر گئے۔ ان کی عمر ۶۵ سال تھی اور ان کے پسماندگان میں جام ساقی سمیت دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ مرحوم زندگی بھر پرائمری سکول کے استاد رہے اور انہوں نے تھر جیسے غیر ترقی یافتہ علاقے میں لڑکیوں اور لڑکوں کا سکول قائم کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک غریب آدمی ہونے کے باوجود انہوں نے خود اپنا قطعہ اراضی سکول کی تعمیر کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کے سوگ میں قاسم آباد کی تمام دکانیں اور کاروباری مراکز بند کر دیئے گئے۔ اور ہزاروں افراد نے جام ساقی سے تعزیت کی۔ مرحوم کو دادن شاہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ آخری رسومات میں امن کارواں میں شامل تمام کارکن بھی شریک ہوئے۔ مارچ کے شرکاء نے اپنا امن مارچ جاری رکھا جب کہ جام تین روز تک وہاں رکنے کے بعد قافلے میں جا ملے۔ امن جلوس اپنے پروگرام کے مطابق کراچی پہنچا۔ اس امن مارچ کا دیرپا سیاسی اثر ہوا اگرچہ ۱۹۹۲ء میں کراچی اور حیدرآباد میں نئے ہنگامے پھوٹ پڑے۔

کامریڈ جام ساقی کی سیاسی سرگرمیاں جاری رہیں۔ کچھ عرصہ بعد بے نظیر بھٹو بھی جام ساقی کے پاس والد کی تعزیت کے لیے آئیں۔

''جب وہ اندر کے کمرے میں بیٹھی میری والدہ اور بیوی کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں تو ہمارے اڑوس پڑوس کی غریب عورتیں اکٹھی ہو گئیں کیوں کہ وہ بے نظیر کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ جب

میں نے دیکھا تو بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر سے کہا کہ کیا آپ ان خواتین سے تھوڑی دیر باتیں کر سکتی ہیں تو بے نظیر ٹک ٹک کرتی چلی گئیں لیکن بیگم نصرت بھٹو نے ان خواتین کا حال احوال پوچھا۔ یہ فرق کلاس کا فرق تھا۔ نصرت بھٹو نے ان عورتوں سے باتیں کیں کیوں کہ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھیں جبکہ بے نظیر اونچے طبقے کی خاتون تھیں...''

''جمہوری تحریک'' کی قیادت کرتے ہوئے جام ساقی نے اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ۴ ستمبر کو انہوں نے حیدر آباد میں ایک پریس کانفرنس میں ملکی مسائل پر قابو پانے کے لیے قومی اتفاق رائے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے سندھ کے ڈیموکریٹس کے ساتھ مل کر ایک ''وسیع تر جمہوری پلیٹ فارم'' تشکیل دیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ جمہوری جدو جہد میں شرکت کے لیے ہم خیال لوگوں، دانشوروں، قوم پرستوں، جمہوریت پسند ادیبوں، وکلاء اور ٹیکنو کریٹس کو دعوت دی جائے گی۔

جام ساقی نے کہا کہ انسانی حقوق کی پامالی وقت کا قانون بن گیا تھا اور اگر چہ جرائم میں کمی آئی ہے لیکن خواتین کے ساتھ زیادتی کے مقدمات میں اضافہ ہوا ہے۔ زیادتی کی ان مثالوں میں نوری پلیجو، سکینہ سومرو، شہزادی شیخ، وینا حیات اور عابدہ متیلو کے نام شامل ہیں۔

۱۹۹۲ء میں شناختی کارڈ میں مذہبی خانے کی شمولیت کے مسئلے کی مخالفت کی گئی تھی۔ خصوصاً مذہبی اقلیتوں نے اس کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس اہم عوامی مسئلے پر جمہوری تحریک کے قائد جام ساقی نے شناختی کارڈ میں مذہب کا خانہ رکھنے کی شدید مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ یہ اقدام اسلامی قوانین اور جمہوری اصولوں کی پامالی کے مترادف ہے اور اس سے پاکستان کی یکجہتی متاثر ہوگی۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ قائد اعظم اور علامہ اقبال نے اپنی تقریروں میں مسلسل اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ پاکستان ایک مذہبی ریاست نہیں ہوگا اور مذہب کی بنیاد پر کسی طرح کا امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔

طویل قید و بند، قیدِ تنہائی کے دوران جسمانی تشدد، طویل پیدل امن مارچ اور اس کے بعد مسلسل سیاسی سرگرمیوں کے باعث جام ساقی بیمار پڑ گئے۔ جون ۱۹۹۳ء میں انہیں جناح ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ۲۰ جون کو متعدد سیاسی اور پارلیمانی رہنماؤں نے ہسپتال کا دورہ کیا اور جام

ساقی کی صحت کا احوال دریافت کیا۔ ان رہنماؤں میں سینئر مخدوم خلیق الزمان، ممبر قومی اسمبلی سید خورشید شاہ، رکن سندھ اسمبلی نثار احمد کھوڑو، رکن سندھ اسمبلی پیر مظہر الحق، سندھ کے مشیر صحت عرفان اللہ مروت چیئرمین اینٹی کرپشن امداد اللہ انڑ اور دیگر شامل تھے۔

اس سے قبل جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سینٹر کے ڈائریکٹر نے جام ساقی کا طبی معائنہ کیا اور ان کی صحت یابی کے حوالے سے اہم ہدایات جاری کیں۔ اس بیماری میں جام ساقی کے جسم کا بایاں حصہ مفلوج ہو گیا تھا۔

بعد ازاں سندھ اسمبلی کے فلور سے پیپلز پارٹی کے رہنماؤں نثار کھوڑو اور پیر مظہر الحق نے اپنے پوائنٹ آف آرڈر پر حکومت سے مطالبہ کیا کہ جام ساقی کے علاج پر مناسب توجہ دے۔ انہوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ نیورو سرجن، کارڈیالوجسٹ اور فزیشن پر مبنی ایک میڈیکل بورڈ تشکیل کیا جائے تا کہ ان کی بیماری کی درست تشخیص اور علاج ہو سکے۔ پوائنٹ آف آرڈر کے جواب میں سندھ کے مشیر صحت عرفان اللہ مروت نے کہا کہ وہ جام ساقی کو دیکھنے خود ہسپتال گئے تھے اور ان کی صحت کے سلسلے میں ضروری ہدایات دی تھیں۔

کچھ روز پہلے جام ساقی لاڑکانہ میں تھے، جب ایک سیاسی تقریب کے دوران برین ہیمرج کے نتیجے میں وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ فوراً بعد انہیں کراچی کے جناح ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ خوش قسمتی سے فوری علاج کے باعث وہ خطرے کی حالت سے نکل گئے۔ لیکن فالج کے شدید حملے نے انہیں بستر سے اٹھنے نہ دیا۔ ٦ جولائی کو اے این پی کے رہنما اجمل خٹک نے قومی اسمبلی میں مطالبہ کیا کہ کامریڈ جام کے علاج کے لیے انہیں سرکاری خرچے پر بیرون ملک بھیجا جائے۔ اب عوام، سیاستدان اور اہم شخصیات کے مطالبے پر سندھ حکومت نے ایک اعلیٰ درجے کا میڈیکل بورڈ تشکیل دینے کا فیصلہ کیا۔ بورڈ نے تفصیلی معائنے کے بعد انہیں علاج کے لیے بیرون ملک بھیجنے کی سفارش کی۔ اس کے بعد سندھ اور وفاق کی حکومت سے جام ساقی کا بیرون ملک علاج کرانے کے مطالبات کا تانتا بندھ گیا۔ کچھ عرصہ بعد سندھ حکومت نے اعلان کیا کہ اس نے علاج کے لیے ساڑھے سات ہزار پونڈ (٣ لاکھ ٥٥ ہزار روپے) جام ساقی کے لیے لندن کے واپسی ٹکٹ کے اہتمام کا اعلان بھی کیا۔ مقامی ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ لندن میں جام ساقی کے علاج کو

دو سے تین ماہ تک جاری رکھنا ہوگا۔ جس کے لیے ۶ ہزار روپے ماہانہ مزید درکار ہوں گے۔

قصہ مختصر، انہیں لندن کے کراموبل ہسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں دو تین ماہ تک وہ زیرِ علاج رہے اور صحت مند ہو کر وطن واپس لوٹے۔ علاج کے لیے روانگی سے، پاکستان واپس آنے تک سہیل سانگی ان کے ساتھ رہے۔

۱۹۹۴ء میں جام ساقی نے سندھ جمہوری اتحاد گروپ کو چھوڑ کر بے نظیر بھٹو کی دعوت پر پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ ۲۲ جون ۱۹۹۴ء کو انہوں نے ایک بیان میں کہا کہ شہید بھٹو کی سیاسی وارث بے نظیر بھٹو ہیں، مرتضیٰ بھٹو نہیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کئی سیاسی جماعتوں سے بہتر ہے۔ وہ واحد سیاسی جماعت ہے جس میں ہر مذہب، قوم، زبان اور صوبے کے لوگ شامل ہیں۔ اس پارٹی کی کوئی متبادل پارٹی موجود نہیں۔ پیپلز پارٹی کا منشور دوسری سیاسی پارٹیوں سے کہیں بہتر ہے اس لیے اس میں شمولیت کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

جام ساقی وزیرِ اعلیٰ عبداللہ شاہ کی وزارت میں بطور مشیر شامل ہو گئے اور حکومت کے خاتمے تک مقدور بھر عوام کی خدمت کرتے رہے۔ حکومت میں شمولیت کے ساتھ ساتھ تصوف کی طرف ان کے جھکاؤ کو بھی ہدفِ تنقید بنایا گیا۔ لیکن جام ساقی کا ضمیر صاف تھا اس لیے وہ تنقید کی پروا کیے بغیر خدمت کرتے رہے۔ انہوں نے جبری مشقت کے خلاف زبردست کام کیے۔ ۱۸ اپریل ۱۹۹۶ء کو انہوں نے جبری مشقت کے خلاف ایک کانفرنس کا انعقاد کیا۔ انہوں نے کہا کہ جبری مشقت کے خلاف سیمینار اور کانفرنسیں اس لیے منعقد کی جا رہی ہیں تاکہ جبری مشقت کی وجوہات کو سامنے لایا جائے تاکہ اس کے خاتمے کے لیے عملی اقدامات کیے جا سکیں۔ انہوں نے بتایا کہ مئی اور جون کے مہینوں میں میرپور خاص، سکھر، لاڑکانہ، حیدرآباد اور کراچی میں بھی ایسی کانفرنسیں منعقد کی جائیں گی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کانفرنسوں میں صحافیوں، ادیبوں، مخیّر حضرات اور خواتین کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والی ایسوسی ایشنز کو بھی مدعو کیا جائے گا۔

۲ جون کو انہوں نے جبری مشقت کے خاتمے کی غرض سے نگران کمیٹیوں کے قیام کا اعلان کیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ کمیٹیاں زمینداروں، آبادکاروں کاشتکاروں، سرکاری حکام، مقامی پولیس اور این جی اوز پر مشتمل ہوں گی۔ یہ کمیٹیاں اگلے نوے دنوں میں کام کرنا شروع کر دیں گی۔

لیکن ان کمیٹیوں اور جام ساقی کو جبری مشقت ختم کرنے کے لیے کام کرنے کا موقع نہ مل سکا۔

ستمبر ۱۹۹۶ء میں وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے بھائی مرتضٰی بھٹو کو کلفٹن میں ان کے گھر کے سامنے شہید کر دیا گیا۔ حالات کو اس نہج تک لانے کا مقصد یہ تھا کہ بے نظیر کی حکومت کا جبری خاتمہ کر دیا جائے۔ پیپلز پارٹی کے اپنے مقرر کردہ صدر فاروق احمد لغاری نے خود اپنی پارٹی کی پیٹھ میں چھرا گھونپتے ہوئے، پیپلز پارٹی کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

اس کے بعد جام ساقی، ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ بینظیر حکومت میں وہ ایم آر ڈی کے سلسلے میں تحقیقی پراجیکٹ سے بھی وابستہ ہوئے تھے جو SZABIST میں جناب سلیمان شیخ کے زیر نگرانی ابھی تک جاری ہے۔ وہ اگرچہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہ ہوئے لیکن انہوں نے سندھ میں بائیں بازو میں اتفاق رائے کے لیے اپنی کاوشیں جاری رکھیں۔ وہ ابھی تک سوویت یونین کو فاشزم سے بچانے والے انقلابی جوزف سٹالن کو آمر مطلق گردانتے اور سوویت یونین کے خاتمے کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ وہ فیض کی طرح یہ تو کہتے ہیں کہ

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

لیکن وہ اپنے اس سفر کو کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی میں جاری رکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اختتامیہ: جُز داغِ ندامت

یہ رہے کامریڈ جام ساقی! وہ اب بھی کامریڈ کہلا کر خوش ہوتے ہیں۔ صاحب فراش، سیاسی سرگرمیوں سے کٹے ہوئے لیکن آج بھی ان کے چہرے پر جدوجہد کے تیکھے نشان دیکھے جا سکتے ہیں۔ نہ جھکنے والے، نہ بکنے والے جام۔ آنکھوں میں آج بھی غرورِ عشق کا بانکپن۔ ان کی جرأت اور دلیری کی مثالیں زبان زدِ عام ہیں۔ ریاستی تشدد اور ایذا رسانی کے سامنے ڈٹ جانے والے جام، جس کی بہادری کا ایک زمانہ گواہ ہے۔ ہم اسی کے عہد کے سب سے بڑے سندھی شاعر سے دو گواہیاں پیش کرتے ہیں۔ شیخ ایاز نے اپنی ساہیوال جیل کی ڈائری میں لکھا ہے:

''ایک بار میں حیدر آباد میں، سندھی شام کی صدارت کر رہا تھا۔ میرے روبرو طالب علم رہنما جام ساقی کو پیغام ملا کہ اسے حیدر آباد کا ڈپٹی کمشنر بلا رہا ہے۔ اس پر جام نے جواب دیا تھا، مجھے آج کل اتنی فرصت نہیں کہ کسی ڈپٹی کمشنر سے مل سکوں۔ اگر انہیں مجھ سے ملنے کا اتنا شوق ہے تو وہ خود یہاں تشریف لے آئیں یا کسی کالی دفعہ کے تحت میری گرفتاری کے وارنٹ بھیج دیں۔''

دسمبر ۲۰۱۶ء کے آخری دنوں میں جب ہم جھک کر ان کی خیریت دریافت کر رہے تھے تو وہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گئے لیکن ان کے چہرے پر بیماری اور نقاہت کے نشان واضح تھے۔ ہمیں اس جام ساقی کے بارے میں شیخ ایاز کی ایک اور گواہی یاد آئی جو انہوں نے اپنی اسی کتاب ساہیوال جیل کی ڈائری میں قلم بند کی ہے:

''دو سال قبل میں حیدر آباد کے اورینٹ ہوٹل میں چائے پی رہا تھا کہ اچانک ایک

سندھی نوجوان کرسی کھینچ کر میرے برابر آ بیٹھا۔ اس نے بیٹھتے ہی لینن کی کتاب "On Religion" میز پر رکھی اور مجھ سے کہا، ''مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' اس نے کھدر کے کھردرے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اس کے پیروں میں چمڑے کا موٹا گھٹیلا تھا۔ وہ اپنے ڈیل ڈول، قد کاٹھ اور بول چال سے گورکی کے ناول ''ماں'' کے کردار پاویل جیسا لگ رہا تھا۔ آج اس کا نام پاولوف پڑ چکا ہے اور وہ طلبا تحریک کا نہایت بے باک رہنما ہے۔ اس کا اصل نام جام ساقی ہے۔ اس کا مطالعہ پلیجو کے برابر نہیں ہے اور نہ ہی اس میں پلیجو والی تیز ذہانت ہے۔ تاہم اسے انقلاب کے تصور سے بے حد وابستگی ہے اور یہ وابستگی انتہائی بے لوث ہے۔ نہ صرف جان و مال (مال تو اس کے پاس ہے ہی نہیں) بلکہ گھر بار، سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔ وہ کسان طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ پیدائشی انقلابی ہے۔ اس کی رگ رگ میں ظلم اور تشدد کے نظام کے خلاف بغاوت ہے اور وہ اپنے نظریے کے لیے کوئی بھی کووکی کر سکتا ہے...''

ہم نے جام کی طرف دیکھا۔ وہ مجسم فیض کا شعر نظر آئے

ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

ہمیں یاد آیا کہ وہ کن کن مرحلوں سے گزر کر یہاں تک آئے ہیں۔ ہم نے تصور کرنے کی کوشش کی کہ ۱۹۷۸ء میں گرفتاری کے بعد جب سکھاں نے اپنی زندگی کا خاتمہ کیا تو اس وقت ان کے کیا تاثرات رہے ہوں گے۔ سکھاں کی بیٹی بختاور، جب بمشکل چار سال کی تھی، اس کی کیا کیفیت رہی ہوگی۔ ہمیں کچھ عرصہ قبل بختاور سے اپنی ملاقات یاد آئی۔ بختاور جو اپنے باپ کے درد کی وارث ہے، سے یہ سن کر خوشی ہوئی تھی کہ وہ بچپن سے اپنے والد اور والدہ سے جدائی کی یادیں تحریر کر رہی ہے۔ اور اخبار میں بھی لکھتی ہے۔ وہ اپنے شوہر اقبال صاحب کے ساتھ آئی تھی اور جب حال ہی میں اس سے دوبارہ ملاقاتیں ہوئیں تو اس نے ان یادوں پر مبنی اپنے کچھ اخباری تراشے دیئے جن میں اس نے ماں سے محرومی پر اپنے معصوم تاثرات قلم بند کیے۔ چار سال کی عمر میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب ماں زندگی میں کبھی واپس نہیں آئے گی۔ یہ ۲۱ جنوری ۱۹۷۹ء کا منحوس دن تھا۔ جام کے بارے میں کسی کو کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں قید ہیں اور کس حال میں ہیں۔ پھر وہ دن بھی آیا جب اس نے اپنے قیدی بابا کو خط لکھا۔ اس نے بابا کی رہائی اور دوسری شادی کا احوال بھی لکھا۔ اپنے مضامین

میں اپنے بھائی سجاد ظہیر کا بھی بار بار ذکر کیا ہے۔ یہ نام بھی ماں نے رکھا تھا کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ سجاد ظہیر برِصغیر کی کیمونسٹ تحریک کا ایک بڑا نام تھا۔

۱۹۸۷ء میں ہمیں حیدر آباد جانے کا موقع ملا جو یادگار تھا جہاں ہمیں جام تو نہ مل سکے لیکن ان کی والدہ اور بچوں سے خوب ملاقاتیں رہیں۔ بختاور اور سجاد ظہیر دونوں کا ہوم ورک گھر کی ہر دیوار سے عیاں تھا۔ پنسل سے بنائی تصویریں اور تحریریں، آج بھی ہمارے ذہن پر نقش ہیں۔ جام ساقی کی والدہ ہمیں بے حد شفیق، رحم دل اور بہادر لگیں۔ سندھی میں اگر چہ ہماری روانی نہیں تھی لیکن یہ گھر ایسا تھا جس کی ہر چیز اپنی لگتی، ہر شخص اپنا لگتا۔ اس لیے کچھ خاص کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ ان کی سادگی اور اپنائیت نے ہمیں موہ لیا۔ ہمیں لگا، ہم اپنوں میں ہیں۔

اسی سفر کے دوران جام کے بھائی سلطان جھنجھی کے ساتھ مٹھی، امرکوٹ اور تھر پارکر جانے کا موقع بھی ملا۔ اگر چہ جام ساقی سے ملاقات کی امید نہیں تھی لیکن اپنی غیر موجودگی میں بھی، وہ وہاں موجود تھے۔ ہر شخص کی زبان پر انہی کا نام تھا۔ ہم تھر پارکر میں سینکڑوں میلوں کا فاصلہ طے کر کے چھاچھرو اور ان کے گاؤں پہنچے۔ صحرا کی ریت سے گزرتے ہوئے ہم وہاں پہنچے جہاں بٹ رہے تھے، گھٹاٹوپ راتوں کے سائے اور جام ساقی نے جنم لیا تھا۔

جھنجھی کا دورہ ایک یادگار دورہ تھا۔ ہماری جیپ تھر پارکر کی ریت سے گزر رہی تھی۔ دور دور تک ریت کے ٹیلے تھے۔ چلتے چلتے کوئی چھوٹا سا گاؤں آ جاتا۔ الف لیلہ کا سفر لگ رہا تھا۔ کہیں کہیں اونٹوں کی قطاریں دکھائی دے جاتیں۔ دور دور تک درختوں کا نشان تک نہ تھا۔ گہری پُراسرار طلسماتی خاموشی نے پورے ماحول کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ جہاں جہاں ہم رکتے جام کی باتیں ہونے لگتیں۔ سندھ کا بچہ بچہ جام کو جانتا تھا۔ خواتین میں بھی سیاسی شعور کی کمی نہ تھی۔ جام ساقی کی بہن جھنجھی گاؤں کے سکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں۔ وہ بہت محبت سے پیش آئیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ہم سارے تھر پارکر کے مہمان ہیں۔ جھنجھی گاؤں کے سرکانوں سے بنے ہوئے گول گول گھر بہت دلکش تھے۔ سرکانے اس طرح جوڑے گئے تھے کہ بارش کمروں میں نہیں آ سکتی تھی۔

مگر سورج اور چاند کی روشنی کے چراغ اندھیرا نہیں ہونے دیتے تھے۔ پورا گاؤں ہماری

آمد پر خوش تھا اور دعوتوں پر دعوتیں کی جا رہی تھیں۔ جتنے دن ہم رہے، ناشتہ ایک گھر میں ہوتا، دوپہر کا کھانا ایک گھر میں۔ ہم اونٹ پر بیٹھ کر جام کے کئی رشتہ داروں کی طرف گئے۔ بچوں اور بڑوں نے ہمیں اپنی چاہت سے نوازا۔ خصوصاً بچوں سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ جو تھر پار کر کے سفر کا سرمایہ ہیں۔ ایک بار بچوں نے ہمیں ریت کی سب سے بڑی پہاڑی پر چڑھنے کی دعوت دی۔ جب ہم پہاڑی کے اوپر پہنچ گئے تو انہوں نے کہا کہ اس پہاڑی سے قلابازی لگاتے ہوئے نیچے اترنا ہے۔ ہم تذبذب میں تھے کہ ایک شرارتی بچے نے ہمیں آہستہ سے دھکا دے دیا اور ہم لڑھکتے ہوئے نیچے آنے لگے۔ ریت کی پہاڑی سے یوں نیچے آنے کا تجربہ لاجواب تھا۔ جیسے ہم بادلوں میں سے گزرتے ہوئے نیچے آ رہے ہوں۔ بچوں کے ساتھ یہ کھیل گھنٹوں جاری رہا۔

ایک واقعہ بھی ہماری دلچسپی کا باعث بنا۔ ریت میں ایک کالے رنگ کا کیڑا پایا جاتا ہے جسے گینگی کہتے ہیں۔ ایک دن دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم سب بڑے چھوٹے ٹیلے پر اکٹھے ہو گئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ گینگی تھری لوگوں کی طرح ارادے کا پکا ہے۔ وہ کسی سے مدد نہیں لیتا اور اپنے راستے پر ثابت قدم رہتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ جس طرف جا رہا ہو، اگر اسے اٹھا کر آگے رکھ دیا جائے تو وہ اپنی جگہ پر واپس آ جاتا ہے اور پھر وہیں سے اپنا سفر دوبارہ شروع کرتا ہے۔ گینگی کا اپنا راستہ خود بنانے کا جذبہ واقعی متاثر کن تھا۔

سلطان جھنجھی ہمیں تحصیل چھاچھرو بھی لے گئے اور وہاں کے کئی ساتھیوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ راستے میں ایک ٹیلے پر چھوٹا سا پتلا سا لڑکا سندھی میں کوئی لوک گیت گا رہا تھا۔ صحرا کی گہری خاموشی میں اس کی آواز جادو کا سا اثر کر رہی تھی۔ اتنا سریلا اور میٹھا وہ گیت آج تک یاد ہے۔ چھاچھرو سے واپسی پر پانی کی تلاش میں کئی خواتین اپنی رنگا رنگ گاگروں میں ریت پر چلتی ہوئی تتلیوں کی طرح لگتی تھیں مگر ان کی زندگی انتہائی کٹھن اور دشوار تھی۔ یہ سچ ہے کہ تھر پار کر کے سادہ، محنتی اور پیار بھرے لوگ اس قدر بہادر ہیں کہ وہ صحرا کی تمام تر مشکلات کے باوجود گینگی کی طرح ثابت قدمی، خود مختاری اور ارادے کی پختگی سے اپنی جدوجہد جاری رکھتے ہیں۔

وہاں ہم نے جام ساقی کے ابتدائی سکول کو بھی دیکھا جس کی بنیاد ان کے والد نے رکھی تھی۔ اس دورے میں سب سے اداس اور دکھ دینے والی بات یہ تھی کہ ہم نے کامریڈ سکھاں کا وہ

کنواں جس میں انہوں نے جام ساقی کی محبت میں کود کر جان دی تھی، بھی دیکھا۔ ہم اس کنویں کے اردگرد بیٹھ گئے تھے اور بہت دیر تک آنسو بہاتے اور باتیں کرتے رہے کہ کیا اس ملک کی قیادت کو یہ اندازہ بھی ہے کہ ان کی ناانصافیوں اور جھوٹی سیاست نے دو معصوم بچوں کی جوان ماں اور جام ساقی کی شریک حیات کی جان لے لی۔

دسمبر ۲۰۱۲ء میں ہماری ملاقات ان کی دوسری بیگم اور ان کے چار بچوں سے بھی ہوئی۔ ان سے یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ ان کی بیٹیوں پارس، سوہن اور منہ بولی بیٹی امرتا اور ان کے دونوں بھائیوں سروان اور سارنگ سے بھی ہماری ملاقات ہوئی۔ سارنگ نے تو اس کتاب کے مواد کے لیے ہماری بہت مدد بھی کی۔ ان کی دوسری بیگم اختر (جام انہیں اندرا کہہ کر پکارتے ہیں) نے دراصل شادی کے بعد جام کو نئی زندگی دی اور تمام بچوں کو جوڑ کر رکھا۔

اس کتاب کی تیاری کے دوران دسمبر ۲۰۱۶ء میں ان سے پھر ملاقات ہوئی۔

''سنا ہے، آپ نے جام کی خاطر جیل بھی کاٹی؟''

وہ مسکرادیں اور بولیں: ''سندھ کا سابق وزیراعلیٰ ارباب رحیم، جام کو گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ جام، جب قابو میں نہ آئے تو اس نے مجھے گرفتار کرلیا۔ بیس روز تک میں نے لیڈیز تھانے کا مزہ چکھا۔ جام کی قربانیوں کے مقابلے میں، میری اس قید کی کیا حیثیت ہے۔''

''تعلق کب اور کیسے بنا؟''

''جام سے تعلق کا سلسلہ ۱۹۸۵ء میں شروع ہوا جب میں اپنے والد (کامریڈ رکن الدین قاسمی) کے ساتھ جام سے ملنے سکھر جیل جانے لگی۔ میں ان کی قربانیوں اور استقامت سے بے حد متاثر تھی۔ ۱۹۸۶ء میں جام رہا ہوئے تو ان سے تعلق اور بڑھا۔ جام نے مجھ سے زندگی بھر ساتھ دینے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا، ''بابا سے بات کرلیں۔'' بابا بولے، ''انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یوں ہماری شادی ہوگئی جو محبت کی شادی بھی ہے اور روایتی شادی بھی۔''

جس گھر میں ہم بیٹھے تھے وہ ان کا اپنا گھر ہے۔

''اس سے پہلے ہم کالی موری میں ایک کرائے کے فلیٹ میں رہتے تھے۔ اسی فلیٹ میں ایک بار کامریڈ نانک آئے اور بولے، ''مجھے راکھی باندھو اور پیسے دو۔'' جام نے دس روپے

نکالے۔ میں نے کامریڈ نانک کو راکھی باندھی اور دس روپے کا نوٹ ان کی طرف بڑھا دیا۔ کامریڈ نانک نے وہیں ایک لاکھ روپے کا چیک کاٹا اور کہا، ''یہ تمہارے فلیٹ کا نذرانہ ہے۔'' جام بولے، ''پارٹی کو پیسوں کی ضرورت ہے، لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے سر پر ہمیشہ چھت رہے گی۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک لاکھ روپے پارٹی کو دے دیئے۔''

''اور یہ گھر؟''

''پھر جب میرے سسر بابا ریٹائر ہوئے تو انہوں نے اپنے ریٹائرمنٹ کے پیسوں سے پلاٹ لے لیا۔ جام کے دوست اللہ بخش مگسی نے ۱۰۰ گز زمین مفت دے دی۔ یوں یہ گھر بن سکا اور ۱۹۹۰ء میں ہم یہاں اُٹھ آئے۔''

یہ چھوٹا سا گھر سکون اور طمانیت کا گھر ہے۔ جام کو زندگی بھر کے کسی عمل پر پچھتاوا نہیں ہے کیوں کہ انہوں نے جہاں اپنے آپ کو غلط محسوس کیا، اپنی اصلاح کر لی۔ اور یوں بھی،

ہر داغ ہے اس دل میں، جُز داغِ ندامت

ایسا لگتا ہے، کہانی یہاں ختم نہیں ہو رہی، شروع ہو رہی ہے۔

جام ساقی۔ چندلوگ اپنے نام اور کام کے حوالے سے بڑے منفرد ہوتے ہیں، جام ساقی کا شمار انہی میں ہوتا ہے۔ جب جنرل ضیا کا مارشل لاء اپنے عروج پر تھا، اس جبر کے خلاف سندھ سے ایک بلند آواز جام ساقی کی شکل میں گونجی۔ اور پھر ہم نے ایک روز یہ خبر سنی کہ بے نظیر بھٹو، جام ساقی کے خلاف قائم مقدمے میں فوجی عدالت میں پیش ہوئیں۔ اُن دنوں پاکستان میں جمہوریت اور عوامی جدوجہد کرنے والوں کے لیے جام ساقی، مزاحمت کی ایک مثال بن گئے۔ اور جب وہ رِہا ہوئے تو میرے سمیت پاکستان پیپلز پارٹی کے ترقی پسند لوگوں نے بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید کی قیادت میں لاہور میں اُن کا استقبال کیا اور اس کے بعد ہم بابائے سوشلزم ہی کی قیادت میں سندھ میں منعقد کی گئی ہاری کانفرنس میں شامل ہونے کے لیے اُن کے ہاں پہنچے۔

جام ساقی، پاکستان میں عوامی جدوجہد کرنے والوں میں سرفہرست ہیں۔ غیر طبقاتی سماج کے لیے جہدِ مسلسل کرنے والے جام ساقی نے کبھی مفاہمت نہیں کی اور نہ ہی کبھی اپنے نظریے اور اصولوں کو قربان کیا۔ وہ پاکستان کی عوامی تاریخ کا ایک ایسا کردار ہیں جو آج نہیں تو کل اس دھرتی میں انقلاب کا تسلسل ثابت ہوں گے۔ زیرِ نظر کتاب اس شخص کی داستان ہے جو ہاریوں، کسانوں، مزدوروں اور محنت کشوں کے لیے روزِ اوّل سے متحرک ہے۔ اس کی سیاست، جدوجہد اور زندگی اسی عنوان سے عبارت ہے۔ یہ کتاب پاکستان کی تاریخ میں ایسے کرداروں کو بیان کرے گی جو اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ کسانوں، مزدوروں، محنت کشوں اور پیداوار کرنے والے طبقات کے لیے سر بکف ہوئے۔ جام ساقی، پاکستان کی عوامی تاریخ کا انمول ہیرو۔

فرخ سہیل گوئندی

ISBN 978-969-652-094-8

Jumhoori Publications

پڙهندڙ نسُل . پ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾ عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻڪَ ”لُڙهندڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، جُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندڙ، ياڙي، ڪاٺُو، ياجوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سيني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوُٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعني e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَـنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪـو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهـڙي دعوىٰ ڪري ٿـو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُـوڙو آهي. نہ ئي وري پَـنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪـڏهن ڪو اهـڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہ ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وڻن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَـنَ بہ مختَلِف آهـن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿـي سگهن ٿا. بيـن لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصيِ ۽ ٽالي لڳل ڪِلَب Club Exclusive نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَـنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِيـن. اهـڙي حالت ۾ پَـنَ پاڻ هِڪَٻِئي جي مدد ڪَـرڻ جـي اُصـولَ هيـٺ ڏي وَٺُ ڪنـدا ۽ غيرتجـارتي -non commercial رهنـدا. پَنَـن پـاران ڪتـابن ڪـي ڊِجيٽـائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪـو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪـرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن ڪي ڊِجيٽائِيز ڪرڻ ڪان پـو ٻيـو اهـم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مـان جيڪـڏهن ڪـو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَـن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڏِ کان وَڏِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛

ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن؛

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،

جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!

مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،

جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ

اِن حسابَ سان اٽڪلپاٽائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ ”هاڻي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو“ ناداني جي نشاني آهي.

پَڻ جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڇي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اٽڄاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَڻَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پَڙهندڙ نَسُل جا پَڻَ سيني کي **چو، ڇالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوٺ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽتر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا، بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ياڪِي پائي چيو تہ ”منهنجا ياءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)